انگریزی ادب کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر محمد یٰسین

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

فہرست

★

دیباچہ

"انگریزی ادب کی مختصر تاریخ" عالمی ادب کے ایک اہم حصّہ کو اُردو پڑھنے والوں سے روشناس کرانے کی ایک معمولی کوشش ہے۔ آج کل انگریزی کی اہمیت نہ صرف بین الاقوامی وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے ہے بلکہ اس ثقافتی آلہ نشر کی ہے جس سے جدید ذہن کو نئی روشنیاں ملتی ہیں۔ آزاد ہندوستان میں جہاں انگریزی سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے لئے ضروری سمجھی جارہی ہے وہاں اس کے ثقافتی اور ادبی سرمایہ کو بھی ہم تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان اور یونان، روم اور عرب کی تہذیبوں کے بعد انگریز قوم کا بین الاقوامی سیاست اور عالمی ثقافت میں جو حصّہ رہا ہے وہ ایک روشن حقیقت ہے۔ وہ قوم جس نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنی حکومت کے دوران میں جدید علم کی روشنی پھیلائی اس کے ادبی اور علمی اکتسابات کا مطالعہ ہمارے لئے نہایت اہم ہے۔

اردو میں سرسید اور ان کے رفقا نے انیسویں صدی کے اواخر سے ہی انگریزی سے ناواقفیت کے باوجود اس کے عظیم ادبی سرمایہ سے استفادہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی میں ہمارے ادیبوں اور فنکاروں نے براہ راست مطالعہ کے ذریعہ انگریزی ادب کے شہ پاروں کو تراجم اور تالیفات کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی اور تخلیقی ادب میں بھی اس سے اثرات قبول کئے۔ ہمارا جدید ادب شاعری، افسانہ، تنقید، انشائیہ اور دوسرے

اصناف میں بہت حد تک انگریزی کا خوشہ چین ہے لیکن ہماری کوششیں ابھی ناتمام ہیں۔
انگریزی ادب کی روح تک پہنچنے اور اس کے اسرار و رموز کے عرفان کے لئے اس کا براہ
راست مطالعہ ضروری ہے لیکن اس کی تاریخ کے جائزہ سے نئی سمتوں اور نئے زاویوں
اور معیاروں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنی ایک ہزار سالہ زندگی میں انگریزی کس طرح علاقائی
بولیوں سے ایک مستند زبان کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ کس طرح لاطینی اور فرانسیسی اثرات
سے آزاد ہو کر قومی مزاج کی ترجمان بنی اور کس طرح سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی میں اس
نے عہد آفریں کارنامے پیش کئے۔ یہ حقائق ہمارے لئے مشعل راہ ہو سکتے ہیں۔

اردو ادب نے اپنی مختصر زندگی میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس کو جانچنے اور اس کی آئندہ
توسیع و ترقی کے امکانات کے جائزہ کے لئے انگریزی ادب کے عظیم کارناموں کو نمونہ کے
طور پر سامنے رکھنا ضروری ہے۔ مشہور نقاد میتھو آرنلڈ نے کہا تھا کہ "ہر نقاد کے لئے کم از کم
دنیا کی ایک عظیم زبان سے واقفیت ضروری ہے اور وہ زبان اپنی زبان سے جس قدر مختلف ہو اتنا ہی
بہتر ہے۔" اردو ادب میں مجموعی طور پر عربی، فارسی اور ہندی کے اثرات غالب رہے ہیں
زبان کے ارتقائی دور میں یہ تقلید شاید ناگزیر بھی تھی لیکن آج ہمیں مشرقی ادب کے علاوہ کسی
اور پیمانہ کی بھی ضرورت ہے جس سے ہم اپنے ادب کا جدید نظریات کی روشنی میں جائزہ لے
سکیں اور اس کی قدریں متعین کر سکیں۔ ہمارے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ ہم مستقبل قریب میں
یورپ کے عظیم الشان ادب کو اردو کا جامہ پہنا سکیں گے لیکن ہم انگریزی ادب کے ذریعہ
مغربی ادب کی تحریکوں اور فنی تجربوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور مختلف اصناف
میں جو جو تخلیقیں ہوئی ہیں ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میر انیس کے مرثیوں
سے ہم "رزمیہ شاعری" کی عظمتوں اور وسعتوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ شبلی جیسا بالغ نظر نقاد بھی
ہومر، ورجل اور ملٹن سے ناواقفیت کی بنا پر نہ تو انیس کے محاسن و معائب پر خاطر خواہ تنقید
کر سکا اور نہ "شعر العجم" میں فردوسی کے "شاہنامہ" پر تبصرہ سے آگے بڑھ سکا ہمارے لئے
آج بھی "رومان" محض حسن و عشق کی آویزشوں کی داستاں ہے لیکن "رومانیت" کا صحیح اور واضح
تصور ہمیں ورڈسورتھ، کولرج، بائرن، شیلی اور کیٹس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہمیں

اپنے ادبی سرمایہ سے مایوس یا شرمندہ ہونے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کہ شاعری کے علاوہ انگریزی ناول اور انگریزی ڈرامہ کے سامنے ہم اپنے کو بہت کم مایہ پاتے ہیں۔ ناول میں ہمیں ڈکنس، جارج ایلیٹ، ہارڈی اور ورجینیا وولف انگریزی کے توسط سے بالزاک، دستووسکی، طالستائے، شولوخاف اور طامس مان جیسے فنکاروں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی کن کن منزلوں سے گزرنا ہے۔ ڈرامہ میں یونانی اور لاطینی شہ پاروں سے قطع نظر شیکسپیر، بن جانسن، ابسن اور برنارڈ شا کو سمجھنے کے لئے ہمارے یہاں کوئی پیمانہ نہیں لیکن ان مشاہیر کے مطالعہ یا تذکرہ سے اتنی بات تو سمجھ میں آہی سکتی ہے کہ المیہ، طربیہ، غنائیہ، ڈرامائی حقیقت نگاری اور نفسیاتی تجزیہ ادب میں کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ آج بھی ہمارے یہاں تنقید باوجود سب سے مقبول صنف ہونے کے مغربی تنقید سے کس قدر پیچھے ہے، اس کا احساس ہمارے دل میں چٹکیاں لیتا ہے۔ ہماری تقابلی تنقید کا ایک طرف یہ حال ہے۔ کہ ہمیں ہر ہندوستانی یا پاکستانی ادیب کے یہاں خواہ مخواہ مغربی تحریکوں کی جھلک نظر آتی ہے اور ہر کس و ناکس شیکسپیر، ملٹن، شیلی، بودلیئر، ملارمے اور ایلیٹ نظر آتا ہے۔ دوسری طرف خالص مشرقی معیاروں کی روشنی میں تنقید اسی حد تک گمراہ کن ہے۔ گوئٹے نے ۱۸۲۷ء میں کہا تھا کہ "قومی ادب ایک بے معنی لفظ ہے۔ عالمی ادب کا زمانہ قریب ہے"۔ ہم کو آج جدید حالات کے پس منظر میں اس مقولہ کی اہمیت پر سنجیدگی سے غور کرنا ہے۔

انگلستان کی ادبی تاریخ ہمارے نزدیک انگریز قوم کی "سوانحِ عمری" ہی نہیں بلکہ تمام مغربی علمی اور ادبی تحریکوں کو سمجھنے کے لئے بہترین ذریعہ بھی ہے۔ راقم السطور نے اپنی پیش نظر تالیف میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ ابتدائی دور سے حال تک انگریزی ادب کا جائزہ لیا جائے اور بالخصوص اس کی ادبی تحریکوں —— نشاۃ الثانیہ، جدید کلاسیکیت، رومانیت، اشاریت، حقیقت نگاری، اور نفسیاتی تجزیہ نگاری —— کے پس منظر میں لیا جائے۔ اس کتاب کی تدوین میں انگریزی ادب کی مستند تصانیف بالخصوص لیگوئے اور کزامیاں Legouis & Cazamian سے استفادہ کیا گیا ہے اور مشاہیر کے کارناموں کا مختلف نقادوں کے بیانات کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اگرچہ تمام ابواب میں اس دور کی خصوصیات اور مستند

معروف تصانیف پر تنقیدی تبصرہ ہے لیکن انیسویں اور بیسویں صدی کے ادب کا زیادہ تفصیل و تشریح کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ ابواب کی ترتیب حسب ذیل ہے:

انگریزی ادب کی تاریخ لکھنے کی ترغیب پروفیسر آل احمد سرور نے ۱۹۵۸ء میں دلائی جب کہ راقم الحروف کا تقرر شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی میں ہو چکا تھا۔ انگریزی میں تحقیقی مقالہ پر کام اور گوناگوں مصروفیتوں کی بنا پر کتاب کی تکمیل میں دیر ہوئی لیکن اس دوران میں استاد مکرم جناب مجنوں گورکھپوری کی رہنمائی سے میری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ انگریزی ادب کے اس تنقیدی جائزہ میں میرے ذاتی مطالعہ، سنٹ اینڈریوز کالج گورکھپور اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے اساتذہ اور احباب کا بھی حصہ ہے۔ سب سے زیادہ میں پروفیسر سرور کا شکر گزار ہوں جو خود اردو اور انگریزی کے فاضل ہیں اور جنھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے۔

توقع ہے کہ اس مختصر کوشش سے اردو میں مغربی ادب سے دلچسپی پیدا ہوگی اور اسی نوعیت کے دوسرے کاموں کے لئے راہیں کھلیں گی۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ آئندہ میری اس کوشش پر اضافے ہوں گے اور ان سے تخلیق و تنقید کے لئے نئے معیار اور ادب کی تعبیر و تشریح کے لئے نئے زاویے منظر عام پر آئیں گے۔

علی گڈھ

۱۵ر فروری ۱۹۷۰ء

محمد لیسین

باب اوّل

ابتدائی انگریزی ادب

(سنہ ۶۰۰ء سے سنہ ۱۵۳۰ء)

اینگلو سیکسن ادب Anglo Saxon Literature

اگرچہ زمانہ حال تک چاسر کو انگریزی ادب کا بابا آدم کہا جاتا رہا ہے مگر اب تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ چاسر سے قبل بھی انگریزی ادب کے اہم دور گزر چکے ہیں جن کو تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اینگلو سیکسن زبان اور ادب، جدید انگریزی ادب سے جس کی ابتدا چاسر سے ہوتی ہے اس قدر مختلف ہے کہ مورخین نے اسے بالکل دوسری زبان مانی ہے۔

نارمن فتوحات سے قبل انگلستان کی تاریخ میں دو اہم واقعات قابل غور ہیں۔ اوّل اینگلس Angles اور سیکسن Saxon قوموں کا انگلستان پر قبضہ اور عناصر پرستی Paganism کا رواج اور دوم انگریز قوم کا عیسائیت قبول کرنا۔ سنہ ۵۹۷ء میں آگستن Augustin نے روم سے آکر عیسائیت کی تبلیغ کی اور انگلستان کے طول و عرض میں نئے مذہب کی بنا ڈالی۔ اینگلو سیکسن ادب کا بیشتر حصہ انھیں دو مخصوص واقعات پر مشتمل ہے۔ اس ادب کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے وہ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر گیارھویں صدی عیسوی تک عیسائی پادریں

کا کارنامہ ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس ادب کے ایک حصّے کی حفاظت کی لیکن وہ اس میں زبردست تبدیلیوں کے ذمہ دار بھی ہیں۔ ان کے زیر اثر اینگلو سیکسن ادب پر فطرت پرستی کا جو رنگ غالب تھا وہ مسیحیت سے بدل گیا۔ عیسائی مولفین نے مذہبی جنون میں آکر اینگلو سیکسن ادب کے بیشتر حصہ کو غارت کر دیا اور جو حصہ بھی ہم تک پہنچ سکا ہے۔ وہ مسیحیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اس کے باوجود اس دور کے ادب کی تعمیر میں اینگلو سیکسن لاطینی پادریوں نے جو حصہ لیا ہے۔ وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خود دیسی زبان بولتے تھے اور کبھی کبھی اسی زبان میں شعر بھی کہتے تھے لیکن ان کا ذریعۂ اظہار لاطینی زبان تھی۔ ان کے ادب کا تخیلی پس منظر قومی تھا۔ اس لئے ہم ان کے کلام میں "قومی زبان" کے ابتدائی نشانات پاتے ہیں۔

آلڈھم Aldhelm سنہ ۶۵۰ء سے سنہ ۷۰۹ء:-

آلڈھم ساتویں صدی کے نصف آخری حصہ کا مشہور عالم گذرا ہے۔ اسے لاطینی زبان اور ادب پر بڑی قدرت حاصل تھی اور اس کی شاعرانہ طبیعت میں کلاسکی اور نیچری عناصر یکساں طور پر کارفرما تھے۔ اگرچہ ہم تک اس کی شاعری کے لاطینی حصے ہی پہنچے ہیں لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی جغرافیائی اور قومی مزاج کا اس پر کس قدر اثر پڑا تھا۔ اس کے کلام کا بیشتر حصہ مذہبی ہے جس میں کنواری مریم کی مدح و ستائش کے ساتھ کیتھولک مذہب کی تلقین بھی ہے۔ مذہبی شاعری کے علاوہ اینگلو سیکسن ادب میں آلڈھم کی اہمیت اس کی پہیلیوں Riddles کی وجہ سے بھی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ہمیں امیر خسرو کی یاد دلاتا ہے

بیڈ Bede سنہ ۶۷۳ء سے سنہ ۷۳۵ء:-

بیڈ اپنے زمانے کا مشہور پادری، عالم، صاحبِ کلام اور مورّخ تھا۔ اس کے یہاں بھی نیچری تہذیب و تمدن کے عناصر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی تصنیفات مختلف مسائل و مباحث پر حاوی ہیں۔ اس نے بحور و اوزان پر ایک مبسوط مقالہ لکھا۔ مشہور عیسائی مبلغین کی سیرتوں کو قلمبند کیا اور عیسائیت کی تاریخ بھی مرتب کی۔ اس کی مشہور تصنیف تاریخ کلیسا Ecclesiastical History آج بھی اینگلو سیکسن ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

آلکوئن Alcvin سنہ ۷۳۰ء سے سنہ ۸۰۴ء

ابتدائی اینگلو سیکسن شاعروں میں آلکوئن بھی خاص مقام رکھتا ہے لیکن اس کے نثری کارنامے ہمارے لئے زیادہ اہم ہیں۔ وہ ایک مشہور عالم تھا۔ اس لئے اس کی تصانیف میں ہر قسم کے علمی مباحث شامل ہیں قواعد، صنائع بدائع اور مکالمات وغیرہ میں اس کے فطری جوہر کھلیاں ہیں۔ اینگلو سیکسن شاعری کا ایک نمونہ آلکوئن کے ایک مکالمہ میں ملاحظہ ہو:۔

جسم کیا ہے ؟	روح کا مسکن
بال کیا ہیں ؟	سر پوش
داڑھی کیا ہے ؟	صنفوں کا امتیاز اور عمر کی پہچان
آنکھیں کیا ہیں ؟	انسانی جسم کی رہنما اور روشنی کے ظروف

کبھی کبھی آلکوئن کے تخیل کی پرواز حسن فکر کی نشاندہی کرتی ہے:۔

سورج کیا ہے ؟ دنیا کی عظمت، آسمان کا حسن، خدا کی برکت اور دن کی عزت۔

اینگلو سیکسن ادب کا بیشتر حصہ قلمی نسخوں کی شکل میں موجود ہے۔ جن میں مشہور نسخے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سر رابرٹ کاٹن Sir Robert Cotton کے جمع کئے ہوئے نسخے جن میں اینگلو سیکسن ادب کا شاہکار "بیوولف" Beowulf بھی شامل ہے اور جو برٹش میوزیم کی زینت ہیں۔

۲۔ Exeter Book جسے لیوفرک نامی پادری نے اکزیٹر کیتھڈرل کو سنہ ۱۰۷۲ء میں دیا تھا۔

۳۔ Vercelli Book جو اٹلی میں ملان کے قریب پائے گئے نسخوں کا مجموعہ ہے۔

۴۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے باڈلین لائبریری کے نسخے۔

ان نسخوں سے اگرچہ ہمیں اصلی اینگلو سیکسن ادب کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ان میں جو شعری محاسن اور فطری عناصر ملتے ہیں۔ ان سے ہم اس دور کے ادب کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ عیسائی پادریوں کی قطع و برید کے باوجود ہمیں اس دور کے ادب میں مصنفوں کے جوش و جذبہ اور ان کی ذہنی

معاشرتی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں ہمیں ایک خاص قسم کی رومانی غمگینی ملتی ہے کیونکہ انھوں نے ماضی کے عہدِ زریں کے افسانے بڑے جذباتی تاثر کے ساتھ قلمبند کئے ہیں اور اپنے فطرت پرست مزاج و طبیعت کا اظہار کیا ہے۔

اینگلو سیکسن شاعری میں "بیوولف" Beowulf سب سے بڑا رزمیہ شاہکار ہے۔ اس کہانی کو چھٹویں صدی عیسوی میں اینگلز نے انگلستان میں مشہور کیا اور ۷۰۰ء کے قریب اس نظم کی تخلیق ہوئی۔ "بیوولف" کے ہیرو اور پس منظر کو انگلستان سے کوئی واسطہ نہیں یہ قصہ اینگلز قوم سے بھی متعلق نہیں بلکہ اس کا تعلق اسکینڈینیویا سے ہے۔ اس رزمیہ میں جرینڈیل Gerendel نامی دیو کی تباہ کاریوں اور بیوولف کے ہاتھوں اس کی موت کا ذکر ہے۔ دیو کی ماں سے ہیرو کی لڑائی بہت خوفناک اور دلچسپ ہے۔ کہانی کے دوسرے حصے میں بیوولف ایک بوڑھے بادشاہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے اور قصے کا خاتمہ اس کی تجہیز و تکفین سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس رزمیہ میں اس دور کی داستانوں کی طرح دیوؤں اور پریوں کے واقعات ہیں۔ دیو — مہیب، قوی ہیکل، شیطان کا نائب اور ہیرو عام انسانیت کا نمائندہ — لیکن اس میں سماجی زندگی کی نہایت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ درباروں کی زندگی، سورماؤں کے معرکے اور عام زندگی کی جو جھلکیاں یہاں ملتی ہیں وہ کسی ادبی شہ پارہ میں باعثِ فخر ہو سکتی ہیں۔

"بیوولف" کے علاوہ ہمیں اس دور کی اکثر مشہور نظمیں مختلف مجموعوں میں ملتی ہیں۔ جن سے اس دور کے شاعروں کے مزاج اور عام سماجی حالات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ان نظموں میں The wife's Lament, Deor, The Wanderer, The Sea-Farer اور The Ruin, The Husband's Message, زیادہ مشہور ہیں۔ ان تمام نظموں میں حزن و یاس، حسرت و حرماں کے مضامین ملتے ہیں جن سے زندگی کی بے ثباتی، عاشق کی بے وفائی، محبوب کی تلون المزاجی، اُمرا و بادشاہوں کی آمرانہ جبر و تشدد اور شاعروں کی بے قدری کا پتہ چلتا ہے۔ زندگی کے المیہ میں جو تنوع اینگلو سیکسن شعرا نے دکھایا ہے وہ تہذیب انسانی کے ابتدائی ادب میں بہت کم ملتا ہے۔ اس کی ایک

بڑی وجہ اس زمانہ کا غازیانہ نظام زندگی اور عام شاعروں کی یاس پسندی ہے ۔

مسیحی شاعری: اس دور کی مذہبی شاعری میں بھی وہی الفاظ و اصطلاحات استعمال کیئے گئے جنھیں دیوؤں اور بہادروں کے قصوں کے لئے استعمال کیا جاچکا تھا ۔
عیسائی پادریوں کو جو قدیم نیچری شاعری کے عناصر کو عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے رموز و علامات کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس امر کا احساس ہوگیا تھا کہ وہ عوام کے دلوں سے قدیم خیالات و توہمات کو کلی طور پر نہیں ختم کر سکتے۔ اسی لئے انھوں نے توریت و انجیل کی کہانیوں کو نیچری کہانیوں کے طرز پر بیان کرنا شروع کیا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر پادری قدیم نیچری شاعری کے بھی دلدادہ تھے لہٰذا ان کی شاعری میں غیر شعوری طور پر جمالیاتی رنگ بھی آگیا۔
"اینڈریاس" Andreas میں عیسائی اور نیچری عناصر کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ سینٹ اینڈروز نے سینٹ میتھو کی اسی طرح امداد کی جس طرح بیوولف نے اس راجہ کی حمایت کی جس کو دیوؤں نے پریشان و عاجز کر رکھا تھا۔ یہ نظم اگرچہ مذہبیت کا رنگ لئے ہوئے ہے لیکن درحقیقت یہ ایک بہادری کا قصہ ہے جس میں قدیم داستانوں کا انداز پایا جاتا ہے۔
عیسائی شاعری کے ساتھ "کیڈمن" Caedmon اور "کینیوولف" Cyne Wulf کا نام لازمی طور پر وابستہ ہے۔ بقول بیڈ، کیڈمن کو خواب میں کسی فرشتہ نے مذہبی شاعری کی تلقین کی اور جب وہ خواب سے بیدار ہوا تو ایک خاص مذہبی جذبہ سے مغلوب تھا۔ اس نے توریت اور انجیل کو انگریزی شاعری میں پیش کیا اور ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے مذہبی عقائد کے گیت گائے ۔

کینیوولف کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن وثوق سے اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ اس نے سینٹ جولیانہ کی شہادت، سینٹ ہیلنا کی صلیب کی تلاش کو نظم کیا۔ اس کے علاوہ اس نے رسولوں کے متعلق بھی نظمیں Fates of the Apostles لکھیں۔ اس کے منظوم کارناموں میں The Dream of the Road جس میں صلیب کی تلاش ہے بہت مشہور ہے۔

اینگلو سیکسن نثر: اینگلو سیکسن اور انگریزی شاعری کے درمیان فرق ہر جگہ نمایاں ہے

اینگلو سیکسن شاعری متروکات سے بھری ہے۔ اس کے سننے یا پڑھنے والے کو خاص اسالیب و محاورات سے مانوس کرانا پڑتا ہے مگر اس کے برخلاف نثر میں "عام زبان" کو دخل رہا ہے۔ اس لئے اینگلو سیکسن اور انگریزی نثر کے درمیان اتنا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اگرچہ زمانہ کے ساتھ زبان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں لیکن ہمیں کہیں بھی خلا کا احساس نہیں ہوتا۔

متقدمین میں آلڈہم اور بیڈ نے شاعری کے علاوہ لاطینی اور اینگلو سیکسن نثر کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس طرح عوام سے زیادہ سے زیادہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ نویں صدی میں ولندیزی حملوں نے انگلستان کی مائل بہ ارتقا تہذیب کو زبردست چوٹ پہنچائی اور اسی دور میں "آلفریڈ" Alfred (سنہ ۸۴۹ء سے سنہ ۹۰۱ء) نے بادشاہت سنبھالی۔ وہ سپاہی، عالم، ادیب اور زبردست مدبر تھا۔ اس نے ولندیزیوں سے مفاہمت کرکے اپنی قوت بڑھائی اور پھر ملک کو ان کی گرفت سے آزاد کیا۔ وہ علم و ادب کا بڑا حامی تھا اور خود بھی تصنیف و تالیف کا شوق رکھتا تھا۔ اس کے ادبی کارنامے زیادہ تر ترجموں پر مشتمل ہیں۔ لیکن اس کی مجاہدانہ کوششوں اور ذوقِ ادب سے کسی کو انکار نہیں۔ اس نے "Pastoral Rule" نامی ترجمہ سے پادریوں کی رہنمائی کی اور "آریسیس" کے "تاریخ عالم" (History of the World) سے بھی اہل انگلستان کو روشناس کیا۔ یہ تصانیف اپنی جگہ اہم ہیں۔ لیکن آلفریڈ کا شاہکار "بیوتھیس" کا ترجمہ (Consolation of Philosophy) ہے جس میں داخلی مسرت کے فلسفہ پر مبسوط بحث ہے۔ "اینگلو سیکسن تاریخ" (Anglo Saxon Chronicle) بھی مشہور تصنیف مانی جاتی ہے۔

اس دور کے نثر نگاروں میں "آلفرک" (Alfric) اور "وولفستان" (Wulfstan) کی تاریخی اہمیت ہے۔ آلفرک نے گیارھویں صدی کے ابتدائی سالوں میں آسان و سلیس زبان میں پند و نصائح لکھ کر انگریزی نثر کی بڑی خدمت کی۔ وولفستان نے جو سنہ ۱۰۰۲ء سے سنہ ۱۰۲۳ء تک یارک کا بڑا پادری رہا اپنی مشہور تصنیف (Sermon of the Wolf) سے تاریخی حیثیت اختیار کرلی اس نے اپنے مخصوص پیرایہ میں انگریز قوم کو ولندیزیوں کی تباہ کاریوں سے باخبر کیا۔

دو نسلوں کے بعد انگلستان میں غیر عیسائیوں کا دور دورہ ہوا اور بالآخر اینگلوسیکسن "نارمن" Norman حکومت کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

اینگلو نارمن ادب :

نارمن فتوحات کے بعد انگلستان کا ادبی مذاق بالکل بدل گیا۔ فاتحین اگرچہ فطرت پرست ڈین قوم سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب انھوں نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان فتح کیا تو وہ خالص فرانسیسی تھے اور ان کی زبان و تہذیب پر فرانسیسی اثرات کا گہرا نقش تھا۔ اس طرح ان کے ساتھ انگلستان میں فرانسیسی ادب اور قوانین بھی درآمد ہوئے۔ ملک کی دیسی زبان یعنی اینگلو سیکسن ادنیٰ طبقہ کی زبان ہو گئی اور ملک پر لاطینی کے ساتھ فرانسیسی زبان کا قبضہ رہا۔ بارہویں اور تیرھویں صدی میں فرانسیسی زبان براعظم یورپ کی سب سے ممتاز زبان تھی۔ اس سے انگلستان میں ادبی انقلابات کے سلسلہ میں جو اہمیت فرانسیسی کو حاصل ہے وہ کسی اور زبان کو نہیں نصیب ہو سکی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب انگریزوں نے از سر نو "قومی ادب" کو اپنانا شروع کیا تو فرانسیسی زبان و ادب کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکے۔ ہم چاسر کی شاعری اینگلو سیکسن سے ناواقفیت کے باوجود سمجھ سکتے ہیں لیکن فرانسیسی شاعری کے بغیر اس کے شعری مزاج اور فنی اکتسابات کا صحیح جائزہ نہیں لے سکتے۔

فرانسیسی ادب کے زیر اثر انگریزی ادب میں غازیانہ رومان، تمثیلی نظمیں، تیج تنتر کے قسم کے اخلاقی قصے اور غنائی نظمیں Lyrics شامل ہوئیں۔ نارمن قوم کی رگوں میں بہادر ڈین نسلوں کا خون رواں تھا۔ وہ اپنے شاندار ماضی سے بھی ناآشنا نہیں تھے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے فرانس کے ادبی اور معاشرتی اثرات کو بھی قبول کیا۔ نارمن فتوحات کے بعد سرزمین انگلستان میں یہ سب عناصر ایک حسین امتزاج کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

اینگلو نارمن شاعری، اینگلو سیکسن شاعری کے مقابلہ میں فنی خصوصیات کی حامل نہ تھی۔ وہاں وہ جوش و جذبہ اور حسن و آہنگ نہیں جو کبھی انگریزی شاعری کی امتیازی خصوصیت تھے اس نئی شاعری میں منظوم داستانوں، اخلاقی نظموں اور تواریخی قصوں کا غلبہ ہے کیونکہ

اینگلو نارمن شاعری کے پس پردہ انادیت اور اخلاقیت کے اثرات کارفرما ہیں۔ بیشتر اینگلو نارمن تصنیفات محض تاریخی یا افسانوی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کا مقصد انگریز قوم کو نارمن قوم کی "تاریخ" شاندار ماضی اور عظیم روایات سے روشناس کرانا تھا۔ نشاۃ الثانیہ (Renaissance) سے قبل وہ اپنے کو غیر ملکی ہی سمجھتے رہے۔ اس لئے ان سے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ خالص "قومی" تصورات کو پیش کریں۔ اسی لئے ان پہ رنگ و نسل کا اثر دیرپا رہا۔

انگریزی ادب ۱۰۶۶ء سے ۱۳۵۰ء تک:

اینگلو نارمن ادب کے جمالیاتی اقدار اگرچہ اعلیٰ معیار شعری پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن انگریزی ادب کے سلسلہ میں اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ نارمن فتوحات کے بعد اینگلو سیکسن ایک غلام قوم کی زبان رہ گئی تھی جس کا بظاہر کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اگر ایک طرف یہ زبان سرکاری سرپرستی سے محروم تھی تو دوسری طرف یہ عوامی حیثیت بھی اختیار کرتی جارہی تھی۔ اسی لئے اسے زیادہ سے زیادہ عام فہم اور سلیس بنانے کی کوشش عرصہ تک جاری رہی اسی زبان کو محققین نے "درمیانی انگریزی" (Middle English) کا نام دیا ہے۔

ابتدائی دور میں انگریزی اور فرانسیسی زبانیں لازمی طور پر الگ رہیں۔ فاتحین فرانسیسی زبان بولتے تھے لیکن عام انگریزوں کی زبان اینگلو سیکسن رہی جس کی سرکاری اور ادبی حیثیت ختم ہوچکی تھی۔ فرانسیسی زبان اب عدالتوں، اسکولوں اور اعلیٰ حلقوں کی زبان تھی اور لاطینی کے ساتھ اس کا اثر مذہبی دائروں میں بھی بڑھ رہا تھا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی میں نارمنوں نے فرانسیسی زبان و ادب کو ہی تقویت پہنچائی لیکن جب ۱۲۰۴ء میں نارمنڈی (Normandy) کا صوبہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو انہوں نے "دیسی زبان" کی طرف توجہ شروع کی۔ اس طرح "جزائری وطنیت" کے احساس نے انھیں عوام سے نزدیک کردیا اور دیسی زبان سیکھنے پر مجبور کردیا۔ اس طرح فرانسیسی اور اینگلو سیکسن زبانوں کے میل سے ایک تیسری زبان

لہ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ انگلستان میں نارمنوں کی طرح ہندوستان میں مسلمان فاتحین بھی اپنی زبان یعنی فارسی لے

پیدا ہوئی ہے جسے ہم جدید انگریزی (Modern English) سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ انقلابات بارھویں اور تیرھویں صدی میں رفتہ رفتہ رونما ہوئے یہاں تک کہ چودھویں صدی میں چاسر اور اس کے معاصرین کے لئے زمین تیار ہو گئی۔ انگریزی اب خالص "قومی" زبان ہو گئی۔ سن ۱۳۵۰ء میں اسے ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا اور سن ۱۳۶۲ء میں یہ عدالتوں کی زبان ہو گئی بلکہ ۱۳۹۹ء میں ہنری چہارم کے عہدِ حکومت میں پارلیمنٹ نے بھی اسے اپنا لیا۔

مذہبی ادب نارمن فتوحات کے بعد تقریباً ایک صدی تک انگریز مصنّفین جمود کے شکار رہے لیکن اس کے بعد جب بارھویں صدی کے آخر میں کچھ رسالے لکھے گئے تو ان کی حیثیت خالص مذہبی رہی۔ ایک مغلوب قوم جسے اس کے کلچر اور روایات سے محروم کر دیا گیا تھا "مذہب" کے علاوہ کہیں اور جائے پناہ نہیں پا سکتی تھی اسی لئے ادیبوں نے اپنی ادبی کوششیں پند و نصائح، مذہبی گیتوں، سنتوں کی سوانح عمریوں اور دعائیہ اشعار تک ہی محدود رکھیں۔ ان مذہبی تصانیف میں (Poema Motale) جسے ہم مغربی "اخلاق نامہ" کہہ سکتے ہیں، عیسائی قوم کو مادی دنیا اور اس کی آلائشوں سے گریز کے ساتھ روحانیت کی تلقین کرتی ہے۔ مصنف لوگوں کو قیامت اور جہنم کا خیال دلاکر مذہب کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (Ormulum) "مناجاتوں اور مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے جسے "آرم" نامی سنت نے سن ۱۲۰۰ء میں تصنیف کیا۔ اس مجموعہ میں شعری محاسن کم ہیں لیکن مصنّف کے خلوص اور مذہبی جوش سے انکار نہیں۔ رابرٹ مینگ کی تصنیف (Handlynge Sinne) (جو سن ۱۳۰۳ء میں لکھی گئی) بھی مذہبی ہے لیکن آخری حصّہ میں مصنّف کا لہجہ طنزیہ ہو گیا ہے۔ اس کے طنزیات زمینداروں اور "ابلہان کلیسا"

کر آئے اور عرصہ تک یہی زبان دربار اور عدالتوں میں رائج رہی لیکن حاکم و محکوم میں یہ تفریق زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکی بالآخر ہندی اور فارسی کے میل سے وہ زبان پیدا ہوئی جسے ہم ہندوستانی یا اُردو کہتے ہیں۔

انگلستان میں مختلف بولیوں کے باوجود جو اہمیت انگریزی زبان کی ہے کم و بیش وہی حیثیت ہندوستان میں اُردو کی ہے جس نے اپنے اندر تمام علاقائی زبانوں کی بہترین خصوصیات جمع کر لی ہیں۔

سے متعلق ہیں۔

غیر مذہبی (سیکولر) شاعری مذہبی شاعری کے ساتھ ساتھ فرانسیسی ادب کے زیر اثر انگریزی میں ایک خاص قسم کی سیکولر شاعری بھی ترقی پا رہی تھی جس پر رزمیہ انداز غالب تھا۔ چونکہ یہ نظمیں فرانسیسی رومانوں کی تقلید میں لکھی گئیں۔ اس لئے وہ چنداں قابل توجہ نہیں لیکن ان کی تاریخی اہمیت ضرور ہے۔ غازیانہ شاعری Chivalrous Poetry کے آزاد ترجموں اور فرانسیسی قصّوں Fabtieux سے آئندہ انگریزی شاعری کے لئے زمین تیار کرنے میں بڑی مدد ملی۔

"لیامون" Layamon اس دور کے شاعروں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اس نے کلاسیکی ادب سے Roman de Brut کا ترجمہ کیا جس میں اس کی سیکسن دشمنی کے باعث "غداری" کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیامون ایک مترجم کا ذہن اور شاعر کا دل رکھتا تھا۔ اسی لئے آرتھر کی داستان Arthurian Legead کو روایتی رنگ میں پیش کرنے کے باوجود اس کے یہاں ایک قسم کی لطافت اور تازگی ملتی ہے۔ اس کے بعد انگریزی ادب میں طبع زاد تخلیقات کی جگہ ترجموں، تذکروں اور تواریخی و مذہبی مباحثوں کا دَور شروع ہوا۔ اس سرمایہ کی اہمیت محض اس لئے ہے کہ چاسر اور اس کے معاصرین نے انھیں بنیادوں پر شاندار عمارتیں تیار کیں۔

رزمیہ دور کے بعد چودھویں صدی سے انگریزی شاعری پر فرانسیسی اثرات کے تحت طنزیہ میلان غالب نظر آتا ہے۔ چاسر اور گاور کی شاعری کا تصور بغیر اس روایتی پس منظر کے محال ہے۔ سیکولر شاعری میں مذہبی و اخلاقی قید نہ ہونے کی وجہ سے اکثر عشق و عاشقی، طنز و مزاح کے بھی موقعے ملتے تھے اسی لئے چاسر کے دَور میں ہمیں سیکولر شاعری اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

"روتی کتیا" The Weeping Bitch سے اس زمانہ کی شاعری کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک منظوم قصہ ہے جس میں ایک جادوگرنی کسی پادری کی محبت کا اظہار اس کی محبوبہ کے سامنے کرتی ہے۔ محبوبہ کسی مہاجن کی بیوی تھی اس لئے اپنے عاشق کی "وعدۂ فردا" سے زیادہ

ہمت افزائی نہیں کرسکی تھی۔ ایک دن جادوگرنی اپنے ساتھ ایک کتیا لائی جو مسلسل آنسو بہا رہی تھی جادوگرنی نے آبدیدہ ہوکر مہاجن کی بیوی سے کہا کہ کتیا اس کی بیٹی ہے۔ جب اس نے پادری کی محبت ٹھکرادی تو اس نے اس کا روپ ہی بدل دیا۔ اتنا سننا تھا کہ محبوبہ نے گھبرا کر خود کو پادری کے قدموں میں ڈال دیا۔

"لومڑی اور بھیڑیا" The Fox & The Wolf بھی ایک دلچسپ قصّہ ہے جس میں ایک لومڑی جو کنوئیں میں گر پڑی ہے۔ ایک بھیڑیئے کو اپنے پند و نصائح اور منطق کے زور سے اپنی جانشینی پر آمادہ کرلیتی ہے۔

اس دور کی سیاسی نظموں کی بھی خاص اہمیت ہے کیونکہ یہ ترجمہ یا تالیف کے بجائے جوش و جذبہ اور محبت و نفرت کی پیداوار ہیں۔ ادب میں افادی اور تنقیدی لَے عام تھی اس لئے غیر درباری شاعروں نے اپنے کلام میں امراءِ حکومت اور ارباب کلیسا کے مظالم، گمراہ کُن جرائم اور ذہنی و اخلاقی پستیوں کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ Songs of Husbandman میں شاعر نے حکومت اور ٹیکس کے نظام کی بڑی مذمت کی ہے۔ اسی طرح دوسرے شاعروں نے بھی سماجی تفریق، ارباب کلیسا اور دوسرے سامنتی اداروں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ وسطی انگریزی Middle English کا بیشتر ادبی سرمایہ اخلاقی تھا۔ اس زمانہ میں پادریوں کا بہت زور تھا۔ اس لئے انھوں نے اپنے پند و نصائح کو عوام تک پہنچانے کے لئے محراب و منبر کا سہارا لیا۔ اس طرح قومی زبان کے ساتھ "عوامی ادب" بھی پیدا ہونے لگا۔ تعلیم کی سہولتوں اور چھاپہ خانوں کی ایجاد سے یہ تصانیف ذاتی مطالعہ میں بھی آنے لگیں جس سے ان کے اثرات روز بروز بڑھنے لگے۔

چاسر کا دَور : The Age of Chaucer

چاسر کا دَور ازمنہ وسطیٰ Middle Ages اور عہدِ جدید کے درمیان عبوری دَور ہے جس میں انگلستان قدیم خیالات و روایات سے نکل کر نئے زمانہ کی تمام تر کشمکشوں کی جولان گاہ بن گیا تھا۔ اس دور میں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم یکا یک تاریک زمانوں

سے نکل کر نئے ماحول کی کھلی ہوئی اور تازہ فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ۱۳۸۱ء میں کاشتکاروں کی بغاوت Peasents' Revolt دورِ جدید کے انقلابات کا پیش خیمہ تھا۔ اسی تحریک سے مشتعل ہو کر خستہ حال کسانوں نے دارالخلافہ پر قبضہ کر کے سب سے پہلے نعرۂ جمہور بلند کیا۔ اسی طرح وکلف Wycliff کے باغیانہ نعرے اور تجدید و اصلاح کی کوششیں خالص نئے زمانہ کی پیداوار تھیں۔ اس دور کے ادب میں طنزیہ میلان اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ اب ادب خیالی و فرضی دنیا سے نکل کر مادی اور سماجی زندگی کے واقعات اور حقائق کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس دور کے چار بڑے ادیبوں میں وکلف Wycliff مذہبی اصلاح کے لئے کوشاں رہا۔ لینگلینڈ Lengland نے عہدِ وسطیٰ کے نظامِ زندگی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور گاور Gower بھی اپنے زمانہ کی معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں سے کم بدظن نہ تھا۔ چاسر Chaucer کے یہاں تو یہ تمام محرکات یکساں طور پر کارفرما تھے جس سے اسے "جدیدیت کا بانی" اور انگریزی ادب کا باوا آدم Father Of English Literature کہا جاتا ہے۔

چاسر کے دور میں طنزیہ میلان کی ذمہ دار در اصل اصلاحی جذبہ اور قدیم اور روایتی مذہب سے بیزاری تھی۔ چنانچہ جب مذہب کی جگہ تشکیک Scepticism نے لے لی اور عوام کے اندر حکومت اور اقتدار کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا تو سائنٹی نظام اور مذہبی اداروں کے خلاف کھلے چیلنج دئے گئے۔ ایک بات البتہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایسے انقلاب پذیر دور میں جب زندگی اور سماج کا پرانا نظام آخری سانس لے رہا تھا تو حساس طبائع ماضی کے سنہرے خوابوں میں ذہنی و روحانی تسکین کی تلاش کر رہے تھے۔ اس طرح مصلحوں، شاعروں اور مذہبی قائدوں نے روایات سے بغاوت کے باوجود ان کا احترام کیا اور سماج کو تخریبی عناصر سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔

"کریچی" Crecy ۱۳۴۶ء اور پائتیر Poitier ۱۳۵۶ء کی فتوحات نے انگلستان میں خالص قومی جذبہ کو جنم دیا جو رفتہ رفتہ جزائری وطنیت میں بدل گیا۔ چودھویں صدی سے پہلے کیتھولک مذہب کے زیر سایہ عیسائی ممالک کا ایک یورپین وفاق تھا جو

جغرافیائی حدود سے بے نیاز تھا لیکن جب انگلستان کے قبضہ سے فرانسیسی صوبے نکلتے گئے۔ اور اسپینی و ولندیزی بحری بیڑوں نے برطانیہ کی سیاسی غفلت کو مقابلہ کی دعوت دی تو وطنیت کے تصور کو مزید تقویت ملی۔ طاعون کی بیماری (۱۳۴۸ء) نے برّاعظم یورپ میں جو تہلکہ مچا رکھا تھا اس سے انگلستان بھی نہیں بچ سکا۔ قیمتوں میں اتار چڑھاؤ اور معاشی توازن کے بگڑنے سے مزدور طبقہ بے حد پریشان تھا۔ اس کا نتیجہ صریح ۱۳۸۱ء کی عوامی بغاوت ہے جس میں عوام نے اعلیٰ طبقات کے اقتدار اور دولت کی غلط تقسیم کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ ملک میں ان سیاسی اور معاشی انقلابات کی وجہ سے سامنتی نظام کا چولہ رفتہ رفتہ بدلنے لگا۔ چاسر کے ہمعصر لینگلینڈ نے قدیم نظام کی نہایت تلخ لہجہ میں مذمت کی۔ اس کے یہاں بدلتے ہوئے اقدار کی جو تصویریں ملتی ہیں ان سے ہمیں اس دور کے انتشار کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ بادشاہ عوام کا نمائندہ ہونے کے باوجود ان کے فلاح و بہبود سے قطعاً بیگانہ تھا۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے اراکین اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے کوشاں تھے اور ارباب کلیسا خود غرض، عمل بے ایمانوں اور بدعنوانیوں کے سہارے چل رہے تھے۔ لینگلینڈ کا کلام حال سے بیزاری اور ماضی کے پرسکون نظام زندگی کی زندہ تصویریں پیش کرتا ہے۔ اسی طرح چاسر نے بھی "حکایات کنٹربری" **Canter Bury Tales** میں قدیم و جدید میلانات کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اس کی "حکایات" کے تمہیدی حصہ **Prologue** میں ہمیں ایک فنکار کے مشاہدہ اور قوت تخیل کے بہترین شاہکار ملتے ہیں جن میں اس نے قومی کردار کا تصویر خانہ بنایا ہے۔

شاعری چاسر کے دور کی بہترین تصنیفات شاعری میں ہی ملتی ہیں کیونکہ سماج اور زندگی میں جو نیا جذبہ کارفرما تھا اس کے لیے شاعری کی زبان ہی نہایت موزوں تھی لیکن یہ دور ایک شاندار ادبی عہد اس لیے نہ ہو سکا کہ ملک کی وحدت کو علاقائی زبانوں سے زبردست دھکے لگے۔ چودھویں صدی تک انگلستان میں چار علاقائی زبانیں ——— شمالی، جنوبی، مشرقی وسطانی اور مغربی وسطانی زبانیں ——— اپنی عظمت منوانے کے لیے میدان میں تھیں لیکن فتح بالآخر اکا نیلان کو ہوئی جس میں چاسر نے اپنی "حکایات" تصنیف کی۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے انگریزی شاعری ابھی تک رومانوی اور تمثیلی نظموں سے

بے نیاز نہیں ہو سکی تھی۔ "سر گاون اینڈ گرین نائٹ" Sir Gawain & the Green Knight جیسی داستانیں اب بھی ملک میں مقبول تھیں۔ آرتھر کے افسانے، شارلیمین Charlemagne کے کارنامے اور جنگ ٹرائے کے واقعے اب بھی شاعروں کے لیے باعث فخر موضوعات تھے۔ اس رومانی شاعری میں مذہبی و دنیوی عناصر یکساں طور پر داخل تھے قصوں کے پس منظر عموماً قدیم قلعے، شکار اور ورزشی مقابلے Tournaments ہوا کرتے تھے۔ کبھی کبھی سماجی زندگی کی جھلکیاں بھی نظر آتیں لیکن اخلاقی عنصر ہمیشہ غالب رہتا۔

ولیم لینگلینڈ William Langland ۱۳۳۰ء سے ۱۴۰۰ء

لینگلینڈ مغربی انگریزی زبان کا نمائندہ ہے۔ وہ ایک ادنیٰ طبقہ کا پادری تھا مگر شعر و شاعری سے اس کا لگاؤ فطری تھا اسی لیے اس کی نظمیں مذہبی اور نیم مذہبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ "وژن آف پیئرس پلاؤمین" The Vision of Piers The Plowman ہے جس میں مغربی بولی کے الفاظ اور اصطلاحات کے باوجود بھرپور زور اور اثر موجود ہے۔ نظم میں تمثیلی رنگ نمایاں ہے لیکن وہ یورپی اور بالخصوص فرانسیسی شاعری کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔ یہ تصنیف مختلف اخلاقی تمثیلی نظموں کا مجموعہ ہے جسے ہم فرانسیسی شاہکار "داستان روز" Roman de la Rose کے بعد اس طرز میں دوسری مشہور نظم کہہ سکتے ہیں۔

اپنی شاعری میں لینگلینڈ نے چودھویں صدی میں انگلستان کے روبہ زوال سماج کی حقیقی تصویریں کھینچی ہیں اور رواجی عقائد و اعمال کے خلاف سخت احتجاج بھی کیا ہے۔ اس کے یہاں غم و غصہ اور طنز کے ساتھ اصلاح کا جوش بھی نمایاں ہے کیونکہ وہ ایک کامیاب زندگی کے لیے مذہب کی سچی پیروی اور ایمانداری و جفاکشی کو خاص اہمیت دیتا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر نقادوں نے اسے انگریزی شاعری میں "دانتے" Dante کا ہمنوا مانا ہے۔ اس لیے کہ اس کی شاعری بھی عیسائی طرز زندگی کے بہترین نمونے پیش کرتی ہے۔ "پیئرس پلاؤمین" نظم کی ابتدا میلورن پہاڑی پر شاعر کے ایک "رویا" Vision سے ہوتی ہے۔ جہاں ایک بڑے میدان میں امیروں اور غریبوں، مزدوروں اور کاشتکاروں کا ایک انبوہ ہے۔ خواب میں شاعر کو "کلیسا کی دیوی" Lady Holy Church کا درشن ہوتا ہے جو لوگوں کو ان کی مادیت اور خدا بیزاری سے آگاہ کر کے انھیں حقیقت و معرفت کے سبق دیتی ہے۔

گنہگاروں کا عظیم لشکر اپنے گناہوں کے کفارہ کے لیے صراطِ مستقیم کی جستجو میں ہے لیکن انھیں راستہ نہیں سوجھتا۔ حد یہ ہے کہ گرجا کے بانی اور پادری بھی ہراساں نظر آتے ہیں۔ اس نفسا نفسی کے عالم میں "پیئرس" Piers اپنی خدمات پیش کرتا ہے مگر راستے کی صعوبتوں کا حال سن کر کمزور اور بزدل لوگ پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور اس کے ساتھ سچے عیسائیوں کا ایک مختصر گروہ رہ جاتا ہے۔ نظم کے آخری حصہ میں شاعر اہل تثلیث سے مذہبی زندگی اور حضرت مسیح کی پیروی کی تلقین کرتا ہے۔

یہ نظم مختلف مناظر کا مجموعہ ہے لہٰذا اس میں شاعر کو چودھویں صدی کی معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کو نمایاں کرنے کا پورا موقع ملا ہے۔ وہ حکومت کی بدعنوانیوں اور دولت کی غلط تقسیم کا اپنے طنزیہ تمثیل میں اسی طرح ذکر کرتا ہے جس طرح اس نے اہلیانِ کلیسا کے مکر و فریب کا پردہ فاش کیا ہے۔ چونکہ لینگلینڈ خود پادری تھا اور خطابت و موعظت میں اس کی ساری زندگی گزری تھی اس لیے شاعری میں بھی خطابت کا انداز نمایاں ہے۔ عوام سے خطاب کے لیے اس نے انھیں کی زبان استعمال کی اور مذہب و معاشرت، اخلاق و سیاست کو تمثیلی رنگ دے کر لوگوں کو سچے عیسائی مذہب کی طرف متوجہ کیا۔ اس کا ہیرو "پیئرس" Piers حضرت مسیح اور لینگلینڈ کی شخصیتوں کا امتزاج ہے۔ وہ مسیح کی طرح سچے مذہب کا پرستار ہے۔ لیکن شاعر نے اس میں اپنی شخصیت کا انسانی رنگ بھی بھرا ہے۔ اسی لیے کہ وہ اپنے خالق کا راز داں ہی نہیں بلکہ سماج اور مذہب کی برائیوں کا نقیب بھی ہے۔

جان گاور John Gower سنہ ۱۳۳۰ء سے ۱۴۰۸ء تک

چاسر کے ہمعصروں میں گاور بھی خاص اہمیت کا مالک ہے۔ اسے لاطینی اور فرانسیسی زبانوں پر وہی قدرت حاصل تھی جو اپنی مادری زبان پر تھی۔ وہ ان زبانوں میں یکساں روانی سے شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ انگریزی میں وہ "مشرقی بولی" کا نمایندہ ہے۔ اس لیے ہم اسے "شاہی انگریزی King's English" کا پہلا مشہور شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں پہلے لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کا اثر رہا لیکن اس کے بعد چاسر کے زیرِ اثر اس کی زبان خالص انگریزی ہو گئی۔ گاور اینگلو نارمن شاعروں کے سلسلہ میں آخری کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی عشقیہ نظموں میں ان سے قریب ہے بلکہ اس کا منظوم وعظ Speculum Meditantis بھی انھیں روایتی

تصورات کا حامل ہے لیکن اپنے شعری کارناموں کی روشنی میں گاور شاعر سے زیادہ "معلم" نظر آتا ہے۔

۱۳۸۱ء کی عوامی بغاوت نے گاور کی حساس طبیعت کو بہت متاثر کیا۔ وہ فطرتاً جاگیرداروں اور زمینداروں کا حامی تھا۔ اس لیے اس کی تمام تر ہمدردیاں انھیں کے ساتھ تھیں۔ اس کی لاطینی نظم "غوغائے شر" Vox Calamantis عوامی بغاوت کا طنزیہ نقشہ ہے۔ خواب میں شاعر کو ایک میدان میں زبردست بھیڑ نظر آتی ہے جس میں جانوروں کی طرح عام انسانوں کی شر پسندی کا مذاقیہ پہلو دکھائی دیتا ہے ـــــ گدھے شیروں کا روپ بنائے بوجھ ڈھونے سے انکار کرتے ہیں، بیل ہل کھینچنے کا نام نہیں لیتے، کتے شکاریوں کی طرف بھونکتے ہیں اور بلیاں خواہ مخواہ غراتی پھرتی ہیں۔ ایک "نیل کنٹھ" (عوامی لیڈر "واٹ ٹیلر" کا تمثیلی ہم جنس) انھیں لاقانونیت اور بدعملی کے سبق پڑھاتا ہے اور جانوروں کا یہ لشکر دارالخلافہ (لندن) کو تباہ کر دیتا ہے لیکن سرغنہ کی موت کے بعد ان سب کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ خواب سے بیدار ہو کر شاعر خالص اخلاقی انداز میں سماج کی برائیوں کے خلاف واعظانہ دھن اختیار کر لیتا ہے۔

Confessio Amantis (۱۳۸۳ء) واحد انگریزی نظم ہے جو چالیس ہزار اشعار پر مشتمل مختلف کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظم شاہ رچارڈ کے حکم پر لکھی گئی جس میں شاعر کو اپنی مرضی کے خلاف عشقیہ انداز اختیار کرنا پڑا۔ واقعہ یوں ہے کہ شاعر کی محبوبہ (محبت کی دیوی یعنی وینس) اسے پادری کے سامنے اعترافِ گناہ پر آمادہ کرتی ہے۔ فرمانبردار عاشق "پادری" کے پاس جاتا ہے جو محبت کے امتحان میں اس کے ضمیر کا جائزہ لیتا ہے۔ پادری اس کی محبت کا قائل ہو کر ایک شرط یہ بھی لگاتا ہے کہ عاشق مختلف گناہوں کو کہانیوں کے پیرایہ میں بیان کرے تاکہ اس کا دعویٰ ثابت ہو سکے۔ سادہ لوح عاشق اپنی قابلیت کا اظہار کر کے "وینس" کو بدظن کر دیتا ہے اور وہ اس کی بوالہواسی کا مذاق اڑا کر اپنا راستہ لیتی ہے۔

اس طویل نظم میں شاعر نے ساتوں مہلک گناہوں Seven Deadly Sins کو مختلف چھوٹے گناہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کہانیاں اس امر کی دلیل ہیں کہ شاعر کو دینی اور دنیوی علوم پر زبردست قدرت حاصل تھی لیکن ان کہانیوں کو خواہ مخواہ اخلاقی پھندوں میں پھنسا کر گاور نے نظم کی وحدت کو نقصان پہنچایا ہے۔ ان کی اہمیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے۔ اس لیے کہ چاسر جیسا فنکار بھی

اس کی خوشہ چینی کرتا ہے۔ "حکایات کنٹربری" کی چند کہانیاں گاور کی Confessio Amantis کی یاد دلاتی ہیں۔

چاسر Chaucer سنہ ۱۳۴۰ء سے سنہ ۱۴۰۰ء تک

چاسر کے ہمعصروں نے اپنے دور کی معاشرتی اور ذہنی زندگی کی کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے کیونکہ اگر Pearl کا مصنف ہمیں صوفیانہ تصورات سے روشناس کرتا ہے تو لنگلینڈ ایک بپھرے شیر کی طرح حکومت اور مذہبی و سماجی اداروں پر حملے کرتا ہے۔ وکلف کے یہاں اگر مذہبی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے تو گاور عوامی بغاوت کی تباہ کاریوں سے ہراساں ہو کر جاگیردارانہ نظام کی حمایت کرتا ہے۔ اس دور کے ہر شاعر کا اپنا منفرد نصب العین تھا مگر ہر ایک نے شاعری کو خاص افادی حیثیت دی۔ چاسر کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے ہمعصر زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس میں جزئیات کے ساتھ حقیقت آمیز تخیل بھی بھرپور موجود ہے۔ اپنے معاصرین میں چاسر نے تخیلی فنکاری کو افادی شاعری پر ترجیح دی۔ اس نے کبھی فلسفہ یا اخلاقیات کے سبق نہیں دیے اس کے یہاں ایک اعلیٰ ذہن کی ژرف نگاہی اور بے لاگ معروضیت ملتی ہے۔ اسی لیے اس کی شاعری غیر جانبدارانہ اوصاف کی حامل ہے۔ اس کی ہمدردیاں نہ تو عوام سے ہیں اور نہ خواص سے۔ بلکہ وہ ایک سچے فنکار کی حیثیت سے سب کو اپنے مرقع میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ابتدائی دور ترجمہ و تقلید سے لے کر اپنے شاہکار "حکایات کنٹربری" تک چاسر نے حقیقت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

چاسر کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت اور اس دور کے ادبی ماحول کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ چاسر اپنے زمانہ کے کامل انسانوں کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے کیونکہ وہ مدبّر ہونے کے علاوہ سپاہی اور عالم بھی تھا۔ اسے درباری اور عام انسانی زندگی کا کافی علم تھا۔ اسی طرح اس نے فرانس اور اٹلی کے سفر سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا تھا۔ اس دور کے دوسرے عالموں کی طرح اسے لاطینی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ چاسر کا زمانہ دراصل "بیانیہ شاعر Narrative Poetry" کے عروج کا دور تھا۔ ڈرامہ ابھی تک گرجاؤں کے گہوارہ میں تربیت پا رہا تھا اور "بیلڈ" Ballad زبانی ادب Oral Literature تک محدود تھا۔ غنائی شاعری بھی برائے نام

ہی تھی ۔ ان تمام اسباب کی بنا پر چاسر اور اس کے معاصرین نے بیانیہ شاعری میں ہی اپنے فن اور کمال کا اظہار کیا ۔ چاسر کی بیانیہ شاعری کے پس پشت یورپی ادب کی شاندار روائتیں تھیں ۔ جن میں رومان، تمثیل اور افسانوں کو کافی دخل تھا ۔ چاسر بھی اپنی شاعری میں فرانسیسی اور اطالوی اثرات سے بے نیاز نہ رہ سکا ۔ نقادوں نے اس کی ادبی زندگی کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے:۔

۱ ۔ فرانسیسی اثرات کا دَور ۱۳۵۹ء سے ۱۳۷۲ء ۔ اس زمانہ کی سب سے مشہور تصنیف The Boke of Duchesse ہے جو ۱۳۶۹ء میں لکھی گئی ۔ شاعر خواب میں موسم بہار کی ایک صبح شاہنشاہ آکٹوین کے ساتھ شکار کو جاتا ہے ۔ وہ اپنا راستہ بھول جاتا ہے مگر ایک کتا اس کی رہنمائی کرتا ہے اور اسے کسی پریشان حال عاشق کے پاس لاتا ہے ۔ شاعر اس سے اس کی داستانِ محبت کو سُن کر اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے ۔ اسی دَور میں چاسر نے فرانسیسی رومان Roman de La Rose کا ترجمہ بھی کیا ۔

۲ ۔ اطالوی اثرات کا دَور ۱۳۷۲ء سے ۱۳۸۶ء :۔ اپنی شاعری کے اس منزل پر پہنچ کر چاسر نے دانتے Dante اور بوکیچیو Boccacio کو مشعل راہ بنایا ۔ اپنی مشہور نظم The House of Fame میں شاعر نے شہرت عام پر نہایت دلچسپ طنز کیا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ انسان کی زندگی میں عزت و عظمت اتفاقیہ امور ہیں جن کو استحقاق سے کوئی تعلق نہیں ۔ اس کی دوسری نظم The Parliament of Fowls بھی ایک خواب کی تمثیل ہے جس میں فطرت کی دیوی تمام چڑیوں کو اپنی مادہ چننے کا حکم دیتی ہے اور سب کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے ۔ شاعر نے اس نظم میں مختلف کیفیات کو نہایت حسن و خوبی سے فطرت کے آفاقی قانون اور ادنیٰ و اعلیٰ تک مختلف مدارج کی نمایندگی کی ہے لیکن اس دَور کی مایۂ ناز تصنیف Troilus & Cryssede ہے جو ۱۳۸۶ء کے قریب لکھی گئی ۔ یہاں پہنچ کر چاسر اپنے ابتدائی کلام کے تمثیلی دھندلکے سے نکل کر حقیقی انسانی جذبات کا شاعر ہو جاتا ہے ۔ یہ کہانی جنگ ٹرائے کے ناکام عاشق "ٹرائلس" اور اس کی محبوبہ "کریسیڈ" کی بے وفائی کا المیہ ہے ۔

جس میں چاسر نے کلاسیکی انداز میں محبت اور انسانی جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے۔

۲۔ انگریزی دور ۱۳۸۶ء سے ۱۴۰۰ء:۔ ٹرائلس کی کہانی کے بعد چاسر کی شاعرانہ بلوغت کا دور شروع ہوتا ہے۔ جب اس نے انگریزی سماج کو موضوع سخن بنا کر یورپی ادب میں اپنا خاص مقام حاصل کر لیا۔ اب اسے اپنی خداداد صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ اس لیے انسانی زندگی کا جو مشاہدہ اس نے کیا تھا وہ تخیلی رنگ میں نکھر کر "حکایات کنٹربری" کی شکل میں منظر عام پر آیا۔

"حکایات کنٹربری" سے پہلے اس پایہ کا فنی شاہکار نایاب ہے۔ فرانسیسی شاعر بنوا نے اسی طرز پر Roman de Troie لکھی ہے لیکن دونوں کا انداز مختلف ہے۔ چاسر کے یہاں ساری کہانیاں ایک بڑے زنجیر کی کڑی معلوم ہوتی ہیں لیکن فرانسیسی شاعر اس حد تک کامیاب نہیں ہے۔ اس کے سارے کردار ایک صف میں کھڑے بے جان بت معلوم ہوتے ہیں "حکایات" میں چاسر کے کردار جیتے جاگتے "بانکے ترچھے" چھوٹے بڑے، حسین و کریہہ اور پاکدامن و فاحش انسانوں کا میلہ لگاتے ہیں۔ اسے ہم بجا طور پر چاسر کا انسانی طربیہ Human Comedy کہہ سکتے ہیں۔

اگر چاسر کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے "تمہیدیہ" Prologue کا مطالعہ کیجیے جو اپنی جگہ خود ایک مکمل ادبی شہ پارہ ہے اور جس میں فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی اثرات کا نمونہ چاسر بڑے حسن و خوبی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ چاسر سے پہلے انگریزی ادب میں کسی نے کردار نگاری کے اس قدر صحیح نمونے نہیں پیش کیے تھے۔ اس نے جس وقت نظر سے کردار اعلیٰ کے سماجی مدارج اور ان کے شخصی و آفاقی خصائل کو بیان کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ "سورما" Knight اور اس کا بیٹا بڑے خاندانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں ڈاکٹر اور آکسفورڈ کا طالب علم پیش پیش ہیں۔ قصبہ کے لوگوں میں "باتھ کی بیگم" Wife of Bath اور ملاح شامل ہیں۔ ان سبھوں کے علاوہ نوکروں، خانساماؤں، کسانوں اور دوسرے پیشہ ورعمل کو بھی مخصوص مقام حاصل ہے۔ مذہبی ادارے اور ان کے ارباب حل و عقد کو بھی چاسر نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے بڑے پادریوں سے لے کر گاؤں کے معمولی پادریوں تک کے جو نقشے کھینچے ہیں اور

ان کے قول و فعل کے تضاد کو جس مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں پیش کیے ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ "حکایات" کا "تمہیدیہ" قومی کرداروں کا "نگار خانہ" ہے۔

کینٹربری جانے والے زائرین کے ذریعہ چاسر جن کہانیوں کو کہلواتا ہے۔ ان سے ہم مختلف ذہن و مزاج، میلان و رجحان کا پتہ لگاتے ہیں۔ انسانی فطرت کا جس قدر گہرا اور سچا مطالعہ چاسر نے کیا ہے وہ انگریزی ادب میں شیکسپیئر اور ڈکنس کے یہاں ہی مل سکتا ہے لیکن چاسر شیکسپیئر کی طرح "شاعرانہ کردار" نہیں بناتا اور نہ ڈکنس کی طرح مبالغہ آمیز جذباتی انداز اختیار کرتا ہے۔ اس کے کردار زندگی سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے خیر و شر یا جنت و جہنم کے مسائل سلجھانے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ اپنے معاصرین کی طرح اخلاقیات کا معلم بننا ہی پسند کیا۔ فن اس کا مقصد تھا اور زندگی کی عکاسی اس کا شعار۔

چاسر نے جہاں ہر طرح کے لوگوں کے خیالات و جذبات کی ترجمانی ان کی کہانیوں کے ذریعہ کی ہے وہاں عریانی سے بھی اس کا کلام پاک نہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس زمانہ میں لوگوں نے زندگی کو اخلاقی و غیر اخلاقی خانوں میں تقسیم نہیں کیا تھا۔ وہ زمانہ توانا اور صحت مند زندگی کو مقصد حیات بناتا تھا۔ اس لیے ادب میں فحاشی اور مریضانہ جنس پرستی کا غلبہ نہیں تھا بلکہ اسے زندگی کا ضروری عنصر سمجھ کر داخل کر لیا گیا تھا۔ چاسر کے یہاں "عریانی" زندگی کے اس ہمہ گیر تصور اور اثباتی نقطۂ نظر کا ہی لازمی جزو ہے۔

چاسر کا مقام نہ صرف چودھویں صدی کے انگریزی ادب میں بلند ہے بلکہ ہم اسے بجا طور پر انگریزی شاعری کا "ابوالبشر" کہہ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے انگریزی شاعری پر فرانسیسی اور یورپی اثرات کی گہری پرچھائیں تھی۔ اس لیے خالص ملکی موضوعات کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ اس سلسلہ میں کبھی کوششیں بھی ہوئیں تو محض طنزیہ لہجہ میں۔ لیکن چاسر نے ابتدائی دور کے کلام کے بعد خالص انگریزی ماحول اور انگریزی کرداروں کے ذریعہ قومی زندگی کی ترجمانی کی۔ اینگلو سیکسن اور مختلف علاقائی بولیوں کی کشمکش کے باوجود اس نے جو زبان اپنی شاعری میں استعمال کی اسے ہم اب تک جدید انگریزی سے بہت قریب پاتے ہیں۔ اس کی تشبیہات و استعارات میں سادگی اور رنگینی کا حسین امتزاج ہے اور کہیں سے بھی تصنع و تکلف کا احساس نہیں ہوتا۔

نثر

اگر کسی ملک کی سیاسی و سماجی نیز ذہنی ترقیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کی نثر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ چاسر کا دور بنیادی طور پر شاعری کا دور تھا اس لیے نثر کو کوئی خاص جگہ نہیں مل سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانہ تک اطالوی اور فرانسیسی اثرات انگریزی نثر کی ترقی میں مانع تھے اور بلند پایہ مصنفین لاطینی زبان میں ہی تذکرے، تبصرے اور تواریخ لکھتے تھے۔ نثر کی ترقی کا سارا دارومدار ترجموں پر رہ گیا تھا جس میں پادریوں اور نیم مذہبی ادیبوں نے اہم حصہ لیا۔ یہ ترجمے لاطینی، اطالوی اور فرانسیسی زبانوں سے کیے جاتے تھے۔ "سر جان کے سفرنامے" Travels of Sir John Mandeville" درحقیقت فرانسیسی سے ترجمہ ہے جسے زمانۂ حال تک انگریزی تصنیف خیال کیا جاتا تھا۔ یہ ایک فرضی انگریز ہیرو کے فلسطین و چین کے سفر کی روداد ہے جو ڈیفو Defoe اور سوفٹ Swift کے سفرناموں سے زیادہ نزدیک ہے۔ یہاں بھی عجیب و غریب انجان ملکوں کی سیر کرائی گئی ہے جہاں سانپوں کا سامراج تھا اور لوگوں کے سر کتوں کی طرح ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اس داستان میں جانوروں کے قصوں اور مختلف مروجہ کہانیوں کو بھی خواہ مخواہ جگہ دی گئی ہے۔

باقاعدہ نثری کارناموں میں چاسر کی اہمیت تاریخی ہے لیکن وہ خود شاعری کے آگے نثر کو زیادہ لائق اعتنا نہیں سمجھتا۔ اسی لیے اس کی حیثیت ایک مترجم سے زیادہ نہیں۔ ۱۳۸۱ء میں اس نے بوتھیس کے فلسفہ کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ اس کے شاہکار "حکایات کنٹربری" میں مختلف زبانوں کی کہانیوں کے ترجمے شامل ہیں جنھیں اس نے انگریزی ماحول سے مطابق کر لیا ہے۔

اس دور کے مترجموں اور تذکرہ نگاروں کے درمیان وکلف Wycliff کی حیثیت منفرد ہے۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا مصنف ہونے کے علاوہ مشہور مذہبی رہنما بھی تھا۔ یہی نہیں بلکہ کیتھولک مذہب کی مخالفت کی بنا پر اس نے انگلستان میں خاصی شہرت بھی حاصل کر لی۔ جب ۱۳۶۵ء میں شاہ انگلستان اور روم کے پوپ کے درمیان مذہبی اور سیاسی تنازعے ناگفتہ بہ حد تک بڑھ گئے تو وکلف نے شاہ کی حمایت میں کیتھولک چرچ کی شدید مخالفت کی۔ وہ آزاد طبیعت آدمی تھا اور عہد وسطیٰ کے فلسفہ اور منطق پر خاصہ عبور رکھتا تھا۔ وہ ان علوم کا مذہب پر بڑی

کامیابی سے اطلاق کرسکتا تھا جس کی وجہ سے اسے انگلستان میں پروٹسٹنٹ مذہب کا بانی کہا گیا ہے اس نے پوپ اور کلیسا کی سیاسی مداخلت پر سخت اعتراضات کیے جو ہمیشہ لاطینی زبان میں لکھے گئے تھے لیکن جب اسے اپنی تحریک کو عوام تک پہنچانے کی ضرورت پڑی تو ۱۳۸۰ء سے اس نے انگریزی زبان میں لکھنا شروع کیا۔ اس کے پیرو "لالرڈ" "Lollard" کہلائے۔ یہ جماعت غریب پادریوں کی ایک گروہ تھی جو گاؤں گاؤں جاکر عوام کو پاپائیت کے خلاف مشتعل کرتی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب وکلف نے اپنے رفقاء کی مدد سے بائبل کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔

وکلف کی اہمیت چودھویں صدی کے نصف آخر میں وہی ہے جو شاعری میں چاسر کی ہے لیکن اگر چاسر کے یہاں سیاسی و سماجی مسائل کو کوئی خاص جگہ نہیں ملتی تو دوسری طرف وکلف کا سارا سرمایہ انھیں مسائل تک محدود ہے۔ وہ انگریزی نثر میں آزادی ادب کا پہلا نمائندہ ہے۔ عوام تک رسائی کے لیے اس نے سادہ وسلیس زبان استعمال کی۔ بائبل کے مترجم کی حیثیت سے بھی اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس لیے کہ باوجود تمام خامیوں کے یہ اپنے طرز کا پہلا ادبی کارنامہ ہے۔ جس کے نمونہ پر ۱۶۱۱ء میں بائبل کا مستند ترجمہ Authorised Version ممکن ہو سکا۔ وکلف نے اپنی نثری تصانیف سے مذہبی اصلاح Reformation کے لیے راستہ صاف کر دیا اور انگریزوں میں نئے مذہب کی تلقین کی۔

ڈرامہ کا ارتقا

ازمنہ وسطیٰ کے ادب پر مذہب کا جو اثر پڑا اس سے ڈرامہ بھی بے نیاز نہیں رہ سکا۔ فن ڈرامہ اپنے ابتدائی دور میں مذہب سے بہت نزدیک رہا ہے۔ یونانی، ہندوستانی، چینی اور عیسائی ڈرامہ کی تاریخ اس کی شاہد ہے کہ مذہبی جذبات کا اظہار تماشہ کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ قدیم یونانیوں نے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے لیے ڈرامہ ایجاد کیا۔ مذہبی میلانات کی طرح انسان میں ناچ گانے اور اداکاری کے میلانات بھی فطری ہیں اس لیے ڈرامہ کے ارتقا میں اس امر کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ اہل کلیسا ڈرامہ کو مذہبی خیالات کی اشاعت کا آلہ بناتے ازمنہ وسطیٰ کے گویّے Minstrels ناچ گا کر لوگوں کی تفریح کا سامان کیا کرتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بادشاہوں کے درباروں اور قلعوں میں ان کی رسائی تھی اور وہ لڑائی کے میدانوں میں جاکر سپاہیوں کی ہمت بھی بڑھاتے تھے۔ جب عیسائیت کا

زور یورپ میں بڑھنے لگا تو پادریوں نے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس ان گویّوں کی شدید مخالفت کی۔ کیونکہ اُن کے بقول یہ لوگ عوام کو مذہب سے بیزار کرتے تھے۔ اکثر ایسے ہوتا تھا کہ جب کسی جگہ پر یہ اداکار اپنا تماشہ دکھاتے تو وہاں گرجاؤں کی رونق کم ہو جاتی۔

پادریوں کو ان گویّوں کے زبردست آلۂ مقبولیت کا پورا احساس تھا اس لیے انھوں نے بھی اس سے استفادہ کیا اور ان کی طرح وہ بھی مذہبی خیالات کی اشاعت کے لیے لوگوں کو تماشے دکھانے لگے۔ چونکہ عیسائی مذہب کی ساری مناجاتیں اور دُعائیں لاطینی زبان میں تھیں اس لیے عوام مذہب کی رُوح سے ناآشنا تھے۔ اس طرح پادریوں کو دیسی زبان میں ڈرامہ کے ذریعے مذہب کی ترویج و اشاعت کے بہترین موقعے ہاتھ آئے۔ ازمنہ وسطیٰ میں ڈرامہ کا گہوارہ گرجا رہا اور پادریوں نے غیر شعوری طور پر اس فن کو بڑی تقویت پہنچائی۔ پادریوں نے جس مخصوص ڈرامے کو جنم دیا اس میں مکالمات کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ابتدائی دَور میں اسٹیج پر مذہبی رہنماؤں اور کورس کے درمیان مذہبی موضوعات پر جو مکالمے ہوتے تھے انھیں سے باقاعدہ ڈرامے معرضِ وجود میں آئے۔

"آدم" Adam عبوری دَور کے ڈراموں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں فرانسیسی اور انگریزی مذہبی ڈرامہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ یہ ڈرامہ تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ ——— آدم و حوا کا زوال، ہابیل کا قتل اور پیغمبروں کا جلوس جس نے شاہِ اعظم حضرت مسیح کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔

ابتدائی دَور کے ڈراموں کو Mystery Plays اور Miracle Plays کہتے ہیں۔ اوّل الذکر توریت و انجیل کے قصّوں پر مشتمل ہوتے ہیں موخر الذکر میں سنتوں اور شہیدوں کی زندگی کا ذکر ہوتا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں یہ مذہبی ڈرامے عیسائی عبادت Service کا لازمی جزو تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ مستقل فن پارے ہو گئے۔ ان ترقی یافتہ ڈراموں میں اہلِ کلیسا کا پورا گروہ کام کرتا تھا۔ تین بادشاہ شمال، مشرق اور جنوب سے چل کر قربان گاہ پر ملتے تھے اور اپنے اعمال کے گیت گاتے ہوئے مناجاتوں پر ختم کرتے تھے۔

تیرھویں صدی کے آخری حصّہ میں ڈرامہ نے غیر مذہبی Secular حیثیت

اختیار کرنا شروع کی اور اسے گرجا کے محدود دائرہ سے نکال کر بازاروں اور میلوں میں پیش کیا گیا۔ اب ڈرامائی تماشوں کے لیے انجمنیں Guilds کام کرنے لگیں اور مذہبی تیوہاروں کے موقع پر انھیں بڑے اہتمام سے پیش کیا جاتا۔ اگر ہم اس زمانہ کے ادبی ریکارڈ کا مطالعہ کریں تو ڈرامہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈراموں کے چار مشہور مجموعے ——— "چیسٹر" Chester "کوینٹری" Coventry "ٹاؤنلے" Townley اور "یارک" York بہت اہم ہیں۔

آخری مجموعہ میں سارے ڈرامے موجود ہیں۔ یہ در حقیقت ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے واقعات پر مشتمل ڈراموں کا ایک سلسلہ ہے۔ ان ناٹکوں میں ڈرامائی فنکاری کے ساتھ مذہبی جذبہ اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اور اسماعیل کی قربانی کا واقعہ انتہائی دردمندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اگر ہم چودھویں صدی تک کے ڈراموں کی فنی خوبیوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسے تفریحی اور افادی دونوں حیثیتیں حاصل تھیں۔ اخلاقی نصائح بغیر مزاحیہ عناصر کے خشک و بے کیف رہ جاتے۔ اس لیے ڈرامہ نگاروں کی کوشش ہوتی کہ دونوں عناصر کو شامل کریں۔ "ٹاؤنلے" کے مجموعہ میں دو ڈرامے اس رجحان کی وضاحت کرتے ہیں۔ "نوح" Noah نامی ڈرامہ میں حضرت نوح اور ان کی بیوی کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جب سیلاب کی تباہ کاریاں بڑھنے لگیں تو حضرت نوح نے اپنی اہلیہ کو کشتی پر سوار ہونے کو کہا لیکن وہ بدمزاجی اور تنک خوئی کے باعث سیلاب کے باوجود کشتی کے انتظام سے مطمئن نہیں تھیں اور ایک گوشہ میں سوت کاتنے لگیں۔ حضرت نوح جب بہت پریشان ہوئے تو انھوں نے کشتی چلانے کا حکم دیا۔ اس پر خوف زدہ ہو کر وہ دوڑ کر کشتی میں سوار ہوئیں لیکن ان کی برہمی اس وقت تک دور نہ ہوئی جب تک ان کی خاصی مرمت نہیں ہو گئی۔ اس سلوک کے بعد بھی وہ نوح کی رفاقت کا دم بھرتی رہیں۔ اسی طرح Secunda Pastorum نامی ڈرامہ میں ایک چور گڈریے اور اس کی بیوی کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ابتدائی ڈرامہ کی تاریخ میں "اخلاقی ڈرامے" Morality Plays اور "وقفیے" Interludes آخری کڑی ہیں۔ اخلاقی ڈراموں میں تمثیل و کنایہ کے پیرایہ میں مذہبی مسائل

پیش کیے جاتے تھے اور "تماشہ" کی جگہ سنجیدہ موضوعات اور مکالموں پر زیادہ توجہ کی جاتی۔ ان کے لکھنے والے انسانی خوبیوں اور خرابیوں کا تجزیہ کرنے میں نفسیاتی طریقۂ عمل اختیار کرتے تھے کیونکہ ان کے سارے کردار Character. گناہ، برکت، کفارہ وغیرہ خاص ذہنیت اور رجحان کے علامات ہوتے تھے۔ ان ڈراموں میں خیر و شر کے مسائل اور روح کی کشمکش کو بالخصوص موضوع بنایا جاتا۔

"وقفیہ" ڈرامے نشاۃ الثانیہ میں مروجہ طربیہ ڈراموں کی خام صورتیں تھیں۔ جن میں ادنیٰ اور پست موضوعات سے مزاحیہ کرداروں کو عوام کی تفریح کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ ان ڈراموں میں اخلاقی سنجیدگی یا مذہبی مباحث کی گنجائش قطعاً نہیں ہوتی لیکن ان کے ذریعہ ہم انگریزی ذہن اور مزاج کا مطالعہ ضرور کر سکتے ہیں جو مذہبی قیود سے بے نیاز ہوکر عوامی ادب کی طرف مائل تھا۔

باب دوئم

"نشاۃ الثانیہ" (Renaissance) سنہ ۱۵۳۰ء سے سنہ ۱۶۶۰ء تک

ازمنہ وسطیٰ کی مذہبیت کے بعد یورپ کی تاریخ میں ایک ایسا دور آتا ہے جب آزاد دنیوی Secular زندگی کو خاص اہمیت دی جانے لگی اور لوگ خانقاہوں کو چھوڑ کر حسن اور دوسری فطری اور انسانی مسرتوں کے حصول کی طرف مائل ہوئے۔ زندگی کے اس میلان کو روم اور اٹلی کے قدیم آثار و نوادر سے بڑی مدد ملی۔ اہل یورپ ادب، مصوری، سنگ تراشی، موسیقی اور دوسرے فنون میں اٹلی کی نقل کرنے لگے۔ کیونکہ یہی ملک نشاۃ الثانیہ کی تحریک کا گہوارہ تھا۔ روم میں اس زبردست سیاسی اور سماجی انقلاب کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے وہاں جذبۂ وطنیت کا سب سے بڑا حصہ تھا کیونکہ اطالیوں کا خیال تھا کہ روما کی گذشتہ شان و عظمت دوبارہ واپس لائی جاسکتی ہے۔ اس لیے لاطینی زبان کا احیاء اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی کو ازحد ضروری سمجھا گیا۔

درحقیقت اٹلی میں متحدہ قومیت کا خیال غلط فہمی پر مبنی تھا کیونکہ سارا جزیرہ نما چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور باشندے اطالیہ کے بجائے روم، نیپلز Naples، وینس اور دیگر ریاستوں کے شہری تھے۔ ہر ریاست ایک جداگانہ دربار اور ایک الگ درباری روایت کی مرکز بنی ہوئی تھی جہاں شہنشاہ آگسٹس Augustus کے نمونہ پر شاعروں، مفکروں، فنکاروں

اور منبعوں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔ ان درباروں میں جہاں علوم و فنون کو ترقی ہوئی وہاں اخلاقی بے راہ روی بھی ناقابل بیان حد تک بڑھ گئی۔ بورژیا الیگزینڈر اور اس کا جانشین سیزر عیاشی میں اپنے تمام پیشروؤں پر سبقت لے گئے۔

نشاۃ الثانیہ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں جو بیداریاں شروع ہوئیں۔ ان میں جمالیاتی بیداری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ارسطو نے ازمنہ وسطی کے پادریوں اور سنتوں کو اپنی منطق اور اپنے نظام فکر کا غلام بنا رکھا تھا مگر نشاۃ الثانیہ میں افلاطون کو اس کا صحیح مقام حاصل ہوا۔ فلورنس Florence میں قائم شدہ اکاڈمی میں حسن کے نئے تصورات پیش کیے گئے اور افلاطونی مثالیت کے زیر تحت حسی حسن کو ذہنی حسن اور تخیلی حسن کا ضروری جزو قرار دیا گیا۔ اس طرح افلاطونی مثالیت اور دینوی عملیت کی دو دھاراؤں کے امتزاج سے نشاۃ الثانیہ کی بنیاد پڑی جس کے زیر اثر جہاں ایک طرف مذہب، حیات بعد الممات اور جنت و جہنم کے جھگڑوں سے انسانی ذہن نے اپنے کو آزاد کیا تو دوسری طرف علم و فن اور تفریحی مشاغل کو بڑی تقویت ملی۔ نشاۃ الثانیہ کا سب سے زیادہ اثر یورپین ادب کے افق پر انسان دوست ادیبوں Humanists کے ظہور سے محسوس ہوا۔ ان ادیبوں نے مذہبی سے زیادہ انسانی اقدار کو سراہا، آزاد قومی وطنیت کی آواز بلند کی اور آسمان کے بجائے دھرتی کے گیت گائے۔ اس دور میں نہ صرف یہ کہ کلاسیکی نمونوں پر اہم ادبی تصانیف وجود میں آئیں۔ بلکہ شاعری، ڈرامہ اور افسانہ (رومان نگاری) کو نئے راستہ پر نکالا گیا اور اس کے لیے نئے اسالیب و صور پیدا کیے گئے۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ Constantinople سے مسلمان حملہ آوروں کے خوف سے بھاگنے والے کلاسیکی علماء نے یورپ کی تاریکی میں اپنے علم و فن کے نئے چراغ جلائے جہاں سے انسانی تاریخ کے نئے باب شروع ہوتے ہیں۔ مگر اٹلی میں اس کا اثر حسی لذت پرستی کی شکل میں رونما ہوا تو جرمنی میں ذہنی انقلابات کے ساتھ سامنے آیا۔ مگر انگلستان میں اس تحریک کو خاص ماحول نصیب ہوا کیونکہ وہاں نشاۃ الثانیہ کے ساتھ مذہبی اصلاح Reformation کا بھی زمانہ شروع ہو چکا تھا۔

انگریزی نشاۃ الثانیہ کے حصہ میں وہ تمام انقلابات آئے جن سے یورپ میں ایک نئے

دَور کا آغاز ہو چکا تھا ۔ اس تحریک سے لوگوں کے ذہن و خیال کو آزادی اور وسعت ملی اور علم و حکمت کے نئے تجربوں کی بنا پر قدیم خیالات فرسودہ قرار دیے گئے ۔ اس کے ساتھ ہی ہیئت دانوں اور بحری سیاحوں کی دریافتیں بھی اپنا اثر دکھاتی رہیں ۔ ان خصوصیات کے باوجود انگریزی نشاۃ الثانیہ یورپ کی تحریک سے چند باتوں میں ممتاز ہے ۔ اوّل یہ کہ وہاں انسان دوست ادب، اٹلی اور فرانس کی طرح جلد وجود میں نہ آ سکا ۔ انگریزی زبان ابھی اس لائق نہیں ہو سکی تھی کہ اس سے "افادی ادب" کا کام لیا جاتا ۔ یہی وجہ ہے کہ بیکن اور طامس مور نے اپنی بیشتر تصانیف لاطینی زبان میں یادگار چھوڑیں ۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انگلستان میں فرانس اور اٹلی کی طرح مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کی کوئی روایت نہیں تھی اور پھر کٹر قدامت پرست مذہبی قائدوں Puritans نے بھی جمالیاتی تصورات کو فروغ پانے کا موقع نہیں دیا ۔ ان اسباب کی بنا پر انگریزی ادب فرانس اور اٹلی کے برخلاف دورِ گزشتہ کی ہی یادگار رہا جس میں ترجموں اور تالیفوں کا بڑا حصہ تھا ۔ لیکن قومیت اور وطنیت کے نئے تصورات سے انگلستان میں بھی دوسرے ممالک کے ساتھ مقابلہ کا جذبہ پیدا ہوا اور اس طرح وہاں بھی اٹلی اور فرانس پر سبقت لیجانے کی باقاعدہ کوشش ہونے لگی ۔

انگریزی نشاۃ الثانیہ میں انسان دوستوں Humanists اور معلموں Educationists کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ انگریز طلباء یونانی زبان اور ادب سیکھنے کے لیے جب اٹلی گئے تو انھیں متعدد نادر نسخے Manuscripts ہاتھ آئے جن سے نئے علوم کی اشاعت میں بڑی مدد ملی ۔ طامس مور کی "یوطوبیہ" utopia انگریزی نشاۃ الثانیہ کا حرفِ اوّل ہے ۔ یہاں قدامت اور رجعت کے برخلاف تجاویز اور اصلاح کی تلقین ہے ۔ اس شاہکار کا نمونہ افلاطون کی ریاست Republic ہے ۔ جس میں ایک اعلیٰ اور مثالی ریاست کے خواب دیکھے گئے ہیں ۔ طامس مور نے اپنی کتاب میں قدامت کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور قدیم علماء کا تمسخر بھی کیا ہے ۔ اس کے نزدیک یونانی ادب اور فلسفہ لاطینی ادب اور فلسفہ سے بدرجہا بہتر ہے اور افلاطون تمام یونانی اور لاطینی

فلاسفہ کا قائد ہے۔

طامس مورنے "یوٹوپیہ" میں غازیانہ اور سپاہیانہ نظام زندگی کی سخت مذمت کی ہے اس لیے کہ اس کے نزدیک عسکری فتوحات اور شاہانہ امارت انسانی ترقی اور تہذیب کے لیے سخت مضر ہیں۔ وہ سماج میں اپنے طرز کی اشتراکی حکومت قائم کر کے محدود سے چند لوگوں کے ہاتھ سے دولت چھین لینا چاہتا ہے۔ تمام دوسرے مثالی دنیا کی تبلیغ کرنے والوں کی طرح وہ بھی انسانی فطرت اور انسان کی بنیادی نیکیوں میں عقیدہ رکھتا ہے اور سماج کی تمام خرابیوں کو مصنوعی اداروں کی پیداوار سمجھتا ہے۔ سر طامس مور رہبانیت کا بھی قائل نہیں کیونکہ اس سے خدا کی تخلیق کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

معلمین میں سر طامس ایلیٹ، وِلسن Wilson اور آسشم Ascham وغیرہ نے اپنی تصانیف سے نشاۃ الثانیہ کی ادبی اور سماجی زندگی میں بڑا حصہ لیا اس دور میں مذہبی اختلافات کی بنا پر نزاعی اور مناظراتی ادب کا عظیم ذخیرہ جمع ہو گیا تھا لیکن مذہبی اصطلاح کے سلسلہ میں ۱۵۳۰ء میں انجیل کا ترجمہ عوام تک نئے مذہب کو پھیلانے میں بہت کارآمد ثابت ہوا۔

انگریزی نشاۃ الثانیہ کو ادبی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:-

۱۔ ابتدائی دور ۱۵۰۳ء سے ۱۵۷۷ء تک

۲۔ وسطی دور ۱۵۷۸ء سے ۱۶۲۵ء تک

۳۔ آخری دور ۱۶۲۶ء سے ۱۶۶۰ء تک

آیندہ صفحات میں ہم ان ادوار کے تاریخی تسلسل کے ساتھ نشاۃ الثانیہ کی شاعری، نثر اور ڈرامہ پر تبصرہ کریں گے۔

شاعری نشاۃ الثانیہ شاعری کے نقطۂ نگاہ سے انگریزی ادب کا سب سے مشہور اور اہم دور خیال کیا جاتا ہے۔ غنائی اور ڈرامائی شاعری اس دور میں جن بلندیوں کو پہنچ گئی اس کا اثر آج تک محسوس کیا جاتا ہے۔ اگرچہ انگلستان میں مصلحین نے شاعری کی طرف کم توجہ کی لیکن انسان دوست ادیبوں کی کوشش سے اطالوی نشاۃ الثانیہ کے زیر اثر وہاں بھی

شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ سر ٹامس وائٹ" Sir Thomas Wyatt (سنہ ۱۵۰۳ء سے سنہ ۱۵۴۲ء) نے فرانس اور اٹلی کا دورہ کیا۔ اور سنہ ۱۵۲۶ء سے ہی اطالوی نشاۃ ثانیہ کی شاعری کے نمونہ پر انگریزی شاعری کو موڑنا چاہا۔ اس نے اٹلی سے شاعری کے مختلف اوزان و بحور اخذ کیے جن سے اس کے ہمعصر ناواقف تھے۔ اطالوی اصناف شاعری میں سب سے زیادہ دیرپا اثر "سانیٹ" Sonnet کا رہا۔ جس کے ذریعہ دورِ الزبتھ کی شاعری ممتاز رہی۔ وائٹ نے اپنے سانیٹ اطالوی شاعر پٹرارک Petrarch کے نمونے پر لکھے۔ ان میں جوش اور خلوص کے بجائے روایتی محبوب سے عشق کا ہی جذبہ کارفرما ہے۔ سرّے Surrey نے (سنہ ۱۵۱۷ء تا سنہ ۱۵۴۷ء) کے یہاں اگرچہ وائٹ کا زور و اثر نہیں لیکن وہ اس سے بڑا فنکار ہے اس کی شخصیت میں ایک اعلیٰ انسان اور شاعر کے اوصاف نمایاں ہیں۔ سرّے نے بھی روایتی محبت کے راگ گائے اور اپنی محبوبہ "جیرلڈائن" Gerandine کے تصور کے لیے اپنی شاعری وقف کر دی۔ سرّے کا سب سے بڑا کارنامہ سانیٹ کی ہیئت میں تبدیلی ہے اس نے اس صنعت کو اطالوی اثرات سے آزاد کیا اور انگریزی مزاج کے موافق بنانے کی کوشش کی۔ شیکسپیئر نے اپنے "سانیٹ" میں سرّے کی ہی تقلید کی ہے۔ شعر معری Blank Verse میں بھی اس کا نام ہمیشہ تسلیم کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے ڈرامہ اور رزمیہ کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔

سولھویں صدی کے نصفِ اوّل میں ترجموں کا بڑا زور تھا۔ فلومن ہالینڈ Philomen Holland اس دور کا سب سے بڑا مترجم ہے جس نے انگلستان کو لِوی Livy پلائنی Pliny اور پلوٹارک Plutarch جیسے مصنفوں سے روشناس کیا۔ لیکن شاعری کی حد تک سب سے زیادہ مقبولیت چیپمین Chapman کو ہوئی۔ جس نے ہومر کی مشہور رزمیہ "ایلیڈ" Iliad کا منظوم ترجمہ پیش کیا۔ اسے دورِ الزبتھ کے ادبی شاہکاروں میں تسلیم کیا گیا ہے۔

نشاۃ الثانیہ کی شاعری کے ابتدائی دور کے سلسلہ میں ان پیشروؤں کے کارناموں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جن کی کوششوں سے ادبی دنیا میں ایک نئی تخلیقی لہر دوڑ گئی اور حسن سے ملبوس کے

بیشتر شعرا متاثر ہوئے۔ لِلی، سڈنی اور سپنسر تینوں اپنے اپنے فن کے مرد میدان ہیں اور تینوں کو ایک حد تک ادبی قیادت کا شرف حاصل ہے۔

۱۔ جان لِلی John Lyly (۱۵۵۴ء تا ۱۶۰۶ء)

لِلی کی شہرت اس کی مایۂ ناز تصنیف Euphues یا The Anatomy of wit کے باعث ہے جو ۱۵۷۸ء میں لکھی گئی۔ یہ اگرچہ نثری کارنامہ ہے لیکن اس کی اہمیت مرصّع طرز نگارش اور ترسیمی انداز بیان کی بنا پر شاعری میں بھی محسوس کی گئی۔

۲۔ سر فلپ سڈنی Sir Philip Sidney ۱۵۵۴ء تا ۱۵۸۰ء

سر فلپ سڈنی اپنے زمانے میں ایک کامیاب ادیب سے زیادہ کئی اعتبار سے ایک ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ جس میں نشاۃ الثانیہ کے بہترین عناصر یکجا تھے۔ اس کے یہاں غازیانہ شان و شوکت کے ساتھ انسان دوستی کی نئی خصوصیات بھی موجود تھیں جن کی بنا پر اس کے ادبی کارناموں کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔

شاعری کے میدان میں سڈنی کی اہمیت اس کے شعری کارناموں سے زیادہ شاعری کی حمایت کی بنا پر ہے۔ مذہبی اعتبار سے جب انگلستان پاپائیت کے قیود سے آزاد ہو گیا تو ذہن اور مزاج کو بھی یک گونہ فراغت نصیب ہوئی۔ اسی کے ساتھ وطنیت اور قومیت کے جذبہ نے انگریز شاعروں کو یورپ کی شاعری سے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ لیکن کٹر قسم کے مذہبیوں Puritans کی تحریک سے شاعری کو سخت نقصان ہو رہا تھا۔ فلپ سڈنی کی مشہور تصنیف An Apologie for Poesie اسی زمانہ کی پیداوار ہے جس میں اس نے شاعری کی وکالت کی ہے۔ سڈنی کا خیال ہے کہ شاعری نے جو بات کی تاریکی میں روشنی کا کام کیا اور اس کے دودھ سے اعلیٰ علوم کی پرورش ممکن ہو سکی۔ ہومر Homer اور ہیسیڈ Hesiod تاریخ یونان میں سنگ میل کی حیثیت صرف اس وجہ سے رکھتے ہیں کہ ان سے پہلے کوئی سائنس ترقی نہیں پا سکی تھی اور انھوں نے اپنے کارنامے سے آیندہ نسلوں کے لیے راہ ہموار کی۔ اپنے مقالہ میں سڈنی نے شاعروں کی قدر و منزلت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ قدیم زمانہ سے ہی شاعر ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ رومیوں نے

شاعروں کو صاحبِ بصیرت Vates دُور اندیش اور نبی سمجھا، یونانیوں نے انھیں "خالق" کے خطاب سے نوازا۔ اس لیے کہ جس کائنات کی تخلیق شاعروں نے کی ہے وہاں فطرت بھی مجبور ہے۔ جن حسینوں، جانبازوں، بہادروں اور وطن پرستوں کو شاعروں نے جنم دیا ہے ان کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ شاعر فطرت کے بہترین نمونوں پر اپنے نمونوں کا اضافہ کرتا ہے۔

بقول سڈنی کے شاعری محض وزن و قافیہ کا نام نہیں بلکہ ایک انداز ہے، ایک آہنگ ہے جو نثر میں بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ خیالات کے نظم کر دینے سے ہی شاعری کا حق نہیں ادا ہو جاتا۔ اس میں شعری کیفیت لازمی شرط ہے جو الفاظ کے موزوں استعمال سے ہی ممکن ہے شاعروں کو مورخوں اور حکیموں پر ترجیح حاصل ہے کیونکہ مورخ مثال کا دلدادہ ہے اور فلسفی اصول کا بندہ۔ فلسفی اصولوں کا سہارا لے کر اسرار و رموز کے سمندر میں ایسے غوطے لگاتا ہے کہ عوام اس کے نزدیک آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ دوسری طرف مورخ خاص حالات کا جائزہ واقعات کی روشنی میں لیتا ہے اور مثالوں میں ایسا الجھتا ہے کہ اس کی حیثیت محض اطلاع دینے والے کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فلسفہ اور تاریخ میں آہنگ شاعر ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے فن میں حقیقت اور تخیل کے امتزاج سے تصویر کے دونوں رُخ دکھا سکتے ہیں۔ حقیقت اور مجاز موجود اور ممکن، ان سب سے وہ اپنے فن کا تانا بانا فراہم کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ تمام علوم کے مقابلے میں عوام سے نزدیک ہیں۔ سڈنی کی تحریک سے شاعری کی عظمت عوام کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ یہاں تک کہ دل و دماغ تو کیا لوگوں کے اعصاب پر بھی شاعری سوار ہو گئی۔ اس دُور کی مقبول ترین صنف ڈرامہ میں بھی شاعری کا عنصر سب سے زیادہ ہے۔

سڈنی کے شعری کارناموں میں Astrophel & Stella کو اس دور کی شاعری میں خاص مقام حاصل ہے۔ سڈنی کو اپنی بے پناہ قوتِ تخیل کے لیے کسی خاص صنف کی پابندی لازمی تھی اور پھر اس کے رومانی اسلوب کو حقیقی رنگ دینے کے لیے اس جذبہ اور خلوص کی ضرورت تھی جو اسے اس کی محبوبہ Penelope Deharoux کے فراق پر ہی میسر آ سکا۔ اس کے بچپن کی معشوقہ جب دوسرے کے گھر کی زینت ہو گئی تو سڈنی کو اپنی محبت اور تلخیوں کا احساس ہوا۔ ان جذبات کو نظم کرنے کے لیے اس نے "سانیٹ" کی صنف اختیار کی جس میں اس کے

یاس اور حرماں، محبت اور فرض اور خواہش اور عقل کے متضاد احساسات نے مل جل کر خاص رنگ دیا ہے۔ محبوبہ Stella یعنی ستارہ ہے اور وہ Astrophel ستارہ کا عاشق —— "چاند اور چکور" !!

اگرچہ "سانیٹ" اور "محبت" دورِ الیزبتھ کے ادب کا جزوِ لاینفک بن چکے تھے۔ لیکن سڈنی کے یہاں محض روایت پرستی نہیں۔ اس کے یہاں خلوص کے ساتھ سوز و گداز بھی ہے۔ وہ اپنے دل کا راز ظاہر کرنے کے لیے بے چین ہے۔ اسی لئے اس کے راگ ابھی سر دل کے حامل ہیں۔ اس کی نظموں میں کہیں کہیں تکلف اور حشو و زوائد بھی ہیں لیکن ان سے اس کی شخصیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

۳ - ایڈمنڈ اسپنسر Edmund Spenser ۱۵۵۲ء تا ۱۵۹۹ء

کسی شاعر کا فن اس کے ذہن و کردار کا آئینہ ہونے کے علاوہ اس کے تاریخی پس منظر اور روحِ عصر کی بھی غمازی کرتا ہے۔ اسپنسر کی شاعری اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ ایک بلند خیال فنکار تھا اور انگلستان کو ادبی سطح پر یورپ کے دوسرے ممالک کے برابر لانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی ادبی وراثت برائے نام تھی۔ چاسر کی شاعری میں اب کوئی جدت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی زبان بھی متروک ہو چلی تھی۔ عہدِ الیزبتھ کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کے پیش نظر فن اور ادب کے نظریے بھی بدل رہے تھے جن پر اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کو پورا اترنا تھا۔

اسپنسر نے اپنا شعری مواد یورپ سے حاصل کیا۔ باوجود اس کے کہ اٹلی اور انگلستان مذہبی طور پر قطعِ تعلق کر چکے تھے، ادبی اعتبار سے قدیم رشتوں میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا۔ نشاۃ الثانیہ نے جس انسان دوست ادب کو جنم دیا تھا۔ اس کا اثر اسپنسر پر سب سے زیادہ پڑا۔ اس نے یورپی نظریات و تصورات کو ملکی شاعری کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی شاعری میں مقصدیت اور افادیت کو کما حقہٗ دخل ہے اور شاید کسی بھی نئے مدرسۂ ادب کا بانی اس سے بے نیازی نہیں برت سکتا۔

۱۵۷۶ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری لے کر اسپنسر لنکا شائر میں مقیم ہو گیا۔ وہاں اس کے حالات زندگی کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ اسے کسی عورت سے عشق ہو گیا تھا۔

جس کو اس نے Shepherd's Calender میں "روزلنڈ" Rosalind کے نام
سے موسوم کیا ہے۔ "دورِ ایلزبتھ کی عشقیہ شاعری کے متعلق وثوق سے کہنا کہ وہ خلوص دواقعات
پر مبنی ہے یا محض روایت پرستی کی پیداوار ہے، مشکل ہے"۔ اسپنسر کی شاعری کے بارے میں
بھی اختلافِ رائے کی بڑی گنجائش ہے۔ نقادوں کا ایک گروہ اس امر سے متفق ہے کہ اسپنسر نے
روایتی طور پر حسن و عشق کے راگ گائے اور عشقیہ شاعری پر اپنی شخصیت کے نقوش چھوڑے
لیکن زیادہ قرینِ قیاس یہ نظریہ ہے کہ اسے واقعی عشق سے سابقہ پڑا اور دانتے Dante
کی "بیٹرس" Beatrice کی طرح اس کی روزلینڈ بھی اس کی شاعرانہ زندگی کی محرک رہی۔
The Shepherd's Calender ۱۵۷۹ء کو چاہے ہم درپردہ سیرت کہیں
یا تاریخی میلانات کا اظہار سمجھیں، اس کی ادبیت سے کسی کو انکار نہیں۔ توسیعِ تعلیم نشاۃ الثانیہ
کے کلچر اور قومی جذبات کی بیداری نے ملک میں ادب نواز طبقہ کو جنم دے دیا تھا۔ اسپنسر نے
ملک کی ادبی فضا کا بالکل صحیح جائزہ لیا اور انگریزی شاعری میں بہترین کلاسیکی ادب کو منتقل
کرنے کا۔ "اس بارہ ماسہ" میں اس نے Theocritus اور Virgil جیسے کلاسیکی
شاعروں سے استفادہ کیا لیکن اس کا قومی ولولہ ہمیشہ نمایاں رہا۔ قدیم یونانی اور اطالوی شاعری
کا بیشتر حصہ مرغزاری Pastoral تھا۔ انگلستان میں اسپنسر سے پہلے کسی شاعر نے اس
طرف توجہ نہیں کی تھی۔ چنانچہ جب اس کے جادو نگار قلم سے یہ گیت نکلے تو سارے ملک میں
ایک نئے شاعر کی آمد کی دھوم مچ گئی۔ ان گیتوں میں اسپنسر نے نہ صرف اپنے ذاتی جذبات و
تاثرات اور مذہبی و سیاسی خیالات و نظریات کو نظم کیا بلکہ انھیں سال کے ہر مہینہ سے
منسوب کر کے "بارہ ماسہ" کا رنگ دیا۔

لاطینی شاعر ورجل Virgil کی طرح اسپنسر بھی مرغزاری شاعری کے بعد دوسرے
صنفِ شاعری کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۵۸۰ء میں اس نے چند مذہبی نظمیں Hymns لکھیں
جس میں اس نے اپنے حسن اور محبت کے فلسفہ کا اظہار کیا ہے۔ یہاں شاعر کی عیسائیت اور
عناصر پرستی Paganism میں تفریق مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی زمانہ میں اسپنسر نے
درباری زندگی سے متنفر ہو کر "مدبر دکھتا" Mother Hubbard's tale بھی لکھی۔

اس نظم میں اس نے بن مانس اور لومڑی کے تمثیلی پیرایہ میں اپنے زمانہ کے زوال پذیر سماج کا خاکہ کھینچا ہے۔ یہ طنزیہ رنگ ۱۵۹۱ء کی نظم Colin Clout Come House میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جس میں شاعر نے اپنے لندن کے سفر، درباری زندگی اور عام تاثرات کو پیش کیا ہے۔ اسپنسر کی عشقیہ نظموں میں AmorEtti اور Epithala Mion کا خاص مرتبہ ہے۔ اس لیے کہ ان میں اس نے اپنی محبوبہ ایلزبتھ بوئل کا روحانی خاکہ کھینچا ہے۔

The Faerie queene اسپنسر کا شاہکار ہے جس میں اس کے ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات اور نجی زندگی کے تاثرات کا بخوبی اظہار ہوا ہے۔ اس نظم کی تخلیق آئرلینڈ کے بیابان ملک میں ہوئی جہاں شاعر نے مثالی طور پر اپنے مقاصد کی تکمیل کے خواب دیکھے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی تلخیوں سے گریز اختیار کر کے تخیل کی دنیا میں سکونِ قلب تلاش کر رہا ہے لیکن یہ فراریت شاید اسپنسر کی شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کو زندگی کے ہر شعبہ سے دلچسپی تھی۔ وہ محض خیالی شاعر ہی نہیں تھا بلکہ افلاطونی فلسفہ کا عالم، قدیم علوم کا محقق، وطن پرست اور اعلیٰ پایہ کا صحافی بھی تھا "فیئری کوین" میں اس کی ہمہ جہتی ذہنی اور ادبی صلاحیتوں کا مکمل اظہار ہوا ہے۔ افلاطون کے زمانہ سے ہی شاعری کو "الہامی" قرار دیا گیا ہے اور اطالوی نقاد ہوریس Horace نے افادیت اور موسیقیت کو شاعری کا جزوِ لاینفک بتایا۔ نشاۃ الثانیہ کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس مقصدیت کو برقرار رکھا۔ چونکہ اسپنسر کا بنیادی مقصد بھی اپنے شاہکار کے ذریعہ انگلستان کی "اخلاقی سطح" کو بلند کرنا تھا اس لیے اس نے قدماء کی تقلید میں رزمیہ اندازِ بیان اختیار کیا اور تمثیلی رنگ میں قدیم دیومالاؤں اور غازیانہ نظامِ زندگی کی جھلکیاں پیش کیں۔

Faerie Queene میں اسپنسر نے اپنے فوق البشر کا تصور شاہزادہ آرتھر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ شاہزادہ پرستان کی شہزادی گلوریانہ Gloriana کا عاشق زار ہے۔ اس لیے اس کی تلاش میں اسے کئی ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ شاہزادے کی انہیں مہمات کی بدولت شاعر اپنی رزمیہ نظم کا خاکہ بناتا ہے۔ سالانہ جشن کے موقع پر شاہزادی

گلوریانہ بارہ دن تک لگاتار مصیبت زدوں کی مدد کے لیے غازیوں کو بھیجتی رہتی ہے۔ سائلوں کی عرضیاں بھی مختلف نوعیت کی ہیں اس لیے ان کی مدد کے لیے مختلف اوصاف کے غازی روانہ کیے جاتے ہیں۔ ان تمام غازیوں کے مقابلہ میں آرتھر جامع صفات کا Knight مالک ہے کیونکہ وہ دوسرے غازیوں کو بھی ان کی مصیبت میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح آرتھر کی صورت میں اسپنسر اپنے انسانِ کامل کا تصور پیش کرتا ہے۔

"فیری کوئین" کے سلسلہ میں جو خطوط اسپنسر نے والٹر ریلے Walter Raleigh کو لکھے تھے ان سے ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بنیادی طور پر اخلاقی اور تمثیلی تھا۔ اس شاہکار میں اخلاقی تمثیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ پاکیزگی، پرہیزگاری، دوستی، انصاف، رواداری اور استقلال وغیرہ اوصافِ حمیدہ کی مختلف غازیوں کے کرداروں سے تلقین کی گئی ہے۔ ہر غازی کسی نہ کسی خاص خوبی کا مالک ہے لیکن آرتھر کی شخصیت سب سے جامع ہے۔ اسپنسر کے نزدیک اخلاق اور مذہب الگ نہیں۔ چنانچہ اس نے مذہبی تمثیل کے طور انگلستانی کلیسا کو رومی کلیسا Roman Church اور عناصر پرستی کے خلاف دست و گریباں دکھایا ہے۔ شاعر محض دو مذاہب کا قائل ہے ——— عیسائی اور غیر عیسائی۔ جو علی الترتیب ثواب اور گناہ کے نمایندے ہیں۔ کچھ نقادوں نے اخلاقی اور مذہبی تمثیل کے ساتھ سیاسی تمثیل کا بھی پتہ لگایا ہے۔ اس سے انکار بھی نہیں کہ اسپنسر کی شاعری میں قومی تاریخ کے اوراق بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس کے یہاں انگریزی فوج، انگریز سیاح اور سیاست دان مختلف صورتوں میں غازیوں کے کارنامے انجام دے رہے ہیں جس سے دنیا کی فلاح ممکن ہے۔

"فیری کوئن" میں اسپنسر کا سب سے بڑا کمال اس کا رومانی انداز بیان اور اس کے رومانی زندگی کی عکاسی ہے جو فراغت اور فارغ البالی عشق و عاشقی کے لیے لازمی ہے وہ اس تخیلی دنیا میں دلفریب ہے۔ یہاں کے جنگلوں، پہاڑوں اور وادیوں میں عشق و رومان کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ دیوؤں، پریوں اور جنوں کی دنیا میں پہنچ کر ہم تھوڑی دیر کے لیے زندگی کی تمام کلفتوں کو بھول سے جاتے ہیں۔ اسپنسر نے ایک مصور کی طرح اپنے خاکوں میں بڑی خوبی اور حسن سے رنگ بھرے ہیں جس سے دورِ ایلزبیتھ کے جمالیاتی معیار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

چاسر کے بعد انگریزی شاعری میں اسپنسر کا مقام بہت بلند ہے۔ اسے بجا طور پر "شاعروں کا شاعر" کہا گیا ہے۔ اس کی شہرت اور عظمت کا اندازہ اس دور میں اس کی عوامی مقبولیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ شیکسپیئر اور بن جانسن جیسے فنکاروں نے اسے دادِ تحسین دی۔ نیش Nashe نے اس کو "انگلستان کا ورجل" کہا۔ مگر ڈیکر Dekkar نے اس کو چاسر کا "سپوت" گردانا اور شاعروں کے باغ میں اسے چاسر کے برابر جگہ دی۔

نشاۃ الثانیہ کے دوسرے دور کی شاعری اگرچہ ایک حد تک پیشروؤں کی شاعری کی تقلید معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہاں سے عام شعری میلانات میں تنوع پیدا ہونے لگتا ہے اور ہمیں مرغزاری اور عشقیہ شاعری کے ساتھ قومی شاعری، مابعد الطبیعاتی شاعری اور جدید کلاسیکی شاعری کے بھی نمونے ملتے ہیں۔

(ا) قومی شاعری :-

عشقیہ شاعری کے ساتھ دورِ الیزبتھ میں قومی شاعری کا خاص رواج تھا ــ ان شاعروں میں ڈینیل Daniel اور ڈرٹین Drayton کی اہمیت مسلّم ہے۔

(۱) سیمول ڈینیل (۱۵۶۲ء تا ۱۶۱۹ء) :- سولھویں صدی کے نصف آخر میں اسپنسر کے بعد ڈینیل کی بڑی شہرت ہوئی۔ وہ دورِ الیزبتھ کے تمام شاعروں میں کلاسیکی اعتدال کا نمایندہ تھا۔ لیکن ہم اس کے یہاں وہ خصوصیات کم پاتے ہیں جن کو مجموعی طور پر مبلوگی اور والہانہ فروش کہہ سکتے ہیں اور جن کے بغیر اچھی شاعری ناممکن ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ وہ معلّم اور مورّخ پہلے تھا اور شاعر (جذباتی شاعر) بعد میں۔ اس کا سب سے مشہور کارنامہ "خانہ جنگی" The Civil War ہے لیکن اس میں مختلف نظموں، قصیدوں، مرثیوں اور دیہاتی گیتوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ ڈینیل کی نظموں میں جو اعتدال اور سکون پایا جاتا ہے وہ آج بھی لوگوں کے لیے حیرت انگیز ہے Musophilus (۱۵۹۹ء) میں ڈینیل نے شاعری کی حمایت کے لیے مکالمہ کا انداز اختیار کیا ہے۔ یہاں سر فلپ سڈنی کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔

"وطنیت" ڈینیل کی شاعری کا سب سے اہم محرک ہے اور اس نے اپنی شاعری

میں اس کو خصوصیت کے ساتھ ملحوظ رکھا۔ تمام وطن پرستوں کی طرح ڈینیل کو بھی ایلزبتھ کے بعد انگلستان کا سیاسی مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ بالخصوص ان حالات میں جب کہ لنکاسٹر اور یارک کے شاہی گھرانوں میں خوفناک خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ ۱۵۹۵ء سے ۱۶۰۹ء تک خانہ جنگی کے جو مناظر سامنے آئے ان پر شاعر نے نوحہ کیا ہے۔ انگلستان کے سیاسی ابتری کے اسی موضوع پر شیکسپیئر نے بھی اپنے تاریخی ڈرامے لکھے لیکن ان میں جو جوش اور ہیجان ہے وہ ڈینیل کے یہاں نہیں ملتا۔ خود اس کا قول ہے کہ "میں حقیقت کو نظم کرتا ہوں، شعر نہیں کہتا۔"

اگرچہ دورِ ایلزبتھ کی تخیلی شاعری کے پیش نظر ڈینیل کو "نثر نگار شاعر" کہا گیا۔ لیکن زبان و بیان میں اس کی فصاحت کی قدر انیسویں صدی میں رومانی تحریک کے بعد ہوئی۔ ورڈسورتھ اور اور کولرج جیسے شاعروں نے نہ صرف اس کی سلاست بیانی کی تعریف کی بلکہ اس کے زبان و اسلوب سے اثرات بھی قبول کیے۔

(۲) مائیکل ڈرئیٹن (۱۵۶۳ء سے ۱۶۳۱ء)

ڈرئیٹن کی شاعری اگرچہ ڈینیل کے متوازی رہی۔ لیکن اس کا انداز اور لب و لہجہ اس کے مشہور ہمعصر سے مختلف تھا۔ ڈرئیٹن کے یہاں اعتدال اور آہنگ کے بجائے جوش اور جذبہ اور بلند خیالی پائی جاتی ہے۔

ڈرئیٹن کی پیدائش شیکسپیئر کے مردم خیز علاقہ واروک شائر میں ہوئی۔ شاعری سے اسے ابتدا سے ہی شغف تھا۔ بچپن میں ہی اس نے اپنے استاد کے قدموں میں پڑکر اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ اس کو شاعر بننا ہے۔ اُستاد نے اسے ورجل اور دوسرے کلاسیکی شعرا کو پڑھنے کی صلاح دی جس کا اثر غیر شعوری طور پر اس کے کلام پر پڑا۔

ابتدائی دور کے کلام میں ڈرئیٹن کے "سانیٹ" کا مجموعہ ۱۵۹۴ء میں Ideas Mirrour کے نام سے شائع ہوا۔ دو سال بعد اس کا The Baron's War بھی منظر عام پر آیا۔ ایلزبتھ کی موت کے بعد جب اسے جیمس اوّل سے کسی سرپرستی کی امید نہ رہی۔ ۱۶۰۵ء The Man In The Moon (۱۶۰۶ء) اور The Owl ... نظمیں ... کر وہ دربار سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی ساری ادبی کوششیں

Polyolbion کے لیے وقف رہیں۔ یہ کارنامہ اسپنسر کے زیر اثر مکمل ہوا۔ یہاں شاعر نے ہزاروں اشعار میں انگلستان کی تاریخ اور اس کے سماجی و معاشرتی زندگی کے بیشتر پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

(ب) مابعد الطبیعاتی شاعری:

مابعد الطبیعاتی شاعری حقیقی معنوں میں اطالوی شاعر دانتے Dante کی مشہور تصنیف طربیہ خداوندی" Divine Comedy کی طرح کائنات کے فلسفیانہ اور متصوفانہ تصور پر مبنی ہے۔ اس قسم کی فلسفیانہ شاعری کے لیے انگلستان کا ماحول سترھویں صدی میں سازگار ہو چکا تھا۔ یونانی فلسفہ بالخصوص افلاطون اور ایپکورس Epicurus کی تعلیم' مدرسین School Man کی مذہبیت' اور اسپنوزا Spinoza کے فلسفۂ خیر و شر کا اثر انگریز شاعروں کے ذہن اور کردار پر پڑا۔ اور انھوں نے اس روشنی میں نئے انداز سے انسان کی حقیقت' اس کے خوشی اور غم' خوف اور امید اور کائنات میں اس کے وجود اور اہمیت کے راگ گائے۔ مگر حکیمانہ شاعری کی ان بلندیوں تک انگریز شعرا نہیں پہنچ سکے۔ ڈن Donne سکلنگ Suckling والر Waller اور ڈینہم جیسے شاعر نہ تو اپنی شاعری کی بنیاد ایپکورس کے فلسفہ پر ہی رکھ سکے اور نہ وہ سنٹ طامس کے ہی مذہبی تصورات کو اپنا سکے۔ وہ ملٹن اور ورڈ سورتھ کی طرح مفکر شاعر نہیں تھے بلکہ ان کے اسلوب بیان کی وجہ سے اُن کے کلام میں ایک مفکرانہ انداز پیدا ہوگیا۔

یورپ کی تاریخ میں سترھویں صدی کو خالص حکمت اور سائنس کے نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس وقت دبستانی فلسفہ کے آخری اثرات ختم ہو رہے تھے اور ایک نئے اور جامع فلسفہ کی بنیاد پڑ رہی تھی اس سے شاعری میں اس "اتحاد شعور" Unif cation of Sensibility کا آغاز ہوا جس سے شعراء مختلف افکار و خیالات کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں کامیاب ہو سکے۔ پروفیسر کورتھوپ Courthope کا قول ہے۔ کہ مابعد الطبیعاتی شعراء خواہ مخواہ خیالات کے سمندر میں غوطے نہیں لگاتے پھرتے تھے بلکہ انھیں ایک خاص قسم کی ذہنی آزادی کا احساس تھا جس سے وہ دبستانی علوم سے سائنسی تجربہ کی دنیا

میں اور کلاسیکی دیو مالاؤں سے انجیل و توریت کی تاریخ میں عشق حقیقی سے عشق مجازی اور دہری فلسفۂ اخلاق سے عیسائی اخلاق اور عمل و فکر کی دنیا میں بآسانی سیر کر سکتے تھے۔ فنی نقطہ نگاہ سے مابعد الطبیعاتی شاعروں کا محرک وہ "علمیت" ہے جو انسان اور کائنات کے براہِ راست مطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ سائنس اور فلسفہ کی پیداوار ہے۔ اس قسم کی عالمانہ شاعری خطرہ سے خالی نہیں۔ عام شاعروں سے قطع نظر اس زمرہ میں ایسے شاعر بھی شامل ہیں جنھوں نے صحیح معنوں میں جذبات اور تشبیہات میں یگانگت حاصل کی۔ ڈن Donne کی بیشتر عشقیہ نظموں میں یہ خوبیاں نمایاں ہیں۔ اس نے اپنے زمانہ کے مروّج علوم مثلاً جغرافیہ، سائنس اور فلسفہ وغیرہ سے اپنے استعارے اور تشبیہیں لیں اور انھیں اس کامیابی کے ساتھ ایک دھاگے میں پرو دیا کہ ڈاکٹر جانسن جیسا کٹر نقاد بھی اس کے فنی کمال کا معتقد تھا۔

مابعد الطبیعاتی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شاعر پہلے کوئی خاص دعویٰ کرتا ہے جس کا بظاہر اس کے تخیل سے کوئی واسطہ نہیں معلوم ہوتا لیکن دوسرے یا تیسرے شعر میں گریز کے ذریعہ وہ تشبیہوں کا نظریوں سے رشتہ منسلک کر کے "اتحادِ شعور" کا ثبوت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈن اپنی "الوداعی نظم" Valediction میں عاشق اور معشوق کا مقابلہ قطب نما کے جوڑے سے کرتا ہے۔ بہ ظاہر یہ تشبیہہ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے مگر شاعر نے ثابت کیا ہے کہ چونکہ دونوں ایک ہی مرکز (عشق) کے گرد گھومتے ہیں اس لیے ان کے تعلقات ابدی ہیں۔ اسی طرح "مارول" Marvel نے اپنی محبوبہ کے نام جو نظم "To His Coy Mistress" لکھی ہے۔ اس میں اس نے خیال اور سایہ کے ہرے بھرے ماحول سے ہمیں وقت کے رتھ پر چڑھا کر "خلود" Eternity کے ریگستان کی سیر کرائی ہے۔ یہاں دو متضاد خیالات یعنی شادابی اور ریگستان کی بیابانی کا ذکر کر کے وہ اپنی محبوبہ کو محبت کے لیے آمادہ کر لیتا ہے۔ شاعر کے نزدیک جوانی محبت کے لیے ہے اور اگر اس نعمت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا تو عاشق اور معشوق دونوں کی زندگی ریگستان کی ویرانی میں بدل جائے گی۔

مابعد الطبیعاتی شاعری میں جذبات کا تجزیہ اور ہم آہنگی بیک وقت عمل میں آتی ہے اسی لیے یہاں جذباتیت کے ساتھ منطقیت کو بھی دخل ہے۔ ایسی شاعری صوفیانہ اور نفسیاتی

شاعری سے ممتاز ہے۔ اسے نہ تو ہم "تحت الشعور کا بہاؤ" ہی کہہ سکتے ہیں اور نہ محض تخیلات کا تجزیہ ہی بلکہ یہ بقول ہربرٹ ریڈ "فکر کی جذباتی تعبیر" ہے۔ *

جان ڈن John Donne (۱۵۷۳ء تا ۱۶۳۱ء)

ڈن کی زندگی نشاۃ الثانیہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگر وہ ایک طرف غازیانہ اوصاف کا حامل تھا تو دوسری طرف درباری زندگی سے بھی بخوبی واقف تھا کبھی اس نے اہم سیاسی خدمات انجام دیے تو اپنے مالک کی بھتیجی کے ساتھ فرار ہو کر ایک مخصوص حلقہ میں اپنا مقام بھی پیدا کر لیا۔ آخری دنوں میں وہ سینٹ پال کا پادری ہو گیا اور پھر تمام عمر شعر و شاعری اور مذہبی تلقین کے لیے وقف کر دی۔

ڈن نے عشقیہ اور مذہبی نظمیں لکھیں لیکن عشقیہ نظموں کی ہی بدولت اسے اصلی شہرت حاصل ہو سکی۔ وہ انگلستان میں مابعد الطبیعاتی شاعری کا بانی اور سب سے بڑا فنکار مانا جاتا ہے۔ علمی بصیرت اور وسیع تجربوں کی بنا پر اس کی شاعری میں تمثیل اور مشکل پسندی کے باوجود ایک لطیف کیفیت ملتی ہے۔ جب ڈن نے شاعری شروع کی تو جذباتیت کا پہلا طوفان گزر چکا تھا اور اب اس کا اظہار فن ڈرامہ میں ہو رہا تھا۔ جذبات کی فراوانی، تخیل کی پرواز اور احساس کی شدت اب بھی دور الیزبتھ کی شاعری کی امتیازی خصوصیت تھیں۔ مگر امتدادِ زمانہ سے یہ شاعری "بے لگام" ہو چلی تھی اور سترھویں صدی کے سائنسی دور میں اس کی مقبولیت

---

* مابعد الطبیعاتی شاعری ایک حد تک اردو غزل سے نزدیک ہے۔ کیونکہ اس صنف میں بھی جذباتی اور فکری انداز میں انسان اور کائنات کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالی گئی ہے تمثیل اور مناسبت لفظی دونوں میں قدرِ مشترک ہیں۔ اسلوبِ بیان میں انگریزی مابعد الطبیعاتی شاعری اور ہماری غزل میں فصاحت اور سلاست دونوں کی اہمیت ہے لیکن فنی اور فکری اعتبار سے اردو اور فارسی غزل گو شعرا اپنے مغربی حریفوں سے بہت آگے ہیں۔ مابعد الطبیعاتی شعرا کو ادبی تاریخ میں وہ حیثیت نہیں حاصل ہو سکی جو دانتے اور اس قبیل کے دوسرے شاعروں کو حاصل ہے لیکن حافظ، رومی، میر اور غالب بجائے خود مشرقی ادب میں "تاریخ" ہیں۔

ختم ہو رہی تھی۔ ڈن اور بن جانسن کی شاعری نشاۃ الثانیہ کے پہلے دور کی شاعری کے مقابلہ میں زیادہ عقلی اور فکری تھی۔

ڈن نے اپنے زمانہ کے مروجہ ادبی روایات سے ایک حد تک بغاوت ضرور کی۔ مگر عشقیہ شاعری پر اطالوی شاعروں کا جو اثر پڑا۔ اس سے وہ بھی بے نیاز نہ رہ سکا۔ اس کی محبوبہ نشاۃ الثانیہ کی "محبوبہ" سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس کے خد و خال، اس کے عادات و اطوار اور عاشقوں سے تعلقات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں نظر آتی، ہاں لب و لہجہ میں فرق ضرور محسوس ہوتا ہے۔ ڈن کو عشق سے واقعی سابقہ ہوا تھا۔ لہذا اس کے اشعار محض روایتی جذبات کا اظہار نہیں بلکہ خلوص اور حقیقت کے بھی حامل ہیں۔ اسے عشق اور محبت کے گوناگوں تجربے حاصل تھے۔ اس نے محبوب کو ہر کیفیت اور ہر انداز میں دیکھا تھا۔ اس لیے اس کے جذبات و تاثرات میں بھی صداقت اور خلوص ہے۔ کبھی وہ سپردگی پر آجاتا ہے تو محبوب کے قدموں میں سر ڈال دیتا ہے اور کبھی نفرت کرتا ہے تو اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ڈن کی عشقیہ شاعری اس کی رنگین زندگی کی تفسیر ہے جس میں عینیت کے ساتھ حقیقت اور واقعیت و مجاز کا بہترین امتزاج ہے۔ اپنے معاصرین یعنی اسپینی شاعر گنگورا Gangora اور اطالوی مارینی Marini کی طرح ڈن نے نشاۃ الثانیہ کے ایک خاص میلان کو انتہائی درجہ تک پہنچا دیا۔ اس کی شاعری اگرچہ سب سے متضاد ہے لیکن جذبات کا نکھار اور خیالات کی ہم آہنگی سب میں قدرِ مشترک ہیں۔

(ج) کلاسیکی شاعری کے پیش رو:۔

نشاۃ الثانیہ کے دوسرے دور میں چند شعرا ایسے گذرے ہیں جو نشاۃ الثانیہ اور دورِ جدید کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت محض اس وجہ سے ہے کہ وہ جدید کلاسیکی عہد کے ذہنی اور ادبی میلانات کے پیشرو خیال کیے گئے ہیں۔

۱۔ ابراہم کاؤلے Abraham Cowle (۱۶۱۸ء تا ۱۶۶۷ء)

اپنے معاصرین میں ابراہم کاؤلے کو ملٹن سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ خود ملٹن نے اسے شیکسپیر اور اسپنسر کے بعد انگریزی شاعروں میں تیسرا بڑا شاعر تسلیم کیا لیکن زمانہ

گزرتے جانے پراس کی ادبی اہمیت کم ہونے لگی۔ ڈرائیڈن اور پوپ اس کی زباں دانی کے قائل تھے لیکن اسے بڑا شاعر نہیں مانتے۔ مگر ڈاکٹر جانسن کاؤلے کو جدید انگریزی شاعروں کا رہنما خیال کرتا ہے۔

کاؤلے عبوری دور کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں مابعد الطبیعاتی شاعری کے عناصر کے ساتھ جدید کلاسیکی شاعری کے ابتدائی نقوش بھی ملتے ہیں۔ قدماء کے علوم پر اس کو جو تبحر حاصل تھا اس نے اس کے اندر انسان دوستی کا بھی ایک میلان پیدا کر دیا لیکن اس کی شاعری میں چند ایسے عناصر کا غلبہ ہے جن کی بنا پر اسے دورِ جدید کا پیشرو شاعر کہنا ہی پڑتا ہے۔ وہ اپنی مذہبیت اور کلاسیکیت کے باوجود عقلیت Intellectualism کا سب سے بڑا نمائندہ اور ہابس Hobbs اور بیکن Bacon کا مدّاح تھا۔ اسی لیے اس کی شاعری علمیت، عقلیت اور مذہبیت کی آئینہ دار ہے۔ "محبوبہ" The Mistress اس کی عشقیہ نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہاں جدت خیال و ادا کی جگہ روایتی شاعری کی جھلکیاں ملتی ہیں ان نظموں کو ہم زیادہ سے زیادہ درباری یا اعلیٰ طبقہ کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔

کاؤلے نے اپنے یورپی معاصرین کی طرح رزمیہ نگاری میں بھی زورِ قلم صرف کیا۔ اس کی Davidias جو بارہ حصّوں میں لکھی جانے والی تھی، چوتھے حصّہ کے بعد ختم ہو گئی۔ اس رزمیہ کے لیے شاعر نے عہد نامۂ عتیق اور عہد نامۂ جدید سے مواد حاصل کیا اور ایک طرح سے ملٹن کی "فردوسِ گمشدہ" کے لیے گویا زمین ہموار کی۔ مگر چونکہ اس پر عہدِ وسطیٰ کا روایتی خول چڑھا ہوا تھا۔ اس لیے اس کا شیطان دورِ جدید کا مبلغ اور باغی ہونے کے بجائے ایک مہیب عفریت ہو کر رہ گیا جس کی جسمانی بدقرینگی سے لوگوں کے اندر خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے۔

کاؤلے کے شاعرانہ کمالات کا اصلی اظہار اس کی خطابیہ نظموں Odes میں ہوتا ہے جن میں وہ اطالوی شاعر پنڈار Pindar کی تقلید کرتا ہے لیکن کبھی اس کی عظمت کو نہیں پہنچتا۔ Ode To Wit میں وہ قوتِ فہم و تخیل کا کلاسیکی نظریہ پیش کیا

کرتاہے مگر شاعری میں قوتِ اختراع کے متوازن استعمال کا ہی حامی ہے Ode To The Royal Society میں اس نے مشہور فلسفی اور ادیب بیکن کی قصیدہ خوانی کی ہے جس نے انگلستان کو نئے فلسفہ اور علوم سے روشناس کرایا تھا۔ بنیادی طور پر کاؤلے دل کے بجائے دماغ کا شاعر تھا۔ اس کی نظموں میں موسیقی، ہم آہنگی اور جذبات کا زیر و بم خال خال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس کے انشائیوں کا مطالعہ اس کے اشعار سے زیادہ دلچسپی سے کرتے ہیں۔

(۲) ایڈمنڈ والر Edmund Waller (۱۶۰۶ء سے ۱۶۸۷ء)

والر کی طویل زندگی میں نشاۃ الثانیہ اور دَورِ بحالی Restoration کے ساتھ ادبی اور سیاسی انقلابات آئے مگر وہ خود اپنی شاعری کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ اس کا مقصد انگریزی شاعری میں ایک خاص "ہمواری" Restoraton پیدا کرنا تھا۔ یہ خوبی اس کی تمام چھوٹی بڑی عشقیہ، قومی اور مزاحیہ نظموں میں نمایاں ہے۔ ان تمام نظموں میں نفاست، صحت اور عالمانہ اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ مگر جوش اور جذبہ کا فقدان ہے۔ والر کے یہاں مابعد الطبیعاتی شعراء کا اندازِ بیان بدلے ہوئے روپ میں ملتا ہے۔ اس کی مشہور نظموں میں "کلی" The Bud "جاؤ" Go اور "حسین گلاب" Lovely Rose ہیں۔

والر کی تشبیہیں نہایت واضح اور عام فہم ہوتی ہیں۔ اس کے یہاں نشاۃ الثانیہ کے شعرا کی طرح کبھی کبھی کلاسیکی دیو مالاؤں سے ضرور گراں باری پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے دوسرے معاصرین سے زیادہ محتاط رہتا ہے۔ اپنی سیاسی اور قومی نظموں میں اس نے ایک خاص ادبی شان پیدا کی ہے جس سے بعد کے جدید کلاسیکی شعراء نے استفادہ کیا۔

(۳) جان ڈینھم John Denham (۱۶۱۵ء تا ۱۶۶۹ء)

جدید انگریزی کلاسیکیت کے پیشروؤں میں ڈینھم کی بھی تواریخی اہمیت ہے۔ پوپ جہاں والر کی شیریں بیانی کا قائل ہے وہاں وہ ڈینھم کے زور و اثر سے بھی مرعوب ہے: اصولی شاعری کے پرستاروں نے ڈینھم کی نیم بیانیہ اور نیم اخلاقی نظم Cooper's Hill

کی بڑی تعریفیں کی ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ شاعر نے مقامی رنگ پیش کرنے میں خاصی کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اس نے دریائے ٹیمس کے کنارے "ونڈسر کے جنگل" Windsor Forest کی تاریخی شہرت کو نظم کیا ہے۔ ندی خود شاعر کے لیے ادبی اور اخلاقی محرک کا کام کرتی ہے۔ وہ اپنی شاعری کو ٹیمس کے پانی کی طرح گہرائی اور صفائی دینا چاہتا ہے جس کے بہاؤ میں نرمی ہو مگر سستی نہ ہو، زور ہو مگر طغیانی کا گمان نہ رہے۔" کلاسیکی شعراء جس "سکون و اعتدال" کے خواہاں تھے وہ انھیں ڈینھم کی شاعری میں ملتا ہے۔

جان ملٹن (۱۶۰۸ء سے ۱۶۷۴ء تک)

نشاۃ الثانیہ کے آخری دور کا واحد نمایندہ شاعر ملٹن ہے جس کی شاعری میں نئی تحریک بیداری کے ساتھ مذہبی اصلاح Reformation کی بہترین خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ملٹن بیک وقت خالص عیسائیت Puritanism کا مبلغ اور اپنے دور کا سب سے بڑا مفکر اور فنکار ہے۔ آسمانِ ادب کا یہ روشن ستارہ تمام معاصرین میں ممتاز اور تمام شاعروں کا سرتاج ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں اسپنسر کی رنگینی، شیکسپیر کی ہمہ گیری اور کاؤلے کی کلاسیکیت کی کمی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کہ وہ ایک اعلیٰ ذہن اور عظیم شخصیت کا مالک ہے جس کا مکمل اظہار اس کی رزمیہ شاعری میں بخوبی ہوا ہے۔

ملٹن اپنی تخلیقی زندگی کی ابتدا ہی سے قدیم اور کلاسیکی فنون کو مذہبی صحیفوں کے اخلاقی احکام کے ساتھ ہم آہنگ رکھنا چاہتا تھا۔ خود اس کے ذہن میں متضاد میلانات برسرِ پیکار تھے ——— عناصر پرستی اور عیسائیت، مذہب اور فطرت ——— لیکن اس نے اپنے لیے ایک راستہ نکال ہی لیا۔ اس کی شاعری بیک وقت کلاسیکی جمالیات کا نمونہ اور مذہبی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ انگریزی شاعروں میں شاید ہی کوئی اس قدر شدید مذہبیت کے باوجود ان ادبی اور فنی لطافتوں کا اظہار کر سکا ہے جتنا ملٹن نے کیا ہے۔

ملٹن کی شاعری کا آغاز کیمبرج یونیورسٹی میں اس کے دورِ طالب علمی سے ہی ہو گیا تھا۔ جس کو اس کے ہورٹن Horton کے شش سالہ قیام سے مزید تقویت پہنچی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش پر جو نظم "Ode On The Morning Of Christ's Nativity" ملٹن نے

بکھی، اس کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی اثرات سے بالکل پاک ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار کا انداز پرتکلف ضرور ہے لیکن آخری حصہ میں سلاست کے ساتھ ساتھ تخلیقی جلال پیدا ہوگیا ہے۔ اس نظم میں ہمیں ملٹن کی آئندہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ شاعر نے یہاں حضرت مسیح کی پیدائش پر شیطان کی سلطنت کی تباہی اور عناصر پرستی کے زوال کی بشارت دی ہے۔

کیمبرج کی تعلیم سے فارغ ہوکر ملٹن نے ہورٹن کے آزاد اور فطری ماحول میں (جہاں شہری رنگ دبو اور درباری سیاستیوں کی رسائی نہیں تھی) اپنی قیام گاہ بنائی اور وہاں ۱۶۳۲ء سے ۱۶۳۸ء تک مقیم رہا۔ اس دیہاتی علاقہ کی خوبصورتی اور فطری حسن کا رنگ ملٹن کی ابتدا کی تخلیقات میں نمایاں ہے۔

L' Allegro اور Il Penseroso دونوں نظمیں کسی قدر بیانیہ اور ایک حد تک فکر میں سموئے ہوئے احساس کی تصویریں ہیں۔ ملٹن خوشیوں کی جستجو میں اِدھر اُدھر سرگرداں رہتا ہے لیکن بالآخر پر تامل اداسی Melancholy کو مسرت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ زندگی اور فطرت کی تمام عیش سامانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ صبح بہار، چڑیوں کی چہچہاہٹ، طلوعِ آفتاب، دیہاتی زندگی اور مشقت اور شام کی سحر آفرینی ——— لیکن اس کے بعد وہ ہمیں فکر کی دُنیا میں لے جاتا ہے جہاں پہنچ کر ہمارے اندر زندگی کے غم آلود رُخ سے ایک گداز پیدا ہوتا ہے۔ ان دونوں نظموں سے زندگی کے دونوں پہلوؤں پر فلسفیانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور ان سے ہم ملٹن کے متفکرانہ مزاج کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔

ملٹن کے ذہن میں اخلاقی اور جمالیاتی تصورات کے مابین جو تصادم تھا، اس کا اظہار تمثیلی انداز میں اس کے ڈرامائی خاکوں میں ہوا ہے جن میں Arcades اور Comus خاص ہیں۔ انھیں "ماسک" Masque* کہا گیا ہے۔ پہلی نظم میں شاعر نے اپنے ممدوح Countess Of Derby کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں لیکن "کومس" ملٹن کے کرم فرما

---

* "ماسک" وہ مختصر ڈرامے ہیں جن میں اداکار چہرے پر نقاب ڈال کر حصہ لیتے تھے لیکن تماشہ کے ساتھ تفریح اور طربیہ خاتمہ ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

Earl Of Bridgewater کے ویلس میں لارڈ پریسیڈنٹ ہونے پر ۱۶۳۴ء میں تخلیق ہوا۔ اس ڈرامہ میں ممدوح کی پندرہ سالہ بیٹی اور اس کے دو بیٹوں نے پارٹ ادا کیے۔

اس ڈرامے میں جب "ایلس" Alice جنگل میں اپنے بھائیوں سے بچھڑ جاتی ہے۔ اور اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے تو کومس نامی عیاش جادوگر اسے اپنے دام تزویر میں پھانسنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ شاہزادی کے دونوں بھائی اسے جادوگر کے ہاتھوں سے بچا لیتے ہیں لیکن جادو کے اثر سے اس کی بے ہوشی دور نہیں ہوتی۔ بالآخر جنگل کی دیوی Sabrina اُسے اصلی حالت میں واپس لاتی ہے۔ "کومس" میں ماجرا Plot نہایت مختصر ہے۔ ملٹن ابتدائی انگریزی اخلاقی ڈرامہ Morality Play سے مواد حاصل کرتا ہے لیکن اس کے یہاں ڈرامائیت کا فقدان ہے۔ طویل مکالموں اور خود کلامیوں کے باعث حرکت و عمل کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر اس میں اخلاقی عنصر اس قدر غالب ہے کہ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نیکی کی تبلیغ اور گناہ کی خرابیوں سے ہر لمحہ آگاہ کیا جا رہا ہے مگر ان فنی کمزوریوں کے باوجود اس ڈرامہ کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ اسی منزل سے ملٹن کے ذہن میں خیر و شر اور ثواب و گناہ کا تصور جاگزیں ہوا۔ اسے ہم بلا مبالغہ "فردوس گمشدہ" Paradise Lost کا پیش خیمہ کہہ سکتے ہیں۔

ملٹن کے ابتدائی دور کی آخری مشہور نظم "لیسیڈس" Lycidas ہے۔ یہ ایک مرثیہ ہے جو اس کے کیمبرج کے دوست "ایڈورڈ کنگ" Edward King کی وفات پر ۱۶۳۷ء میں لکھا گیا۔ اس نظم میں ہم نہ صرف قدیم مرغزاری شاعری Pastoral Poetry کلاسیکی تلمیحات اور مقامی دیومالاؤں کے اثرات جا بجا محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ ملٹن کے اپنے پیغام اور اس کے انجام کار کی جھلکیاں بھی پاتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی علمی ریاضتوں اور خوشیوں سے محرومی پر نالاں ہوتا ہے لیکن پھر مشیت ایزدی کو ہی اپنی نجات سمجھتا ہے۔

لیسیڈس کے بعد ملٹن ملکی سیاست میں اس طرح اُلجھا کہ اس نے سوائے چند سانیٹ

لکھنے کے کسی وقیع شعری کارنامہ کا خیال نہیں کیا۔ لیکن ان مختصر نظموں میں بھی شاعر کے سیاسی
مذہبی اور ذاتی خیالات و تاثرات کی جھلک ملتی ہے۔

سنہ ۱۶۶۰ء میں شاہ چارلس دوئم کی بحالی Restoration کے بعد ملٹن سیاسی زندگی
سے بالکل دست بردار ہو گیا۔ شہنشاہیت کے پہلے دور میں تو اس کی زندگی ہی خطرے میں
تھی لیکن جب اسے ذہنی سکون حاصل ہوا تو وہ زیادہ مستعدی سے اپنے شعری منصوبوں
کی طرف متوجہ ہو سکا۔ اس دور کے تینوں کارنامے "فردوسِ گمشدہ" **Paradise Lost**
"فردوس بازیافت" **Pradise Regained** اور سیمسن اگونسٹس
Samson Agonistes شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ پہلی کتاب سنہ ۱۶۶۷ء میں
شائع ہوئی لیکن آخری دونوں سنہ ۱۶۷۱ء میں منظرِ عام پر آئیں۔ ان شاہکاروں میں ملٹن وہ
نہیں ہے جو انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے دوران میں تھا۔ اس کے ذاتی آلام اور
قومی زندگی کے ہیجان نے رفتہ رفتہ اس کے اندر سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ اس دور میں اس
نے نشاۃ الثانیہ کے مروّج ادبی اصناف سے بے نیاز ہو کر مذہبی صحیفوں سے اپنا مواد
حاصل کیا اور کائنات کی تخلیق، فرشتوں کی شکست، آدم کے زوال اور حضرت مسیح کی آخری
فتح اور دوسرے مذہبی مواخذ سے اپنی رزمیہ نظموں کی ترکیب کی۔

(۱) "فردوسِ گمشدہ"

سترھویں صدی کے سائنسی اور عقلی ماحول میں "فردوسِ گمشدہ" کی تخلیق ایک معجزہ
ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت عوام شاعری کو محض تفریح یا تفننِ طبع کا ذریعہ سمجھتے تھے
اور ان کے خیال میں شاعری کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ادھر ملٹن کو اوائل عمر سے
ہی ایسے شاہکار کی تخلیق کی دُھن سوار تھی جو یونان اور روم کے شاہکاروں کا مقابلہ کر
سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک سچّے عیسائی کی حیثیت سے ملک اور قوم کے اندر مذہبی اور
اخلاقی روح بھی پھونکنا چاہتا تھا۔ چنانچہ تمام اصنافِ سخن میں "رزمیہ" **Epic** ہی اس
کے ذہن اور فکر کی مکمل نمائندگی کے لیے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوا۔ ایک عرصہ تک
ملٹن یونانی اور لاطینی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتا رہا۔ لیکن آخرکار اس نے "آدم کے زوال"

کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اگرچہ اس موضوع سے مماثل ادبی نمونے متقدمین کے یہاں موجود تھے لیکن ان پر رومانیت کا گہرا نقش تھا جسے ملٹن کا سائنسی زمانہ قبول نہیں کر سکتا۔ اسی لیے ملٹن نے رومانی روایات اور دیو مالا کے بجائے مسیحی روایات و اساطیر سے اپنی نظموں کے لیے ترکیبی عناصر مہیا کیے۔

"فردوسِ گمشدہ" کا مرکزی تصوّر "مشیت الہٰی کا جواز اور اثبات" Justification of the Ways of God ہے۔ تمام انسان دوست عیسائیوں کی طرح ملٹن کا بھی خیال ہے کہ خدا کا قانون عقل اور فطرت کا قانون ہے۔ اس کی اطاعت ہمارے لیے باعثِ خیر و برکت ہے اور سرکشی کا نتیجہ جہنّم ہے۔ ملٹن کے ان مذہبی تصوّرات کے ساتھ قدیم فلسفہ اور عوامی آزادی کے جذبات بھی شامل ہیں۔ حوّا کا زوال "تکبّر" کی وجہ سے ہوا اور آدم ایک عورت کی محبّت کے گناہ میں باغِ عدن سے نکالے گئے۔ اگرچہ ملٹن اس رزمیہ میں ہم کو نشاۃ الثانیہ کے انسان دوستوں کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کی "آزادی" Liberty اور "عقل" کے تصوّرات بدلے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دَور میں آزادی کے ساتھ پابندی، حق کے ساتھ فرض، اور حکومت کے ساتھ اطاعت کا بھی قائل ہو چکا ہے۔ شیطان اسی لیے مور دِ عتاب ہوا کہ اس نے غیر مشروط آزادی کی دھن میں اپنے فرائض سے روگردانی کی۔ "فردوسِ گمشدہ" میں ملٹن ایک فرشتہ کی زبان سے کہلواتا ہے کہ لائق حاکم کی اطاعت اور فرمانبرداری ہمیشہ جائز اور روا ہے۔ لیکن جاہل کی اطاعت بدترین غلامی ہے:۔

When He Who Rules Is Worthiest
And Excels Than Whom He Governs.This is Servitude
To serve The Unwise

ملٹن کا خیال ہے کہ انسان اپنی قسمت کا مالک نہیں لیکن اپنے اعمال کا ذمہ دار ضرور ہے۔ جب خدا نے اسے عقل اور سمجھ دی ہے تو لازم ہے کہ وہ خیر و شر، عذاب و ثواب اور نشیب و فراز کے درمیان امتیاز کرے اور اپنے لیے فلاح کا راستہ خود متعیّن کرے۔

ادبی نقطۂ نگاہ سے "فردوسِ گمشدہ" کو نہ صرف انگریزی ادب بلکہ تمام دُنیا کے شاہکاروں

میں ممتاز جگہ حاصل ہے۔ انسانوں کے جدِ امجد حضرت آدم کا افسانہ جس ڈرامائی انداز میں یہاں پیش کیا گیا ہے، اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ شیطان کی بغاوت، باغِ عدن کی زندگی، فرشتوں اور شیطان کے مریدوں میں جنگ، ام البشر حوا کا ارتکاب گناہ اور باغِ عدن سے دو مجبور انسانوں کے نکالے جانے کا منظر ہمارے اوپر بے حد گہرے اثرات اور نقوش چھوڑتے ہیں۔

(۲) "فردوسِ بازیافت"

یہ نظم دراصل "فردوس گمشدہ" کا تتمہ ہے۔ ملٹن کے مذہبی عقائد اور شاعرانہ خیالات میں وحدت کے لیے ضروری تھا کہ جب زمین پر شیطان کا قبضہ ہو گیا تو کوئی شافیٔ انسانیت پیدا ہو اور خدا کے بندوں کو اس ملعون سے نجات دلائے۔ یہ ہفت خوان حضرت مسیح نے طے کیے اور زمین سے شیطان کی حکومت ختم کر دی۔

فنی نقطہ نگاہ سے "فردوسِ بازیافت" میں وہ زور و اثر نہیں جو "فردوسِ گمشدہ" کو حاصل ہے۔ یہاں دوزخ اور بہشت نہیں ہیں۔ شیطان کی بغاوت اور سرکشی ختم ہو چکی ہے اور اس کے اندر کی چنگاریاں بھی سرد ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں ہمیں ایک عظیم الشان رزمیہ کی جگہ ایک اخلاقی اور سبق آموز نظم کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں حضرت مسیح کے کردار میں خود ملٹن کی زندگی کے عکس ملتے ہیں۔ حضرت مسیح نے غازیانہ جنگوں سے احتراز کیا، ملٹن بھی آرتھری رزمیہ کو نہیں اپنا سکا۔ مسیح اور ملٹن میں ذہنی اور طبعی موازنات بھی ہیں۔ دونوں یونان و روما کے علوم و فنون سے بہت جلد بیزار ہو جاتے ہیں اس لیے کہ وہاں جسمانی لذت اور جمالیاتی کیفیت تو ملتی ہے مگر سچی بصیرت اور حقیقی شعور ناپید ہے۔ اس نظم سے ہمیں ملٹن کے ذہنی کردار، شعری مزاج اور مذہبی شعائر کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۳) "سیمسن اگونسٹس"

ملٹن کا آخری کارنامہ جس قدر ذاتی ہے اسی حد تک ادبی خوبیوں کا بھی حامل ہے۔ فنی اعتبار سے اس ڈرامہ میں یونانی المیہ ڈراموں کی جھلک ملتی ہے اور وحدتِ عمل اور کلاسکی اصولوں کی پابندی بھی ہے۔ مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شاعر کے المناظر یہ

کی بخوبی وضاحت ہوئی ہے۔

سیمسن یہودیوں کا نذیر Nazerite ہے جس نے ملک کو غیر یہودی قوموں Philistines کے شکنجہ سے آزاد کرنے کی قسم کھائی ہے لیکن اس کی غیر یہودی بیوی ڈیلائیلا Delilah اسے دھوکا دے کر اس کی طاقت کا غیبی راز معلوم کر لیتی ہے۔ اور پھر اس کو دشمنوں کے حوالے کر دیتی ہے اور وہ قید میں اندھا کر دیا جاتا ہے۔ بالآخر اس کی قوت دوبارہ عود کر آتی ہے اور وہ اپنی جان دے کر دشمنوں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

ملٹن کی سیاسی اور تاریخی اہمیت اور اس کی بلیغ اور جلیل القدر شاعری کی عظمت ہمیشہ مسلّم رہے گی۔ شیکسپیئر کے بعد انگریزی ادب میں جتنے صاحب طرز پیدا ہوئے۔ ان میں ملٹن کا مقام اس کی بلند آہنگی، قوتِ تخیل، آفاقیت اور انسان دوستی کے باعث دوسروں سے ممتاز رہے گا۔

نثر نشاۃ الثانیہ کے ادب پر شاعری کا ایسا غلبہ تھا کہ لازمی طور پر اس زمانہ کی نثر میں بھی شاعرانہ خصوصیات داخل ہو گئیں۔ سلیس اور افادی نثر کا تصور اس دور میں بہت مشکل تھا۔ اس وقت نثری کارنامے سر فلپ سڈنی کی رومانیت اور للی کی مرصع نگاری کا انداز لیے ہوئے تھے۔ انگریزی نثر کے ابتدائی دور میں متقدمین کے علاوہ مذہبی معاملات و مسائل اور فلسفیانہ مباحث یا سیاسی معرکہ آرائیوں کے لیے ادیبوں نے جس نثر کا استعمال کیا۔ وہ اپنے زمانہ کی یادگار ہے۔

سر فلپ سڈنی Sidney طبعاً رومان پرست واقع ہوا تھا۔ اگرچہ اس نے شاعری کی وکالت کرتے ہوئے کلاسیکی فنون کو اپنے زمانہ کے مروّج اسالیب و اصناف پر ترجیح دی لیکن وہ خود ان اصولوں کا پابند نہ ہو سکا۔ "Arcadia" میں تخیل کی آزاد کارفرمائی نمایاں ہے۔ یہ ایک رومانی داستان ہے جس کو پڑھ کر کے "الف لیلیٰ" کے قصوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مگر اس داستان میں مرغزاری Pastoral اور غازیانہ Chivalrons زندگی کا امتزاج مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔

"آرکیڈیا" ایک مثالی دیہاتی علاقہ ہے جہاں شاہ بسلیس Bicillus اپنی

زندگی کے آخری دن پُر سکون طریقے پر چرواہوں کے ساتھ رہ کر گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی ایسی ہی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر اس خطہ کی پُر امن زندگی میں محبت کا دیوتا اپنے تیر چلاتا ہے اور سارا علاقہ میدانِ کارزار بن جاتا ہے۔ دو شاہزادے بھیس بدل کر بادشاہ کی بیٹیوں پر عشق کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے خلوص اور محبت کی بنا پر انھیں حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

ترتیبِ ماجرا کے علاوہ اس داستان میں "افسانہ در افسانہ" کی کیفیت پیدا ہوتی گئی ہے جس سے مصنف کی زندگی اور اس کے مطمحِ نظر اور نشاۃ الثانیہ کے بیشتر پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

"جان لِلی" John Lily کی شہرت اس کی مایۂ ناز تصنیف Eupheus کی بدولت ہے۔ اس افسانہ کا ہیرو ایک نوجوان ایتھنی ہے جو شرافت اور ظرافت کا نمونہ اور سیر و سیاحت کا دلدادہ ہے لیکن اسے اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا سلیقہ نہیں معلوم ہے۔ نیپلز (لندن کا افسانوی نام) جاکر وہ بڑے بوڑھوں کی رایوں کا خیال نہیں کرتا اور تمام گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اخلاقی پستیوں کے گڈھے میں گر جاتا ہے۔ لوسِل Lucille نامی عورت سے وہ محبت بھی کرتا ہے لیکن وہ بھی اسے دھوکا دیتی ہے۔ آخر کار وہ ایتھنس لوٹ کر کتابوں اور فلسفیوں کی صحبت میں اپنے کو کھو دیتا ہے۔

لِلی کو بجا طور پر انگریزی کا پہلا ناول نگار کہا گیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے سماج کا صحیح خاکہ پیش کیا اور اس لحاظ سے تمام پیشروؤں سے ممتاز ہے۔ لِلی کے شاہکار کی سب سے بڑی خوبی اس کا ترصیعی انداز ہے۔ اس کا اسلوب اس قدر مقبول ہوا کہ آج تک اس قسم کے مرصع طرزِ نگارش کو Euphuism سے موسوم کیا جاتا ہے اُردو نثر میں رجب علی بیگ سرورؔ ہی ایک حد تک اس فن کے نمایندہ ہیں۔

"رابرٹ گرین" Robert Greene لِلی کا شاگرد اور جانشین ہے۔ اس کی نثر میں بھی رنگینی اور تکلف کا انداز نمایاں ہے۔ بوہیمیا اور اٹلی کی سیر و سیاحت کے بعد وہاں کی معاشرت سے متنفر ہو کر وہ لندن میں رہنے لگا لیکن خود بازاری عورتوں اور شراب خانوں

میں تباہ ہو کر رہ گیا۔ ان حالات و واقعات کا اثر اس کی تصانیف میں ہر جگہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

"میمیلیا Mamillia میں گرین نے نوجوانوں کو نمائشی محبت اور اس کے انجام کار سے متنبہ کیا ہے۔ "مینافن" Menaphon جو ۱۵۸۹ء میں شائع ہوا، شاعرانہ اور رومانی اسلوب بیان کے لیے مشہور ہے۔ اس میں سمندری سفر اور جہاز کی تباہی سے قصہ کا پلاٹ تیار کیا گیا The Conney Catching Traits گرین کی لندن کی زندگی کا عکس لیے ہوئے ہیں۔ یہاں اس نے [illegible] عورتوں، بدمعاشوں اور شہدوں کے رہن سہن کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

"Confessions" جو گرین کی نثری تصنیفات کی آخری کڑی ہے۔ دراصل مصنف کی بے راہ روی اور عیاشیوں کا نوحہ ہے۔ یہاں وہ اپنے دوستوں کی دہریت اور عیاشیوں اور بدکاریوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ انھیں مضامین کے سلسلہ میں اس نے شیکسپیر کا بھی ذکر کیا ہے جو لوعمری کے باوجود دنیائے ڈرامہ پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

دور الزبتھ کا حقیقت پسند طنز نگار "طامس نیش" صحیح معنوں میں گرین کا شاگرد اور جانشین تھا۔ کیمبرج میں تعلیم کے بعد اس نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ کٹر مذہبی عیسائیوں Puritans کے خلاف اس نے باقاعدہ محاذ بھی بنالیا تھا۔

انگریزی نثر میں نیش ایک خاص طرز تحریر کا مالک ہے۔ اس نے طنزیہ اسلوب کو عوامی زبان میں غنائیت کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے علاوہ وہ مستقل طور پر گرین کے ادبی حریفوں کِڈ Kyd اور مارلو Marlowe سے بھی نبرد آزما رہا اور ان کے اسلوب بیان کی تضحیک کی۔ نیش نے اپنے زمانہ کی ضعیف الاعتقادی اور معاشرتی کمزوریوں کا نقشہ اپنی مشہور تصنیف Anatomy of Absurdities (۱۵۸۹ء) میں کھینچا ہے۔

لیکن اس کا سب سے اہم کارنامہ "بدنصیب مسافر The Unfortunate Traveller" ہے جس میں اس نے ہنری ہشتم کے ایک درباری غلام کو فلینڈرس، جرمنی اور اٹلی وغیرہ ممالک کی سیر کرائی ہے۔ ناول کے دوسرے باب کا پس منظر سرزمین اطالیہ ہے جو فنکاروں، حسینوں

اور قاتلوں کا ملک ہے ۔ یہاں نیش نے اٹلی کی خوبصورتی اور دلکشی بھی بیان کی ہے اور وہاں کے بدمعاشوں کا بھی خاکہ کھینچا ہے ۔ اس تصنیف سے مابعد کے ڈرامہ نگاروں مارسٹن، ڈبسٹر اور مڈلٹن وغیرہ نے بہت استفادہ کیا ۔

جیمس اول کے دور حکومت میں "طامس ڈیکر" Thomas Dekkar نے گرین اور نیش کی گدی سنبھالی ۔ اس نے اپنے پیشروں کی طرح ناول اور افسانے تو نہیں لکھے لیکن اپنی تصنیفوں میں سماجی زندگی کی نہایت دلچسپ مصوری کی ۔ ۱۶۰۳ء کو اس نے "تعجب خیز سال" Wonderful Year بتایا ہے اور اس سلسلہ میں ملکہ ایلزبتھ کی وفات، جیمس کی تخت نشینی اور لندن کے طاعون کا بھی ذکر کیا ہے ۔ یہاں اس کا اسلوب بیان طنزیہ، مزاحیہ اور تمثیلی ہے ۔ سب سے زیادہ دلچسپ تذکرہ گناہ کے اڈوں پر طاعون کے حملے کا ہے ۔ ایک قصہ ڈیکر نے یوں بیان کیا ہے کہ ایک موچی کی بیوی اس خیال سے کہ اب وہ جانبر نہ ہوسکے گی اپنے شوہر سے اپنی تمام لغزشوں اور بدکاریوں کا اقبال کرتی ہے اور بیچارہ شوہر "ہم سب گنہگار ہیں" کہہ کر اسے بخش دیتا ہے ۔

"کنواروں کی ضیافت" The Bachelor's Banquet میں ڈیکر نے ازدواجی زندگی کی پریشانیوں کا نہایت مزاحیہ فیچر پیش کیا ہے ۔ شوہر عام طور پر سیدھے ہوتے ہیں لیکن دھوکے کے شکار بھی ہوتے ہیں ۔ بیویاں اپنی تمام حماقتوں کے باوجود شوہروں کی نکیل گھماتی رہتی ہیں ۔ اس خاکہ میں افواہوں اور چنڈو خانہ کی گپوں کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔

ڈیکر کی تمام نثری تصانیف میں Gull's Horn Book اپنی نوعیت کا شاہکار ہے ۔ اس افسانہ کا ہیرو "احمق" Gull قدیم زمانے کے رئیسوں میں تھا ۔ اور عیاشی کے فن میں مشق بہم کررہا تھا ۔ لندن پہنچنے پر اس کے استقبال کے لیے ٹھگوں، بدمعاشوں اور رنڈیوں کی پوری مجلس حاضر تھی ۔ چنانچہ اس "دارالسرور" میں اس کی خاطر خواہ مرمت ہوئی :

ڈیکر کے خاکوں سے جانسن اور مڈلٹن نے اپنے طربیہ ڈراموں کے پلاٹ مرتب کئے

ان کے مطالعہ سے جیمس اوّل کے عہد کے لندن کی معاشرتی زندگی کا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

مذہبی نثر ملکہ ایلزبتھ کے عہد حکومت میں مذہبی تنازعے کچھ اس طرح بڑھے کہ ملک کے تمام لکھنے والے اس طرف لازمی طور پر متوجہ ہوئے۔ ان مصنفوں کی باہمی چشمکوں سے کاغذی معرکوں کا سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ انگلستان کے سرکاری مذہب کے پیروں Anglicaniam اور رجعت پسند عیسائیوں Puritanism کے درمیان اکثر تنازعے ہوتے رہتے۔ جس سے نہ صرف مناظروں اور مباحثوں کی نوبت آتی رہتی تھی بلکہ پریس اور پلیٹ فارم دونوں کی رونق بڑھتی۔

رچارڈ ہُوکر (۱۵۵۴ء سے ۱۶۰۰ء) تک

اس دَور کا بہت بڑا صاحبِ قلم مانا گیا ہے۔ اس نے کافی سنجیدگی سے "قوانین الٰہیہ" The Laws of Ecclesiastical Polity مرتب کیے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ انسان کو بصیرت دو طرح سے مل سکتی ہے ——— انجیل سے جو کلامِ خدا ہے اور عقل سے جو اللہ کی نعمت ہے۔ اگر ان دونوں میں تناقص ہو تو عقلِ سلیم پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس کا قول ہے کہ "خدا کے سارے قوانین معقول قوانین ہیں اور تمام وہ قانون جنھیں عقل کی حمایت حاصل ہے خدا کے قانون ہیں"——— ہُوکر کا خیال تھا کہ انجیل میں مافوق الفطرت کا بھی ذکر ہے جنھیں ہم قابلِ قبول نہیں پاتے۔ اس لیے اس مُقدّس کتاب کی حیثیت ہمارے لیے مزید بصیرت Additional Light سے زیادہ نہیں۔ ہُوکر انگلستان کے سرکاری مذہب کا حامی تھا۔ اس لیے اس نے پاپائیوں اور رجعت پسندوں کی انتہا پسندی کا مذاق اڑایا۔ پاپائیت کلیسا کے مقابلہ میں عقل کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ رجعت پسند انجیل کے سامنے کلیسا اور عقل دونوں سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان مفاہمت "انگریزی عیسائیت" Anglicanism سے ہی ممکن ہے جہاں کتبِ مقدّسہ کے علاوہ عقل کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ سترھویں صدی میں ہُوکر کی تعلیمات کو شکست ہوئی۔ لیکن دورِ بحالی Restoration کے بعد تمام مذہبیوں نے

اس کے فلسفہ اور نظریہ سے اتفاق کیا۔ "روایت" Tradition اور عقلیت Rationalism کے اس امتزاج کے باعث ہُوکر کو مذہبی ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

نشاۃ الثانیہ کی تمام نثری تصانیف میں ۱۶۱۱ء کے انجیل کے باضابطہ ترجمہ Authorised Version کی بڑی اہمیت ہے۔ اگرچہ اینگلو سیکسن زمانے سے انجیل کے کئی ترجمے ہوئے لیکن یہ مقبولیت کسی دوسرے نسخہ کو نہیں حاصل ہو سکی۔ اس آسان، سلیس اور عام فہم ترجمہ سے حضرت مسیح کا پیغام خانقاہوں سے نکل کر گھر گھر پہنچ گیا۔ اس کتاب پر "توریت" اور "زبور" Old Testament کا اثر لازمی طور پر پڑا۔ لیکن اس سے انگریزوں میں مذہبی تنگ نظری بھی بڑھی۔ وہ حضرت مسیح کی تعلیمات اور ان کی انسانیت سے دور جا پڑے اور قدیم یہودیوں کی طرح اپنے کو مسیح کے پیروؤں میں سب سے اشرف ماننے لگے۔

جدید انجیل کی تالیف کے لیے سینتالیس علماء نے کام کیا اور جیمس اوّل کے شاہی فرمان کے مطابق اس کی تکمیل ہوئی۔ بعد کو گرجوں میں یہی کتاب عبادت قرار دی گئی۔

مذہبی نثر کے سلسلہ میں "جیری ٹیلر" Teremy Taylor کا ذکر ناگزیر ہے۔ ٹیلر (۱۶۱۳ء سے ۱۶۶۷ء) جسے منبر و محراب کا شیکسپیر اور اسپنسر کہا گیا ہے اپنے زمانے کے زبردست ترین مذہبی مقرروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے مذہبی انتہاپسندوں کے درمیان مصالحت کی بڑی کوشش کی اور اس کے لیے ۱۶۴۶ء میں A Discourse on the Liberty Of Prophesying شائع کی۔ اس کی دوسری اہم تصنیفوں میں Holy Living اور Holy Dying مشہور ہیں۔ ٹیلر کے مواعظ Sermons اپنی سلاست، دلنشینی اور شعریت کے لیے آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔

فلسفیانہ نثر نشاۃ الثانیہ کے دوسرے دور میں مذہبی ادب کے ساتھ ایک قسم کا سیکولر ادب Secular Literature بھی ترقی پا رہا تھا جس کا سب سے بڑا

رہنما بیکن تھا۔

فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء سے ۱۶۲۶ء) اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم اور ذہین ادیب تھا اور فلسفہ، سائنس اور ادب میں کئی حیثیتوں سے اسے انگلستان میں اولیت کا شرف حاصل رہا۔ جدید مغربی فلسفہ میں بھی بیکن کو تاریخی شہرت ملی۔ اگرچہ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ کر اس نے بدعنوانیاں کیں اور پوپ کے اس فقرہ ——— "عاقل ترین، ذہین ترین اور کمینہ ترین" کا سزاوار بھی ٹھہرا۔ لیکن اس کی معرکۃ الآرا تصانیف کے سامنے ان لغزشوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

کیمبرج میں طالب علمی کے زمانہ سے ہی بیکن کو قدیم فلسفہ کی بے ثمری کا یقین ہوگیا تھا اس کا خیال تھا کہ اس کے ذریعہ عالمانہ مباحث کو طوالت ضرور دی جا سکتی ہے لیکن حقیقت تک رسائی ممکن نہیں۔ چنانچہ اس نے معلمین Schoolmen کے طریقہ کار کو چھوڑ کر استقرا Induction کو زیادہ اہمیت دی۔ اس نے اپنے نصب العین کا اعلان کچھ اس طرح کیا:———

"مجھے حقیقت کا ذاتی ادراک ہوا جس کے لیے مجھے تحقیق و تفحص سے کام لینا پڑا۔ میں غور و فکر کی کٹھن وادیوں سے گزر کر نتائج اخذ کرتا رہا میرے نزدیک جدت کی کوئی قدر نہ تھی اور نہ قدامت کے لیے کوئی خاص اہمیت .... میں نے بالآخر تمام علوم کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا۔"

اس نظریہ کی مزید توضیح بیکن نے اپنی مشہور تصنیف Novum Organum میں کی۔ جس میں اس نے تمام علوم کے باہمی رشتہ پر زور دیا ہے۔ اس نے انسانی کمزوریوں اور علم دشمن عناصر کو طبقاتی فرقہ آرائی، رجعت اور سوقیت میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا نظریۂ تحقیق فطرت کے خارجی مطالعہ اور باقاعدہ تجربہ Experiment پر مبنی ہے۔ The Advancement Of Learning اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے۔

بیکن کی بیشتر تصانیف لاطینی زبان میں ہیں لیکن ان کی اہمیت اور انگریزی ذہن پر ان کے اثرات سے کسی کو انکار نہیں۔ انگریزی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ وہ

انشائیے Essays ہیں جن کی بدولت وہ انگریز انشا پردازوں کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ان انشائیوں سے ہمیں فرانسیسی مصنف مانتین Montaigne کی یاد آتی ہے جس نے اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو مختصر مضمونوں میں سمودیا ہے۔ ایک بات البتہ قابلِ لحاظ ہے۔ کہ مانتیں کے یہاں جو فراوانی اور انسیت محسوس ہوتی ہے وہ بیکن کے یہاں مفقود ہے۔ انگریز انشا پرداز نے اپنے ذاتی تجربے فلسفیانہ انداز میں پیش کیے۔ ان مضامین کی مابہ الامتیاز خصوصیت اختصار اور جامعیت ہے۔ یہاں اس کا خطاب درباریوں اور شاہزادوں سے تھا۔ اسی لیے نفسِ مضمون کی حد تک ہم بیکن کو اطالوی مدبر میکاؤلی Machiavelli سے زیادہ نزدیک پاتے ہیں۔ بیکن انگریزی زبان میں افادی ادب کا سب سے پہلا نمایندہ ہے۔

سترھویں صدی کا نصف اوّل مذہبی مباحثوں، خانہ جنگیوں اور رجعت پسند عیسائیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس دور میں نثر کو لازمی طور پر ترقی ہوئی۔ کیونکہ عوام تک رسائی کے لیے اس سے بہتر کوئی آلہ نہ تھا۔ یہی وجہ کہ اس دَور کے نثری کارنامے اپنی سنجیدگی اور مقصدیت کے اعتبار سے زیادہ وقیع اور اہم ہیں۔ سرطامس براؤن Sir Thomas Browne اور ملٹن Milton کی نثر میں افادی لہجہ بخوبی نمایاں ہے۔

سرطامس براؤن (۱۶۰۵ء سے ۱۶۸۲ء) کا شمار نشاۃ الثانیہ کے زبردست عالموں میں ہوتا ہے۔ اس کا مذہبی اور دنیوی علوم کا مطالعہ بہت عمیق تھا اور اسے بیکن کے سائنسی تجربات سے بھی پوری واقفیت تھی۔ اسی لیے قدیم اور جدید کا جو حسین امتزاج براؤن کے یہاں ملتا ہے وہ کسی دوسرے ہمعصر کے یہاں نہیں ہے۔

براؤن کی فطرت میں صوفیانہ میلانات کو بھی دخل تھا۔ اسی لیے خانہ جنگی Civil War نے اس کی ذہنی یکسوئی اور اطمینان کو کوئی صدمہ نہیں پہنچایا۔ اسے سائنس سے بڑی دلچسپی تھی۔ لیکن اس کا رجحان فوق الفطرت کی طرف رہا۔ انجیل سے اسے اس قدر عقیدت تھی کہ وہ سائنسی نظریات سے بھی متفق نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مذہبی عقائد کی تردید کرتے۔ اس نے مشہور عالم کاپرنیکس Copernicus کی ہمیشہ مخالفت کی اور اس بات پر مصر رہا کہ زمین

ہی کائنات کی مرکز ہے۔ علم کیمیا، جادوگری اور قدیم علمِ نجوم پر اس کا عقیدہ اس قدر راسخ تھا کہ وہ اکثر اوقات عام انسانی تجربوں اور مشاہدوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا۔ اس کی شہادت پر دو غریب عورتوں کو ڈائن ہونے کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔

براؤن کے ذہن میں عجیب تناقصات تھے۔ سائنس اور حکمت کے علم کے باوجود اسے معجزوں اور فوق الفطرت قوتوں میں عقیدہ رہا۔ اس کے ذہنی اور روحانی انتشار کا کچھ اندازہ Religio Medici (۱۶۳۵ء) سے ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق ایک بات البتہ یاد رکھنے کی ہے کہ انگریزی عیسائیت سے وابستگی کے باوجود وہ مذہبی طور پر بڑا وسیع المشرب تھا۔ اس کے دل میں دوسرے عیسائیوں اور کافروں تک کے لیے رحم اور محبت کے جذبات تھے۔ اس طرح نشاۃ الثانیہ کے انسانیت دوست ادیبوں میں براؤن کا مقام بہت ممتاز ہے۔ اس کی تصنیفات کا خاص موضوع دُنیا کی بے ثباتی اور موت کا خوف ہیں۔ اپنے عالمانہ انداز میں وہ قدیم تواریخ اور کلاسیکی شعراء کے کلام سے اپنے نظریات کی حمایت میں ثبوت پیش کرتا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف Urn Burial (۱۶۵۸ء) کا موضوع "موت" ہے جس میں انسانوں کی دُنیاوی اور ظاہری شان و شوکت کا مرثیہ ہے۔

براؤن کے یہاں مذہبیت، آفاقیت اور انسانیت نواز کلچر کے تمام عناصر ملتے ہیں۔ ایک فنکار اور کامیاب نثار کی حیثیت سے وہ انگریزی کے درجۂ اوّل کے مصنفوں میں جگہ پانے کا مستحق ہے۔ اس کی نثر میں جو آہنگ، موسیقی اور شعریت پائی جاتی ہے وہ شاید ہی کسی کے حصّہ میں آئی ہو۔ اس کی انھیں خصوصیات نے اُنیسویں صدی کے رومانی ادیبوں کو اس کا گرویدہ بنا لیا تھا۔

ملٹن نے خانہ جنگی کے دوران شعر و شاعری سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور نثر کے ذریعہ ہی اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت کی۔ ۱۶۴۱ء سے لے کر ۱۶۶۰ء تک اس نے جو کچھ لکھا وہ سترھویں صدی کے وسطی نثر کا بہترین ذخیرہ ہے۔ ان تصانیف میں ملٹن کی شخصیت اور اس کے مذہبی و سیاسی خیالات اور جذبات کی جھلک بھی ملتی ہے اور اس

دَور کے انتشار کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کارناموں کی (جن میں رسالوں اور مقالوں کی اکثریت ہے) حیثیت ہنگامی اور عارضی رہی۔ اس کی سب سے پہلی "کاغذی جنگ" اپنے مذہبی مخالفین کے خلاف رہی۔ اس کے بعد اس نے "طلاق" Divorce پر کئی مقالے لکھے۔ وہ خود تو جمہوریت پسند تھا لیکن اس کی بیوی سامراج کی حامی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر ملٹن نے اپنے مقالوں میں غلط شادیوں کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک میاں بیوی ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم خیال نہ ہوں۔ کامیاب ازدواجی زندگی مشکل ہے۔ اسی لیے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بے میل شادی کی چکّی میں پسنے سے بہتر ہے کہ علیحدگی اختیار کر لی جائے۔

ملٹن کے مقالوں میں Aeropagitica (۱۶۴۴ء) کی حیثیت بالکل منفرد ہے۔ اس مقالہ میں وہ کتابوں کے لیے سرکاری احتساب Censor کے خلاف شدید احتجاج کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال ہے کہ جب تک ملک اور سماج کی تمام بُرائیاں منظرِ عام پر نہیں آجاتیں ان کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ یہاں ملٹن کے قومی جذبہ اور آزاد پسند فطرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی دوسری مشہور نثری تصانیف میں "تاریخ انگلستان" (۱۶۷۰ء) اور لاطینی مقالہ De Doctrina Christina ہیں۔

ملٹن کے نثری کارنامے اس کی جلیل القدر اور جامع شخصیت کے ایک دلچسپ پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ جہاں اس نے اپنے لافانی رزمیہ نظموں میں مذہب اور انسانیت کے راگ گائے وہاں اس نے نثر میں بھی اپنے سیاسی خیالات کو بے باکی کے ساتھ پیش کرنے میں تامل نہیں کیا۔ ملٹن کی نثر اسلوبِ بیان کے نقطۂ نگاہ سے صحافتی معیار سے بہت بلند ہے لیکن اس میں تبلیغ اور سیاسی جانبداری کے میلانات غالب ہیں۔ الفاظ اور تراکیب میں مشکل پسندی اور علمی فضیلت بھی نمایاں ہے۔ لیکن نثر میں اس کا اپنا انداز اور آہنگ ہے۔ انگریزی نثر کی تاریخ میں ملٹن کو کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔

ڈرامہ

نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی دَور میں شاعری کے آگے ڈرامہ کو خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکی۔ لیکن اس دَور کی کوششوں سے دَورِ الیزبتھ میں اس فن کو بڑا فروغ حاصل

ہوا۔ اس زمانہ کے ڈراموں میں ماضی کی بہترین روایتوں کے ساتھ مستقبل کی نئی راہوں کے بھی اشارے ملتے ہیں۔ "معجزاتی ڈرامے" **Miracle Plays** کا رواج شروع میں باقی رہا۔ مگر بعد میں پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی مخالفت سے یہ ختم ہونے لگے۔ مذہبی اصلاح کا اثر مختلف شہروں کے ڈرامائی سماج پر بھی پڑا۔ لیکن ان کا اثر دیرپا رہا۔ "اخلاقی ڈرامے" **Morality Plays** کی اہمیت بدستور قائم رہی اور انھیں اصلاح و ترمیم کے ساتھ مذہبی جذبات کی تلقین کے لیے پیش کیا جاتا رہا۔ جان اسکیلٹن نے اپنے ڈرامہ **Magni-ficience** میں جنت اور جہنم کے قدیم تنازعہ کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ بزرگ شخص کو اسے سبق دینا مقصود تھا۔ ڈرامہ کا ہیرو اپنے بُرے صلاح کاروں کے ہاتھ برباد ہو کر خودکشی کی طرف آمادہ تھا مگر "امید" اور "صبر" نے اس کی غمگساری کی اور وہ دوبارہ اچھے انسانوں میں شامل ہو گیا۔ "عناصرِ اربعہ" **The Four Elements** میں مصنف نے جغرافیہ، سائنس اور تمام علوم پر روشنی ڈالی ہے اور انگلستان میں ان علوم کے فقدان پر افسوس ظاہر کیا ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی ڈرامہ کے سلسلہ میں "ہے وُڈ" **Heywood** کے مزاحیہ خاکوں **Interludes** کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس نے مذہب اور اصلاح کو بالائے طاق رکھ کر محض تفریح کی غرض سے ڈرامے لکھے۔ "دانا اور نادان" **Witty & Witless** میں دو کردار اس بات پر بحث کرتے ہیں کہ احمق ہونا زیادہ درست ہے یا عقلمند ہونا۔ "محبت" نامی ڈرامہ میں ناکام عاشق اور سنگ دل محبوبہ ایک دوسرے سے اپنی مصیبت کے زیادہ ہونے پر لڑتے ہیں۔ ان کے علاوہ دو ڈرامے **The Play Of Weather** اور **Four P's** بھی اہم خیال کیے جاتے ہیں۔

سولھویں صدی کے وسط تک انگریزی ڈرامے کم و بیش قدیم نمونوں پر ہی لکھے گئے۔ لیکن اس کے بعد ان میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈرامہ سوسائٹیوں میں اس زمانہ تک کلاسیکی ڈرامے ہی مقبول تھے۔ دیہاتوں اور قصبوں میں البتہ مزاحیہ ڈرامے رواج پا رہے تھے۔ ان کو آوارہ پیشہ ور ایکٹر گھوم گھوم کر لوگوں کو دکھاتے تھے۔ ۱۵۷۴ء

میں سب سے پہلے ایک ڈرامہ کمپنی وجود میں آئی لیکن کٹر مذہبیوں کی مخالفت پر نئے تھیٹر شہر سے باہر بنائے جانے لگے۔ لندن اس زمانہ ہی میں فنِ ڈرامہ کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں کلاسیکی ڈراموں کے ساتھ دیہات کے مزاحیہ اور رکیک ڈرامے بھی پیش کیے جاتے۔

کلاسیکی اثرات کے تحت سب سے پہلے "اُوڈل" Udall نے ۱۵۳۳ء میں پلاؤٹس (لاطینی طربیہ نگار) کے نمونہ پر انگریزی میں Ralph Roister Doister نامی طربیہ ڈرامہ لکھا۔ اس کے کردار کلاسیکی اور انگریزی دونوں ہیں۔ ڈرامہ کا ہیرو ر الف پرلے درجہ کا احمق ہے۔ اس پر محبت کا بھی جنون سوار ہے جس کا اظہار وہ آنسوؤں سے کیا کرتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلچسپی اپنی محبوبہ کے جہیز سے ہے جس سے اس کی آئندہ زندگی کی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اس کا نائب کلاسیکی طربیہ کا کردار ہے جو ہمیشہ خوشامد کر کے اپنی روزی چلاتا ہے۔

Gammergurtion's Needle (۱۵۷۵ء) بھی اس زمانہ کا نمایندہ طربیہ ڈرامہ ہے جس میں ایک سوئی کی تلاش میں سارے گاؤں میں ہنگامہ مچ گیا اور بدذات کرداروں نے خوب خوب کمالات دکھائے۔

کلاسیکی ڈرامہ کا اثر "المیہ" Tragedy پر بھی پڑا۔ اطالیوں اور فرانسیسیوں کی طرح انگریز بھی یونانی ڈرامہ کے برخلاف لاطینی ڈرامہ اور بالخصوص سینکا Seneca سے زیادہ متاثر ہوئے۔ سینکا ایک خطرناک پیشرو تھا۔ اس کے ڈراموں میں خطیبانہ انداز غالب تھا اور یونانی دیو مالا میں بدلے ہوئے روپ میں ملتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے یہاں طویل مکالموں کی وجہ سے حرکتِ عمل کا پتہ نہیں ملتا۔ اس کے باوجود ۱۵۵۹ء اور ۱۵۶۶ء کے درمیان اس کے المیہ ڈرامے ترجمہ کیے گئے اور مختلف اسٹیجوں پر پیش بھی کیے جاتے رہے۔ انگریزی کے پہلے المیہ ڈرامہ "گاربوڈک" Garboduc میں مصنفین یعنی سیکول اور نارٹن نے سینکا سے کھلے طور پر استفادہ کیا ہے۔ گاربوڈک اپنا تخت اپنے دو شاہزادوں کے لیے چھوڑ دیتا ہے لیکن وہ آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ ایک شاہزادہ کی موت کے بعد اس کی ماں دوسرے شاہزادے کو بھی مروا ڈالتی ہے۔ اس پر عوام مشتعل

ہو کر بادشاہ اور ملکہ دونوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں جس سے سارے ملک میں طوائف الملوکی اور بدنظمی پھیل جاتی ہے۔ اس ڈرامہ میں قتل و غارت کی اس قدر بہتات ہے کہ طبیعت گھبرانے لگتی ہے لیکن مصنف اس کے ذریعہ حکومت کے لیے صحیح جانشین کی تلقین کرتے ہیں اور خانہ جنگی اور بدعنوانی کی خرابیوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ "گاربوڈک" کو انگریزی ڈرامہ میں خاص اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ کڈ Kyd کے "اسپینی المیہ" Spanish Tragedy سے پہلے اس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا المیہ ڈرامہ نہیں تھا۔ جانشینی اور خانہ جنگی کے مسائل پر جو روشنی یہاں ملتی ہے وہ انگریزی ڈرامہ میں اسکے بعد شیکسپیر کے "شاہ لیئر" King Lear ہی میں نظر آتی ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے ابتدائی دور سے لے کر سولھویں صدی کی آخری دہائیوں تک فن ڈرامہ نے بڑی ترقی کر لی۔ اس کے بعد ملکہ الزبتھ کے عہدِ زریں کے ڈرامہ نگاروں اور جیمس اوّل کی سرپرستی میں بڑھنے والے فنکاروں نے اس فن کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔ ۱۵۸۰ء سے ۱۶۴۲ء تک ڈرامائی تصانیف کی کثرت اور تنوّع کے پیش نظر ان کی تقسیم بہت مشکل ہے۔ اس دَور میں محض تماشہ" Pagent "وحشت" Horror اور "انتقام" Revenge جیسے موضوعات پر مبنی ڈراموں کو وہی اہمیت حاصل تھی جو کلاسیکی، رومانی اور خانگی ڈراموں کو حاصل تھی۔ اطالوی اور فرانسیسی اثرات کے ساتھ انگریزی قومی زندگی میں جو توانائی اور رنگینی آ گئی تھی ان کا اثر بھی ڈرامہ کی ترقی پر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ، طربیہ، تواریخی، مزاحیہ اور گھریلو ڈراموں کی متعدد قسمیں ہمیں اس دَور میں ملتی ہیں۔

نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ کی ترقی کے جہاں بہت سے اسباب ہیں۔ وہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے اسٹیج نسبتاً سادہ ہوتے تھے۔ انھیں "کھلا تھیٹر" Open Air Theatre کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ان میں آج کل کے تھیٹروں کی طرح منظر نگاری اور حقیقت آفرینی کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی تھی۔ تماشے عام طور سے سہ پہر کو ہوا کرتے اور مختلف مناظر کے لیے چند پردے کافی ہوتے تھے۔ اس زمانہ کے تماشائیوں میں بھی تلطف نماشہ کا مذاق خوب تھا۔ ڈرامہ نگار اگر دن کے وقت آسمان میں

تاروں کے نام گنانا یا اسٹیج کو باغ عدن کا ایک حصہ قرار دیتا تو کسی کو تعجب نہیں ہوتا تھا۔ اس تخیلی ہمدردی سے نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ میں جو شاعری اور ظرافت ممکن ہوسکی وہ کسی اور زمانہ میں نہیں ہوئی۔ تماشائیوں میں بھی مختلف مزاج اور طبیعت کے لوگ موجود تھے۔ اس لیے اعلیٰ اور پست خیالات کو یکساں اہمیت دی جاتی۔ انگریزی المیہ ڈراموں میں طربیہ مناظر کو عوام بڑی دلچسپی سے انگیز کر لیتے۔ مارلو کا ڈاکٹر فاسٹس Doctor Faustus اور شکسپیر کے بیشتر المیہ ڈرامے اس کی نظیر ہیں۔ المیہ اور طربیہ کے اس میل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزی ڈرامہ پر فرانس کی طرح کلاسیکیت کا غلبہ نہیں رہا۔ انگریز ڈرامہ نگار بہت حد تک یونانی اور اطالوی ڈرامائی اصولوں سے بے نیاز رہے۔ ان کے سامنے فن کا سب سے بڑا معیار یہ تھا کہ لوگوں کی تفریح کا سامان کیا جائے۔ چنانچہ جب تک وہ اس مقصد میں کامیاب رہتے انھیں قدماء کی تقلید کی فکر نہیں ہوتی۔ انگلستان میں مذہبی اور سیکولر، قومی اور یورپی، کلاسیکی اور رومانی اثرات نے ڈرامہ کو وہ تنوع اور وسعت بخشی کہ یہ دنیا کے ادب میں آج تک ممتاز ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ نگاروں میں سب سے ممتاز شخصیت اگرچہ شیکسپیر Shakespeare کی ہے لیکن اس کے پیشروؤں کے کمالات بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں۔ للی، پیل، گرین اور کڈ اور مارلو نے ڈرامہ کے فن اور اسلوب میں جو جدتیں پیدا کیں۔ ان کے بغیر دورِ ایلزبتھ کے ڈرامہ کا تصور محال تھا۔ ان پانچوں پیشروؤں کو "یونیورسٹی کے شعراء" University Wits کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

(۱) جان للی (۱۵۵۴ء سے ۱۶۰۶ء تک)

للی کے ڈراموں میں ہمیں سب سے پہلے انگریزی ڈرامے کے تربیت یافتہ نمونے ملتے ہیں۔ Eupheus کے مصنف کی حیثیت سے وہ دربار اور عوام دونوں میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ درباری تعلقات کی بنا پر اس کے ڈراموں میں درباری فضا اور شاعرانہ ہم آہنگی ملتی ہے۔ ان میں اس کا خطاب بیشتر رؤسا اور ان کی بیگمات سے ہے۔ انھیں پڑھنے سے یہ مشکل سے یقین ہوتا ہے کہ وہ مارلو کے "تیمور لنگ" اور کڈ کے "اسپینی المیہ" جیسے خونی ڈراموں

کے دور میں لکھے گئے ہوں گے ۔ لِلی کے خاص کارناموں میں Sapho & Phao (۱۵۸۴ء)، Endymion (۱۵۸۸ء)، Midas (۱۵۸۹ء)، Mother Bombia (۱۵۹۰ء) اور The Woman In The Moon (۱۵۹۴ء) مشہور ہیں ۔ ان میں سوائے موخرالذکر کے سارے ڈرامے نثر میں ہیں ۔

لِلی کے فن میں جدت اور تخلیقی اُپج کو نمایاں دخل ہے ۔ اس نے روایتی افسانوں کی حقیقت اور لاطینی ڈراموں کی پیچیدگی کے ساتھ اخلاقی ڈراموں کی تمثیل سے اپنے مخصوص رومانی ڈرامے لکھے ۔ ان کا اثر شیکسپیر کے ابتدائی طربیہ ڈراموں میں محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

(۲) جارج پیل (۱۵۵۸ء سے ۱۵۹۸ء تک)

لِلی کی طرح پیل نے بھی ایک درباری کی حیثیت سے زندگی شروع کی ۔ اسے بھی تکلف اور نفاست کا بہت خیال رہتا تھا ۔ اس لیے اس نے انھیں اپنی ادبی تخلیقات میں ملحوظ رکھا ۔ دربار میں اس کی اوباشی ناقابلِ اصلاح حد تک بڑھ چکی تھی اس لیے وہ آکسفورڈ چلا گیا ۔ اور وہیں سے درباری شاعر اور ڈرامہ نگار کے فرائض انجام دیتا رہا ۔

پیل کا سب سے پہلا ڈرامہ Arraignment Of Paris (۱۵۸۰ء) ہے جو مرغزاری دیومالا پر مشتمل ہے ۔ یہاں اسپنسر کے بارہ ماسہ کا رنگ غالب ہے ۔ اگرچہ پیل اسپنسر کی ادبی نفاستوں اور شاعرانہ بلندیوں کو نہیں پہنچ سکا لیکن اس کے یہاں غنائیت اور سلاست ملتی ہے ۔ David & Bathsheb میں اخلاقی اور مذہبی ڈراموں کا اثر نمایاں ہے لیکن یہاں پیل خدا اور شیطان دونوں کا منکر ہو گیا ہے ۔ اس کا سب سے کامیاب ڈرا The Old Wive's Tale ہے جس میں ایک رومانی داستان طنزیہ ڈرامہ میں بدل گئی ہے ۔

پیل درحقیقت ایک شاعر تھا جو غنائی نظموں کے لیے موزوں تھا ۔ اس نے اپنے دور کے رواج کے اثر سے ڈرامے لکھے ورنہ اسے اس صنف سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا ۔ اس کے ڈراموں کی بھی اہمیت کوئی خاص نہیں لیکن انگریزی ڈرامہ کی تاریخ میں اس کا مقام مسلّم ہے ۔

(۲) رابرٹ گرین (۱۵۵۸ء سے ۱۵۹۲ء تک)

گرین دورِ الیزبتھ کے ادیبوں میں "ہر فن مولا" کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے شاعری بھی کی، ناول بھی لکھے۔ اور صحافت کے ساتھ ڈرامہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ ۱۵۸۹ء کے قریب وہ ناول سے ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوا اور مارلو کی تقلید میں Alphonsus اور Orlando Furioso بھی لکھے۔ لیکن ان میں سوائے چیخ و پکار کے مارلو کے فن کا کوئی پہلو اجاگر نہیں ہوتا۔ Friar Bacon دوسرا مشہور ڈرامہ ہے جس میں جادوگروں کو بادشاہوں اور درباریوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ James IV (۱۵۹۱ء) گرین کا آخری ڈرامہ ہے جس میں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے بادشاہوں کو پرستان کے شاہ اوبران Oberon کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

گرین کے ڈراموں کی اہمیت اس کی رومانیت، درباری نفاست اور اسلوبِ بیان کی نرمی کے باعث ہے۔ اس کے رومانی ڈراموں سے شیکسپیئر نے شبانی اور پرستانی روایات کو لے کر کئی اعلیٰ درجہ کے ڈرامے لکھے۔

(۳) طامس کِڈ (۱۵۵۷ء سے ۱۵۹۵ء تک)

کِڈ کا شمار ان خوش نصیبوں میں ہے جو محض ایک تصنیف کی بنا پر شہرتِ عام و بقائے دوام کے مستحق قرار دیے جاتے ہیں۔ اس کا ڈرامہ "اسپینی المیہ" Spanish Tragedy دورِ الیزبتھ کے شاہکاروں میں ہی نہیں ہے بلکہ تمام انگریزی ڈرامہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیکسپیئر نے اپنے تماشائیوں میں بیشتر کو محض تماشہ اور شور و غل کا دلدادہ بتایا ہے۔ ان کو اسٹیج پر اعلیٰ خیالات اور فنی کمالات سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ ظاہری نمائشوں اور سوانگوں سے خاص رغبت تھی۔ ایسے لوگ پُرہیبت ڈراموں Melodrama میں قتل و غارت اور وحشت ناک مناظر کو بہت پسند کرتے تھے۔ دورِ الیزبتھ کے ڈرامہ نگاروں میں کِڈ سب سے پہلا فنکار ہے جس نے تمام ادبی اور فنی نفاستوں کے ساتھ عوام کی اس مانگ کی بھی تکمیل کی۔ اس نے "انتقام" کا موضوع اپنے محبوب لاطینی ڈرامہ نگار سینکا سے لیا لیکن

کردار نگاری اور ماحول کی عکاسی اس کا اپنا کارنامہ ہے۔ ڈرامہ کا مرکزی پلاٹ ہائترانمو کے جذبہ انتقام پر مبنی ہے جو اپنے لڑکے ہوریشیو Horatio کے سفاکانہ قتل پر پاگل ہو جاتا ہے اور جس کی ذہنی اور عملی حرکات سے ساری ٹریجڈی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ نقادوں نے شیکسپیر کو ہملٹ" Hamlet میں کِڈ کا خوشہ چین قرار دیا ہے۔

(۵) کرسٹفر مارلو (۱۵۶۴ء سے ۱۵۹۳ء تک)

اگر شیکسپیر دورِ ایلزبتھ کے ڈرامہ نگاروں کا بادشاہ ہے تو ہم مارلو کو بجا طور پر "بادشاہ گر" King Maker کہہ سکتے ہیں۔ اِس لیے کہ مارلو کے بغیر شیکسپیر کا تصور مشکل تھا۔ مارلو کی زندگی میں جس قدر لاابالی پن تھا اسی قدر اس کا ذہن بھی پُرشور تھا۔ اس کی قبل از وقت موت نے تو گویا ایک ولولہ انگیز زندگی کا ہی خاتمہ کر دیا۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اپنے قیام کے دوران سے ہی مارلو اپنی ذہانت اور علمیت کے ساتھ اپنی دہریت کے لیے مشہور تھا۔ اس کے ان رجحانات کا عکس اس کے ڈراموں میں پُوری طرح ملتا ہے۔

مارلو کی تصنیفات کا سلسلہ ۱۵۸۷ء سے ۱۵۹۳ء تک رہا جس میں تراجم اور منظومات کے علاوہ "تیمور لنگ" Tamburlaine "ڈاکٹر فاسٹس Faustus "مالٹا کا یہودی" The Jew Of Malta اور ایڈورڈ دوئم Edward II اس کی ذہانت اور ڈرامائی فنکاری کی دلیل ہیں۔

"تیمور لنگ" مارلو کا پہلا شاہکار ہے جو چودھویں صدی کے تاتار سردار کی سپاہیانہ زندگی اور غازیانہ مہمات پر مبنی ہے۔ تیمور حکومت کا جس قدر حریص ہے اسی حد تک تاخت و تاراج کا بھی شائق ہے۔ اس کے اندر طاقت اور جبروت کے ایسے عناصر کارفرما ہیں کہ وہ دیوتاؤں کو بھی چیلنج کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔ "زینو کریٹ" Zeno Crat اس کی محبوبہ ہے جس کی موت پر وہ چودہ طبق ہلانے پر آمادہ نظر آتا ہے۔

"ڈاکٹر فاسٹس" میں مارلو نے ٹیوٹانی دیومالا Teutonic Legend سے اپنا مواد حاصل کیا۔ اس ڈرامہ میں اس نے ایک مشہورِ عالم کی گمراہیوں کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ فاسٹس کی فضیلت کا شہرہ چاروں طرف تھا۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھا۔

اسے حاضرات یعنی مردوں کی روح بلانے کا ارمان تھا جس سے اس کی تمام خواہشیں پوری ہو سکتیں۔ اس سودے میں اس نے اپنی روح شیطان کے ہاتھوں بیچ دی اور بالآخر ایک مقررہ میعاد کے بعد واصلِ جہنم ہوا۔

"مالٹا کا یہودی" ایک لالچی اور عیار یہودی کے جذبۂ انتقام پر مبنی ہے جس سے آیندہ شیکسپیر نے "وینس کے سوداگر" The Merchant Of Venice میں استفادہ کیا۔

"ایڈورڈ دوئم" میں پہلی دفعہ تاریخ کو ڈرامہ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں پھر مارلو تمام تاریخی ڈرامہ کا بانی نظر آتا ہے شیکسپیر نے اپنے مشہور تاریخی ڈراموں کی بنیاد انھیں خطوط پر ڈالی۔

مارلو اپنے زمانے کا بہت بڑا فنکار ہے۔ اس کے فن میں چند ایسی خصوصیات ہیں۔ جو اسے تمام معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں :-

(۱) غازیانہ موضوع۔ مارلو نے نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ کو اخلاقی اور تمثیلی ڈراموں کے دلدل سے نکال کرنے اور بالخصوص رزمیہ موضوعات سے روشناس کیا۔ تیمور لنگ فاتح عالم ہے ڈاکٹر فاسٹس تمام علوم پر تبحر رکھتا ہے اور مالٹا کا یہودی اپنے حرص اور سفاکی میں اپنی قوم کا نمائندہ ہے۔ مہمات کی تلاش، محبت و نفرت کے جذبات، مثالی حسن اور انسانی زندگی کی عظمت اور بے ثباتی ہی اس کے مخصوص موضوعات تھے جن سے تخیل انسانی کو بالکل نئی دنیا کا احساس ہوتا ہے۔

(۲) کردار نگاری۔ مارلو کی کردار نگاری میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس کے مرکزی ہیرو کے سامنے دوسرے کردار بے جان معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے کِڈ Kyd کے ساتھ ایسے افراد کی تخلیق کی جو بجائے خود جذبات اور احساسات کی دنیا ہیں مگر جن کے سینوں میں عام انسانی دلوں کی دھڑکنیں موجود ہیں۔

(۳) نشاۃ الثانیہ کی نمائندگی۔ ذہن اور مزاج سے مارلو اپنے زمانہ کا نمایندہ تھا۔ اس کے ڈراموں میں نہ صرف اس کی شخصیت کے بہترین عناصر ملتے ہیں بلکہ نشاۃ الثانیہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں کی بھی نمایندگی ہوتی ہے۔ خیالات کی بلندی، خواہشات اور جذبات کی شدت، حسن کی تلاش اور خواب آور لذتوں کے احساس سے اس کے تمام شاہکار ممتاز ہیں۔

(۴) رومانی المیہ کا خالق۔ یہ امر بلا مبالغہ صحیح ہے کہ مارلو اور کِڈ نے سب سے پہلے نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ نگاروں کو المیہ کا شعور دیا اور شیکسپیر اور ویبسٹر Webster جیسے فنکاروں کے لیے راہ بھی ہموار کی۔ مارلو لاطینی ڈرامہ سے بہت متاثر تھا اس لیے اس کے یہاں سینکا Seneca کا رنگ غالب نظر آتا ہے لیکن اس کے ڈراموں میں نفسیاتی تجزیہ Psychological Analysis اور ذہنی کشمکش Mental Tension بھی نمایاں ہیں جو اس کی شخصیت کی غماز ہیں۔

مارلو نے اپنی جدت اور ذہانت سے انگریزی ڈرامہ کو بہت بلندی پر پہنچا دیا لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ نظم معریٰ Blank Verse کے ذریعہ انگریزی ڈرامہ کی خدمت تھی۔ متقدمین کی کوششیں اس سلسلہ میں زیادہ بار آور نہیں ہو سکی تھیں مگر کِڈ اور مارلو نے گویا ایسی کنجی حاصل کر لی جس سے بیان و اسلوب کے تمام خزانے دستیاب ہو سکیں نظم معریٰ کی مقبولیت اور وسعت، سلاست اور موسیقیت میں جس حد تک مارلو کا ہاتھ ہے۔ اتنا شاید ہی کسی اور ڈرامہ نگار کا ہو۔ گوئٹے اور بائرن جیسے ادیبوں اور شاعروں نے اسے جو خراج عقیدت پیش کی ہے وہ تاریخی ہے۔ سوئنبرن نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "مارلو انگریزی المیہ کا باوا آدم، نظم معریٰ کا خالق اور شیکسپیر کا استاد اور رہنما تھا!"

شیکسپیر (۱۵۶۴ء سے ۱۶۱۶ء تک)

نشاۃ الثانیہ نے یورپ کے ادب میں جو تخلیقی روح پھونکی اس کی سب سے نکھری شکل انگریزی ڈرامہ ہے مگر انگریزی ڈرامہ کو خالص اخلاقی اور مذہبی موضوعات سے آزاد کر کے حیات و کائنات کے مطالعہ اور انسانوں کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرنے والوں میں شیکسپیر یکتائے روزگار ہے۔

شیکسپیر اسٹریٹفورڈ Startford کا باشندہ تھا۔ آغاز جوانی میں اپنی بے راہ روی کے باعث وہ لندن آیا۔ جہاں وہ معمولی حیثیت سے تھیٹر کی دنیا میں داخل ہوا۔ اگرچہ شیکسپیر کی ابتدائی تعلیم نامکمل اور ناقص رہی لیکن انسانی فطرت کو قوتِ مشاہدہ اور زورِ تخیل سے اس نے جس تنوع کے ساتھ پیش کیا وہ یقیناً ایک خلاق ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے فن کو

سمجھنے کے لیے اس کی پوری شخصیت اور اس کی ساری تصانیف کا مطالعہ لازمی ہے کیونکہ اس نے تاریخی، رومانی اور المیہ ڈرامے لکھے اور تقریباً بیس سال تک تھیٹر کی دنیا میں حکومت کی شیکسپیر ذہنی اعتبار سے تاریخ اور سیاست سے زیادہ فن کے تخلیقی اقدار کا قائل رہا۔ اس نے انسانی زندگی اور فطرت پر جو حکم لگائے وہ ابدی اور آفاقی ہیں۔ دنیا کے دوسرے بڑے ادیبوں کی طرح اس کا فن بھی حسن و عشق اور خیر و شر کے گرد مرکوز رہا۔ لیکن اس نے جس جدت، ژرف نگاہی اور وسیع المشربی کا اظہار کیا ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

انگریزی ادب کی تاریخ میں شیکسپیر کی آمد تعجب انگیز حد تک دلچسپ ہے۔ تیشس Nashe اور اس کے دوست University Wits جو دبستانی ادب کے قائل تھے۔ ابھی مارلو کی خادیانہ فتح سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ "عامیوں کے طبقہ" سے ایک معمولی کردار نے ان کی شہرت کو دھندلکے میں ڈال دیا۔ یہ وہی شیکسپیر تھا جس کے خلاف گرین نے فتوے صادر کیے تھے۔

تواریخی ڈرامے

شیکسپیر کو اپنے تماشائیوں کی تفریح اور ان کے جذبات کا پورا خیال رہتا تھا لہٰذا اس نے ان کے مذاق کے پیشِ نظر انگریزی تاریخ سے اپنے ڈراموں کا مواد فراہم کرنا شروع کیا جن کی مقبولیت خواص اور عوام میں یکساں تھی "ہنری ششم" Henry VI کی تین جلدیں انگریزی تاریخ کے رزمیہ کارنامے ہیں۔ ان میں قدیم تاریخی تذکروں Chronicles کا رنگ غالب ہے مگر ان میں تخلیقی جدت سے زیادہ تقلیدی اثرات نمایاں ہیں۔ ان کے بعد "رچارڈ دوم" Richard II اور "رچارڈ سوم" Richard III میں شیکسپیر نے تواریخ کو المیہ میں بدل دیا۔ تاریخی ڈراموں میں "ہنری چہارم" Henry IV سب سے ممتاز ہے جس میں مصنف نے فالسٹاف Flastraff جیسے بے نظیر مزاحیہ کردار کو پیدا کیا۔ "ہنری پنجم" Henry V سوانگ اور تماشہ کے علاوہ فنی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ یہاں ہمیں اس دور کے انگلستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا صحیح خاکہ ملتا ہے۔

شیکسپیر نے اپنے تاریخی ڈراموں کے مواد کے لیے اگرچہ ہالنشیڈ Holinshed

کے تاریخی تذکروں کا سہارا لیا مگر اس نے انھیں اپنے طریقہ پر برتا۔ان تواریخی ڈراموں میں مصنف کا مقصد ہلٹن کی طرح "وفاداری" کا سبق پڑھانا تھا۔کیونکہ غیر مستحکم حکومت میں طوائف الملوکی اور بدعملی کا خطرہ لاحق رہتا ہے جو تہذیب و تمدن کے لیے مضر ہے۔

رومانی طربیہ ڈرامے "ہنری چہارم" میں فالسٹاف کا کردار پیدا کرنے کے بعد شیکسپیر کی طربیہ نگاری نے فروغ پانا شروع کیا اور اس کی مزاحیہ طربیہ نگاری تربیت پانے لگی۔ لیکن اس نے تاریخی ڈراموں سے پہلے بھی طربیے لکھے تھے۔ "کار محبت" Love's Labour Lost غالباً مصنف کا سب سے پہلا طربیہ ڈرامہ ہے۔جس میں اس نے درباری زندگی اور مہذب سماج کے نقشے پیش کیے ہیں۔اس ڈرامہ میں محبت کے گرفتاروں پر شیکسپیر نے جو طنز کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ "ویرونا کے شرفاء The Two Gentlemen of Verona رومانی طربیہ کی پہلی مثال ہے لیکن اس کے فوراً بعد کلاسیکی نمونہ پر لکھی ہوئی The Comedy of Errors منظر عام پر آئی جس میں مزاحیہ پہلو جڑواں بھائیوں Twins کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔اسی دور کے ڈراموں میں The Taming of the shrew بھی شامل ہے۔ابتدائی دور کے رومانی ڈراموں میں A Midsummer Night's Dream شیکسپیر کا شاہکار مانا جاتا ہے۔مصنف نے اس ڈرامہ میں جس قدر جدت اور فنکاری سے کام لے کر تفریح کا سامان پیدا کیا ہے وہ دوسرے ڈراموں میں کم ملتا ہے۔ڈرامہ میں پریوں کی شرکت اور دیہاتی ماحول کے باعث رومانیت کامیابی کے آخری حدود چھونے لگتی ہے۔

فن میں جس قدر پختگی آتی گئی اسی قدر شیکسپیر کی خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ As you Like It کے علاوہ Much Ado About Nothing اور Twelfth Night جیسے طربیہ شاہکاروں سے مصنف نے اپنے لیے عالمی ڈرامہ میں جگہ پیدا کر لی۔ Much Ado میں رومانی کہانی سنجیدگی کی حد تک پہنچنے لگتی ہے۔لیکن مرکزی کرداروں کی حاضر جوابی سے ہماری تفریح کا سامان ہوتا رہتا ہے۔اس ڈرامہ کا سب سے مزاحیہ کردار Dog Berry ہے جو اپنی حماقتوں سے ہمیں مستقل اپنی

جانب متوجہ رکھتا ہے۔ As You Like It کا پلاٹ بھی آرڈن کے جنگل کے باعث نہایت اہم ہے۔ وہ نواب زادیاں اس رومانی جنگل میں عشق کے سبق پڑھتی ہیں اور محبت کے دیوتا کی پرستش ان کے حق میں رحمت ثابت ہوتی ہے۔ Twelfth Night میں سمندری آفت کے مارے دو بھائی بہنوں کی کہانی ساحل الیریا پر ڈیوک آرسینو Orsino اور اس کی محبت کے پس منظر میں کہی گئی ہے۔ کہانی کا ذیلی پلاٹ — Sub-Plot سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں "مالولیو" Malvolio جیسے کٹر قسم کے مذہبی کو محبت کا شکار بنا کر شیکسپیر نے اس گروہ کی مذمت میں اپنے ہم پیشہ ادیبوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس دور کے طربیہ ڈراموں میں "وینس کا سوداگر" —— The Merchant of Venice بھی کافی مشہور ہوا۔ جس میں شائلاک نامی یہودی کی بے رحمی، بسانیو کی محبت اور پورشیا کی رفاقت قابلِ داد فنکارانہ اکتسابات ہیں۔

اس دور کے آخری ڈرامے All's Well That Ends Well اور Measure For Measure ہیں جن میں نوجوان مصنف کی روحانی پرواز رفتہ رفتہ زندگی کے حقائق اور کائنات کی تعبیرت سے بدلتی جاتی ہے۔ ان ڈراموں کو کہانیوں کے فرق اور زاویۂ نظر کی تبدیلی کی وجہ سے "تاریک طربیہ" Dark Comedies کہا گیا ہے۔ ان میں شیکسپیر رومانی طربیہ کے انداز میں المیہ موضوعات کو پیش کر رہا تھا۔

فن ڈرامہ میں شیکسپیر کا کوئی واضح اور قطعی نظریہ نہیں تھا۔ اس کے طربیہ ڈرامے معاصرین کے ڈراموں سے اس قدر مختلف ہیں کہ ہم ان کا مطالعہ انھیں کی روشنی میں کر سکتے ہیں۔ اگر شیکسپیر کے یہاں رومان، رنگینی اور ظرافت کی فراوانی ہے تو اس کے ہمعصر بن جانسن کے یہاں واقعیت کے ساتھ دلخراش طنز ملتا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامے تفریحِ طبع کے لیے لکھے گئے لیکن بن جانسن ان سے اخلاقی کام لینا چاہتا تھا۔ اسی طرح شیکسپیر کا فن یونانی اور لاطینی کلاسیکی ڈرامہ نگاروں سے بھی مختلف رہے۔ اس نے نہ تو کبھی قدماء کی کورانہ تقلید کی اور نہ ڈرامائی اصول کو فن کی معراج سمجھا۔ اس کے ڈرامے رجعتی عناصر سے بالکل پاک ہیں اس لیے کہ اس نے کبھی سماج کی اصلاح کا ٹھیکہ اپنے ذمہ نہیں لیا۔ اس کے ہیرو اور ہیروئن

مثالی مسرت کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اس طرح شیکسپیر کا نظریۂ فن عقلی اور طنزیہ نہیں بلکہ تخیلی اور شاعرانہ ہے۔

شیکسپیر کے ڈراموں میں المیہ اور طربیہ عناصر ملے جُلے ہوتے ہیں۔ اس نے حیاتِ انسانی کے مطالعہ میں اس امر کو قرینِ صحت قرار دیا کہ زندگی کا خمیر نہ تو محض آنسوؤں سے ہوا ہے اور نہ صرف مسکراہٹوں سے بلکہ ان دونوں کے امتزاج کا نام زندگی ہے۔ اپنے طربیہ ڈراموں میں شیکسپیر نے ان مشاہدات کی طرف مستقل اشارے کیے ہیں۔ **As You Like It** میں روزلینڈ **Rosalind** کا دربار سے نکالا جانا اور آرڈن کے جنگل میں بھٹکنا' آرلینڈو **Orlando** کی بھائی سے عداوت' ڈیوک کا عتاب اور جنگل میں شیرنی کے حملے سے جانبر ہونا ——— رومانی طربیہ کی بہترین مثال ہے۔

اگرچہ شیکسپیر کے بیشتر طربیہ ڈراموں کا پس منظر رومانی اور شاعرانہ ہوتا ہے لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ حقیقت سے یکسر بے نیاز تھا۔ اس کے یہاں واقعیت اور عینیت کا متوازن تصور ملتا ہے۔ وہ اپنے ڈراموں میں انجان ملکوں اور دُور دراز کے دیسوں کی سیر کراتا ہے جہاں کے سمندروں میں ہر قسم کے خطرے رونما ہوتے رہتے ہیں مگر ہیرو اور ہیروئن تمام حیرانیوں اور پریشانیوں کے باوجود ایک دوسرے کو پالینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایلیریا **Illyria** کا ساحل اور آرڈن **Arden** کا جنگل رومانی دنیا کے تخیلی نمونے ہیں۔ ان کی حیثیت محض جغرافیائی نہیں بلکہ مثالی ہے۔ یہاں روح پرور نغمات ہمیشہ انسانی کردار اور اخلاق کی تہذیب و تحسین کرتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ دورِ ایلزبتھ کے تماشائی کسی بھی مثالی ملک میں بغیر موسیقی کے امن و آشتی کا یقین کر ہی نہیں سکتے تھے۔

رومانی طربیہ کی امتیازی خصوصیت "محبت" اور اس کی کامیابی اور ناکامی کے راگ ہیں۔ جہاں انسانی ذہن کو فراغت اور آزادی حاصل ہو اور موسیقی سُنبِ در و زجذبات کو آنچ دے۔ جہاں لوگ فکرِ معاش سے آشنا اور غم و آلام سے بیگانہ ہوں وہاں "محبت" اگر ان کا شیوہ نہ ہو تو اور کیا ہوگا۔ چنانچہ محبت کی افتاد عام ہے۔ بقول چارلٹن "محبت ان طربیوں میں ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے جس پر بہادروں کی شجاعت'

احمقوں کی حماقت اور کمینوں کی رذالت کا امتحان ہوتا ہے" محبت کے یہ دیوانے عام انسانوں سے مختلف نہیں مگر ایک مخصوص ماحول میں ان کے نغمے زیادہ مسحور کن اور ان کے مصائب زیادہ روح فرسا ہوتے ہیں۔ انھیں بھی قسمت کے نشیب و فراز اور انسانوں کی بے وفائیوں سے سابقہ رہتا ہے۔ لیکن بالآخر فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی ہے اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر مثالی زندگی بسر کرتے ہیں۔

شیکسپیر کے رومانی طربیے ماحول کی پُر اسرار فضا، موسیقی اور محبت کی فراوانی کے باوجود طنز و مزاح سے بالکل عاری نہیں، وہ واقعہ اور مکالمہ میں خاص رنگ دے کر جس قسم کی بلیغ ظرافت پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اگرچہ رومانی ڈراموں میں فالسٹاف Falstaff جیسے پہلو دار کردار کے لیے جگہ نہیں مگر اس کا جانشین سر ٹوبی Toby اپنی آزاد منشی، بے پروا حرکات اور شراب و محبت کی سرشاری سے ہمیں گرویدہ کر لیتا ہے۔ اس نے اپنے حریف کو چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اگر آپ پاکدامن ہیں تو کیا دنیا سے راگ رنگ بھی اُٹھ جائے گا؟" ان منفرد مزاحیہ کرداروں کے علاوہ دیہاتی گنوار، قصبوں کے پنچ، درباری ظریف، نقال، معلم اور ناکام عشاق سے ہمیں ہنسی مذاق کے موقع ہر سین میں ملتے رہتے ہیں۔

شیکسپیر کا طربیہ دراصل ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں شریفوں کا ایک گروہ مختلف پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے مگر آخر کار ان آزمائشوں سے گزر کر اطمینان اور مسرت کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے تماشائی بھی "سنجیدہ مسرت" کا احساس لے کر تھیٹر سے باہر نکلتے ہیں۔ المیہ ڈراموں میں شیکسپیر کا مطمح نظر بے دردی کی حد تک حزینہ ہوتا ہے لیکن طربیہ کی دنیا میں وہ رحمدلی اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ جہاں بڑے چھوٹے، دانشمند اور احمق، بہادر اور بزدل سب کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ پروفیسر مولٹن نے شیکسپیر کے طربیہ ڈراموں کو "راگوں کا آہنگ" Harmony of Tones کہا ہے جہاں زندگی غم اور مسرت دونوں سے معمور نظر آتی ہے۔

المیہ ڈرامے | شیکسپیر کے المیہ ڈراموں کا زمانہ وہ ہے جب اس نے "ہملٹ"

"ہیملٹ" Hamlet "آتھلو" Othello "میکبتھ" Macbeth "شاہ لیئر" King Lear "انٹونی اور قلوپطرہ" Antony & Cleopatra اور "کوری اولینس" Coriolanus جیسی معرکتہ الآرا تصانیف سے دنیائے ادب میں ہلچل مچادی۔ یہ سارے ڈرامے سترھویں صدی کے پہلے آٹھ برسوں میں لکھے گئے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس دور سے پہلے شیکسپیر نے المیہ ڈرامے نہیں لکھے۔ سب سے پہلے اس نے اپنے تواریخی ڈراموں میں مارلو کی تقلید میں حزنیہ عناصر شامل کیے تھے۔ ان کے بعد رومانی طربیہ ڈراموں کا نمبر آتا ہے لیکن یہ ڈرامے بھی غم کے احساس سے یکسر خالی نہیں ہیں۔ "رومیو اور جولیٹ" Romeo & Juliet میں شیکسپیر نے ایک ایسے المیہ کا پلاٹ تیار کیا جو دیکھنے والوں کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ اس طرح المیہ شیکسپیر کی تخلیقی فطرت کا پیدائشی جز ہے جو آخری دور کے طربیہ ڈراموں کے علاوہ ہر دور میں نمایاں ہے۔

سترھویں صدی کے ابتدا میں شیکسپیر کا شعور اور نظریۂ کائنات کافی پختہ ہو چکا تھا۔ عارفانہ بصیرت کے ساتھ اس کی ڈرامائی صلاحیت بھی درجۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ ان ڈراموں کی بدولت آج مصنف کا شمار کلاسیکی اساتذہ میں ہونے لگا ہے۔

"ہملٹ" Hamlet اس دور پختگی کا سب سے پہلا المیہ ہے جس میں شیکسپیر کی فنکاری اور تخیل کی پیچیدگی قابل توجہ ہیں۔ اس ڈرامہ میں مرکزی کردار ایک عالم اور صاحب فکر شاہزادہ ہے جو اپنی خود بینی اور تذبذب کے باعث میدانِ عمل میں ناکام رہتا ہے۔ فنی اعتبار سے ہمیں یہاں کئی خامیاں نظر آسکتی ہیں مگر انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ کا اس سے بہتر شاہکار ابھی تک نہیں لکھا جا سکا ہے۔

آتھلو Othello میں شیکسپیر نے موضوع اور فن کو قریب تر لانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پلاٹ کی چستی اور مکالموں کی اثر آفرینی لاجواب ہے۔ آتھلو ایک مراکشی امیر ہے جو "آئیگو" Iago جیسے ننگِ آدم کردار کی غیبت اور بدگوئی سے اپنی وفاپرست بیوی ڈیسڈیمونا Desdemona جس کو حاصل کرنے کے لیے اس کو بڑے خطرات سے گزرنا پڑا تھا، قتل کر دیتا ہے۔ اس ڈرامہ میں شیکسپیر نے جس واقعیت کے ساتھ مختلف

مناظر کو منسلک کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

میکبتھ Macbeth بحیثیت ایک ڈرامہ کے دورِ ایلزبتھ میں اس قدر شہرت نہیں حاصل کر سکا جو اس کو بعد میں نصیب ہوئی۔ اس میں میکبتھ اور لیڈی میکبتھ کی بادشاہت کی ہوس، ان کی اپنے بادشاہ کے خلاف دغابازی اور ملک سے غداری کی بڑی عبرتناک تصویر کھینچی گئی ہے۔

شاہ لیئر King Lear جسے المیہ ڈراموں کا رزمیہ Epic کہا گیا ہے۔ قدیم ڈراموں سے مشابہ ہے۔ اس میں تخیل کی بلندی اور جذبات کی فراوانی کے باعث اسٹیج کی کامیابی مشکوک ہو جاتی ہے۔ لیئر انگلستان کا بادشاہ ہے جو شاہانہ زعم میں آکر اپنی دو بیٹیوں کو حکومت کا مالک بنا کر سب سے چھوٹی اور نیک بیٹی "کورڈیلیا" Cordelia کو عاق کر دیتا ہے۔ مصنف نے اس ڈرامہ میں شاہ لیئر کی ذہنی پریشانیوں اور اخلاقی پشیمانیوں کا عبرت انگیز مرقع پیش کیا ہے۔

"انٹونی اور قلوپطرہ" Antony & Cleopatra اس نوعیت سے قابل لحاظ ہے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ "محبت" خاص محرک ہے بلکہ قلوپطرہ نے ہی قصہ کی مرکزی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سیزر Csesar کے قتل کے بعد کس طرح انٹونی Antony تخت و تاج کا مالک ہو جاتا ہے اور ایک عورت کے بس میں پڑ کر اپنی جان تک دے دیتا ہے، یہی اس ڈرامہ کا پلاٹ ہے۔ مگر یہ ڈرامہ تاریخی کارنامہ ضرور ہے، فنی شاہکار نہیں۔

اگرچہ شیکسپیر کو انگریزی المیہ کی تاریخ میں موجد کا درجہ حاصل نہیں لیکن اس فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا شرف اسی کو حاصل ہے۔ سب سے پہلے اسی نے انگریزی ڈرامہ کو کلاسیکی قیود سے آزاد کیا۔ وحدتِ زمانی، وحدتِ مکانی اور دوسرے کلاسیکی اصولوں سے بے اعتنائی برتنے پر دلبستانی مصنفین نے اسے ہدفِ ملامت بنایا مگر اس نے ان کی بالکل پروا نہیں کی۔ وہ فنِ ڈرامہ میں اپنا الگ نظریہ رکھتا تھا۔ "ٹریجڈی" کا اس کے یہاں کوئی ضابطہ منشور نہیں مگر اس نے اس صنفِ ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کامیاب کوشش کی۔ شیکسپیر کے المیہ ڈرامے عموماً کسی عظیم المرتبت کردار کی زندگی کے کسی دردناک پہلو

سے متعلق ہوتے ہیں جن میں ہیرو کی اخلاقی یا دوسری بنیادی کمزوریوں اور لغزشوں کے باعث انھیں تمام پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آخر کار وہ بے بس ہو کر موت کو زندگی پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ ہملٹ، لیئر، بردٹس اور انٹونی اعلیٰ خاندانوں کے افراد ہیں لیکن ان کے کردار میں کوئی نہ کوئی "حزنیہ نقص" Tragic Flaw موجود ہے جو انھیں مصیبتوں کا شکار بناتا ہے۔ ان کی بربادیوں پر ہمارے اندر نہ صرف رحم اور خوف کے جذبات پیدا ہوتے ہیں بلکہ ہمیں نام نہاد انسانی عظمت کے کھوکھلے پن کا بھی احساس ہونے لگتا ہے اور ہم مجبور ہو کر کسی ایسی قوت کی خفیہ کارفرمائی کے قائل ہوتے ہیں جس کے سامنے دارا و سکندر کا بھی بس نہیں چلتا۔

شیکسپیر کی المیہ نگاری محض مصیبت اور موت کا وصیت نامہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں انسانی کردار کی خامیوں کو روشنی میں لاکر عقل و دانش کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہ کردار اپنی بنیادی کمزوریوں کے سبب کسی نہ کسی سانحہ کے شکار ہو جاتے ہیں اور ان سے بہت سی دوسری پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی موت کی نوبت جاتی ہے لہٰذا ہم اس کلیہ پر پہنچتے ہیں کہ "انسان کا کردار ہی اس کا مقدر ہوتا ہے"۔ شیکسپیر نے طبعاً بے ربط اور غیر معمولی کرداروں کو اپنے ڈراموں میں جگہ دی ہے لیکن وہ پیدائشی طور پر ایسے نہیں ہوتے۔ ہم ہملٹ یا لیئر کو کبھی نقص شخصیت Split - Personality اس وقت تک نہیں کہتے جب تک ان کے اعمال ان کی تباہیوں کا پیش خیمہ نہیں بن جاتے۔ شیکسپیر عہد حاضر کی "حقیقت آفرینی" Verisimilitude سے ناواقف تھا۔ لیکن اسے ہمیشہ یہ خیال رہا کہ فکر کی پرواز میں طائر تخیل کو نشیمن کا بھی ہوش رہے۔

شیکسپیر اپنے ڈراموں میں قدیم ڈرامہ نگاروں کی طرح انسان کو دیوتاؤں کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بناتا بلکہ انھیں خود ایک قوت بخشتا ہے۔ اس کے یہاں قسمت اور مقدر Destiny کا قدیم تصور بالکل بے معنی ہے کیونکہ آخری تجزیہ میں انسانی اعمال ہی اس کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ شیکسپیر فن ڈرامہ میں ملٹن کی طرح "مشیت الٰہی کا اثبات و جواز" نہیں پیش کرتا مگر اس کے حیات و کائنات کے شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ اقبالؔ نے بجا طور پر کہا ہے:۔

۵ حسن آئینہ دل اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ (ٹیگور)

آخری دَور ۱۶۰۸ء کے قریب شیکسپیر نے المیہ ڈراموں کو خیرباد کہا اور اپنے نوجوان ہمعصروں ولبسٹر اور مارسٹن کو اس میدان میں چھوڑ کر زندگی سے مفاہمت کرلی وہ اب سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر کی تلاش میں المیہ کے ہیجان و اضطراب سے نکل کر ابتدائی زمانہ کی رومانی فراغت کے لیے کوشاں نظر آنے لگا۔ چنانچہ اس کے آخری ڈراموں میں عفو اور کفارہ کے علاوہ دوسری عیسائی تعلیمات کی بھی جھلکیاں ہیں۔

The Winter's Tale کا قصہ آتھیلو کے نمونہ پر لکھا گیا ہے لیکن یہاں المیہ فضا کی جگہ دیہات کے پرسکون ماحول کو ترجیح دی گئی ہے۔ آپس کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور بچھڑے ہوئے آپس میں آن ملتے ہیں۔ اس ڈرامہ کا مصنف اب توریت اور انجیل کے "دس احکام" کی طرف متوجہ ہے اور سب ... زیادہ عفو تقصیر کا علمبردار ہے۔

The Tempest جسے شیکسپیر کا آخری ڈرامہ کہا گیا ہے انسانی فطرت کے دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ ایک طرف بے وفائیاں، بدعہدیاں اور بدکاریاں ہیں تو دوسری طرف نیکیاں اور معافیاں۔ بالآخر نیکی کو فتح ہوتی ہے اور مافوق الفطرت عناصر اس جشن میں شریک ہوتے ہیں۔ پراسپرو Prospero ایک جزیرہ میں پرسکون زندگی گزارنے کے لیے جاتا ہے لیکن اسے طرح طرح کے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بیٹی میرانڈا Miranda بھی ایک نیم وحشی Caliban کی دست درازیوں سے بچ نکلتی ہے۔ ڈرامہ کا مرکزی تصور بنیادی انسانی اقدار کی تبلیغ ہے۔

اپنی ادبی زندگی کے آخری دور میں شیکسپیر "نئے انسان" کا خواب دیکھ رہا تھا۔ جب دنیا تمام برائیوں اور کمزوریوں سے پاک ہو جائے گی اور محبت، اخوت اور عفو تقصیر کی قدر ہوگی۔ شرافت اور انسانیت کے بلیغ اشارے ان آخری ڈراموں میں بڑی خوبی کے ساتھ تمثیلی رنگ میں پیش کیے گئے ہیں۔

شیکسپیر کی عظمت: سولھویں صدی کی آخری دہائی تک انگریزی ڈرامہ تمثیلی اور اخ

ڈراموں کے دلدل سے نکل کر منضبط شکل میں آگیا تھا جس میں دورِ ایلزبتھ کے مایۂ ناز ڈرامہ نگاروں نے اپنی بے پناہ قوتِ تخیل اور قابلِ رشک جادو بیانی سے چار چاند لگا دیے شیکسپیر اپنے دور کا ترجمان اور سب سے بڑا فنکار ہے لیکن اس کی مختلف خصوصیات ایک ایک کرکے دوسرے مصنفوں کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مارلو Marlowe کے "ڈاکٹر فاسٹس" میں آخری منظر کا سوز و گداز اور اس کی شاعرانہ بلندی شیکسپیر کے بس کی بات نہیں۔ وہ ولبسٹر Webster سے زیادہ کامیابی کے ساتھ جرائم کو اپنے ڈراموں میں نہیں نبھا سکا۔ بن جانسن Ben Jonson کے "ڈرامائی شعور" کا بھی شیکسپیر کے یہاں پتہ نہیں ملتا۔ اسی طرح ڈیکر Dekkar اور فلیچر Fletcher سے طربیہ نگاری میں وہ آگے نہیں بڑھ سکا لیکن اس کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس کے اندر یہ تمام خوبیاں حسین امتزاج میں رچی بسی تھیں۔ شیکسپیر کے ذہن کی بوقلمونی، نظریہ کی ہمہ جہتی، وسعتِ خیال اور تخئیلی حقیقت بیانی اسے تمام معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شیکسپیر نے اپنے اندر متقدمین اور معاصرین کی تمام خوبیاں سمیٹ لی تھیں۔ اگر ایک طرف اس کے یہاں ابتدائی ڈرامہ کے رکیک مزاح کے چٹخارے ہیں تو دوسری طرف اس کے رجالِ افسانہ اخلاقی ڈرامہ کے کرداروں کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کے یہاں للّی کا ترصیعی اندازِ بیان، گرین کی نرمی اور گھلاوٹ، کڈ کی حقیقت پسندی اور مارلو کی اعلیٰ المیہ نگاری سب بوجہ احسن موجود ہیں۔ اس کے ڈرامے فکر اور فن کے ایسے رنگ محل ہیں جنھیں دیکھ کر ہم محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ اس کے تخلیقی راگ میں المیہ، طربیہ، مزاحیہ اور طنزیہ، رومانی اور غنائی تمام سُر ملے ہوئے ہیں جن سے وہ حسبِ ضرورت کردار نگاری، مکالمہ یا نظریۂ حیات میں اثر پیدا کرتا ہے۔ شیکسپیر کی آفاقیت کا راز یہی ہے کہ اس کے کرداروں کے اندر وہی جذبات اور احساسات کارفرما ہیں جو ہماری عام زندگی کے محرک ہیں۔ گوئٹے Goethe نے اس کے کرداروں کو شیشے کی بنی گھڑی کے پرزوں سے مثال دی ہے جنھیں دیکھ کر ہم ان کی داخلی ساخت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ کارلائل نے شیکسپیر کو فطرت کا شاہکار کہا ہے۔ اس نے ہندوستان کی حکومت اور شیکسپیر کی تصانیف میں موخرالذکر کو ہی ترجیح دی: "ہندوستان کی حکومت کبھی ختم ہو سکتی ہے، شیکسپیر لازوال ہے۔"

شیکسپیر نہ صرف دورِ ایلزبتھ کا نمایندہ ہے بلکہ اس کا فن زمان و مکاں کے قیود اور جغرافیائی حد بندیوں سے بھی آزاد ہے۔ اس کے یہاں آفاقیت اور انسانیت کے ایسے بلیغ نغمے ملتے ہیں کہ مستقبل قریب میں فطرت شاید ہی ایسے رازداں پیدا کر سکے۔ ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے اس کی تصانیف میں ایک شاعر اور حکیم کی ژرف نگاہی اور اعلیٰ فنکار کی بوقلمونی موجود ہے۔

شیکسپیر کے معاصرین اور جانشین ڈرامہ نگار

شیکسپیر کی خوش قسمتی سے اس کے بزرگ معاصرین یکے بعد دیگرے ۱۵۹۴ء تک اسٹیج چھوڑ چکے تھے۔ گرین، مارلو اور کِڈ کی موت کے بعد جو ڈرامہ نگار زندہ رہ گئے تھے انھیں تھیٹر سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے تنہا شیکسپیر اسٹیج کا شہنشاہ بنا رہا۔ ایسے جیّد صاحبِ قلم کے سامنے عامیوں کی کیا بنتی مگر چند ہمعصر ڈرامہ کے فنّی اکتسابات میں منفرد رہے جن کا مطالعہ ادبی تاریخ کے ہر طالبِ علم کے لیے دلچسپ ہو سکتا ہے۔

(۱) بن جانسن (۱۵۷۳ء سے ۱۶۳۷ء تک)

شیکسپیر کا سب سے زیادہ قوی اور موثر ہم قلم بن جانسن ہے۔ لیکن اس کی حیثیت شیکسپیر سے بالکل مختلف ہے۔ جانسن کلاسیکی ادب کا دلدادہ، اخلاقیات کا معلّم اور ڈرامہ کا مصلح تھا۔ اس کی تخلیقات میں ہم کو روحِ عصر اور نظریات کے علم کے علاوہ لندن کی معاشرتی زندگی کے طنزیہ خاکے بھی ملتے ہیں۔ وہ ڈیکر، مارسٹن، مڈلٹن اور وبسٹر وغیرہ ڈرامہ نگاروں کی نسل کا آدمی تھا اس لیے بسیار نویسی اور ادبی چھیڑ چھاڑ اس کی شخصیت کے اہم پہلو ہیں۔

جانسن دَورِ ایلزبتھ کے ادب میں اس خاص عہد سے متعلق ہے جب کہ رومانی طربیہ کی ہماہمی اور تخیل کی بے لگام پرواز کے بعد مصنّفین عوام کی زبان میں عام موضوعات پر اس طرح اظہارِ خیال کرنے لگے تھے جیسے ساری انگریز قوم جشنِ مسرت سے واپسی کے بعد روزمرّہ کے کاموں میں لگ گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں کو دُور دراز ملکوں، رومانی ساحلوں، مہیب جنگلوں اور سات سمندر پار جزیروں سے وہ شغف نہ ہوگا جو ان کے پیش روؤں کو رہا ہوگا۔ انگریزی ڈرامہ میں حقیقت پسندی کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔ بن جانسن

معلم اور مصلح پہلے تھا اور فنکار بعد کو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں معاشرتی زندگی کے جو خاکے ملتے ہیں۔ وہ شیکسپیر کے وہاں نہیں ملتے۔ بن جانسن اپنے دور کا مورخ ہے، شیکسپیر آفاقی مسائل کا عقدہ کشا اور اپنے زمانہ کا نمایندہ۔

بن جانسن نے فن ڈرامہ کا ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ کیونکہ اس نے سوانگ لکھے اور طربیہ، المیہ اور فشاشیہ وغیرہ بھی تصنیف کیے۔ اس کے سوانگ عوامی گیتوں اور کلاسیکی تشبیہوں سے مملو ہیں لیکن اس کی شہرت طربیہ ڈراموں کی وجہ سے ہے۔ طربیہ نگاری میں بن جانسن نے رومانی روایات سے بغاوت کی اور کلاسیکی نمونوں پر اپنی تصانیف کی بنیاد رکھی شیکسپیر کے مرکزی کرداروں کی طرح اس کے ہیرو امراء اور شاہزادے نہیں ہوتے۔ وہ عام زندگی سے اپنے کردار منتخب کرتا ہے جن میں ٹھگوں، بدمعاشوں، احمقوں اور چوروں کو مرکزی حیثیت حاصل رہتی ہے۔ اسی طرح اس کے زنانہ کرداروں میں لندن کی گلیوں میں رہنے والی عورتیں اور معمولی گھروں کی لڑکیاں یا دیہاتی بیویاں ہوتی ہیں۔

Everyman In His Humour (۱۵۹۸ء) بن جانسن کا پہلا کامیاب طربیہ ہے جس میں اس کے تمام کلاسیکی اور ڈرامائی رجحانات کا پتہ ملتا ہے۔ وہ ہمیں بدمزاج لوگوں کے ایک گروہ سے روشناس کراتا ہے جو اپنی اپنی بات منوانے پر مصر ہیں۔ مُصنّف ان کرداروں کے مزاج کے غالب عنصر Humour کو روشنی میں لاکر انھیں مضحکہ خیز بناتا ہے۔

Everyman Out Of His Humour (۱۵۹۹ء) میں ڈرامہ نگار نے بدمزاج کرداروں کی دوسری جماعت پیش کی ہے جس سے اس کا مقصد ان خرابیوں کا ازالہ ہے۔ وہ سماج کی مروّجہ بُرائیوں کو اپنے "فولادی کوڑے" سے ختم کرنا چاہتا ہے۔

۱۶۰۵ء سے ۱۶۱۴ء کے درمیان لکھے ہوئے چار طربیہ ڈرامے نہ صرف بن جانسن بلکہ تمام نشاۃ الثانیہ کی ڈرامائی تصانیف میں اہم ہیں۔ یہاں مُصنّف نہ صرف طنزیہ انداز میں اپنے مخصوص کرداروں کا مذاق اڑاتا ہے بلکہ اپنے منطقی ذہن سے مشاہدہ اور تخلیق کا بھی حق ادا کرتا ہے۔ یہاں کرداروں کے مطالعہ کے علاوہ معاشرتی زندگی کے لازوال چربے موجود ہیں۔

Valpone ایک بڈھے، بے اولاد زر پرست کا افسانہ ہے جو مرنے سے پہلے اپنے تمام جانشینوں سے طرح طرح کی بھینٹ لیتا ہے۔ ان میں سے ایسے کردار بھی ہیں جو دولت، عزت اور اپنی بیویوں تک کو اس کی خدمت میں حاضر کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

Epicoene میں اپنی ذات میں کھوئے ہوئے ایک تنہائی پسند کنوارے کی زندگی کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ ہیرو ماروس Morose جسے ہر قسم کے شور و غل سے سخت نفرت ہے کسی وجہ سے اپنے بھتیجے سے ناراض ہوکر اسے وراثت سے محروم کرنے کے لیے شادی رچانے کی سوچتا ہے۔ اس کے چند خیر خواہ اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے کرا دیتے ہیں جو بظاہر گونگی ہے مگر شادی کے بعد اپنی شعلہ بیانیوں سے ہیرو کو نڈھال کر دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ہمنوائی کے لیے حجاموں، گرہ کٹوں اور بانکوں کا پورا گروہ بھی آجاتا ہے جس سے عاجز آکر بیچارہ ہیرو طلاق پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی منکوحہ ایک لڑکا ثابت ہوتی ہے۔ اور اس طرح بھتیجے کو ساری جائداد مل جاتی ہے۔

The Alchemist دورِ ایلزبتھ کے تمام حقیقت پسند طربیہ ڈراموں میں مخصوص مقام رکھتا ہے کیونکہ اس میں شاہی بنک Royal Exchange اور تجارتی زندگی کے ساتھ عام لوگوں کی رہن سہن، اخلاق اور ذہنیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ لندن کے طاعون سے گھبراکر ایک مالکِ مکان دیہات چلا جاتا ہے اور اپنے نوکر کو سب کچھ سونپ جاتا ہے۔ نوکر اپنا نام بدل لیتا ہے اور چند عیاروں اور بدچلن عورتوں کے ساتھ مل کر کیمیاگری کے بہانے احمقوں کو لوٹتا ہے۔ دولت کی ہوس میں عدالتی کلرکوں سے لے کر بازار کے بنیوں، دیہاتی رئیسوں اور مذہبی مصلحوں کی بھیڑ وہاں لگی رہتی ہے۔ ان سب کو "پارس پتھر" کی تلاش ہے۔ بالآخر جب مالکِ مکان واپس آتا ہے تو تمام بدمعاشوں کو مار بھگاتا ہے۔ نوکر اپنی جان بچانے کے لیے اپنی داشتہ سے اس کی شادی کر دیتا ہے۔

Barthalomew Fair میں بن جانسن نے فن ڈرامہ کے دشمن کٹر عیسائیوں Puritans کا مذاق اڑایا ہے کہ کس طرح وہ گناہ کو مذہبی کتابوں کی روشنی میں خود کرتے ہیں اور عوام کو اس کے برعکس تلقین کرتے ہیں۔

بن جانسن نے کامیڈی میں اپنا نظریہ مرتب کیا جسے "طبعی طربیہ کا نظریہ" Theory Of Humour Comedy کہتے ہیں۔ ارسطو کی طرح اس کا بھی خیال تھا کہ جس طرح "المیہ" کے دیکھنے سے تماشائیوں کے اندر خوف اور رحم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اسی طرح "طربیہ" میں کرداروں کی غلطیوں اور لغزشوں پر طنز کر کے اصلاح کی جا سکتی ہے۔ اس کا قول ہے کہ ہر انسان چار عناصر کی ترکیب سے بنا ہے۔ اگر یہ عناصر کم و بیش ہوئے تو مزاج کے فساد کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس خیال سے وہ لالچی، عیاش، تنک مزاج، بزدل اور بیوقوف کرداروں کو سامنے لا کر سماجی خرابیوں کا احساس دلاتا ہے اور ہمارے تفریح کا سامان بھی کرتا ہے۔ مگر اس کا مقصد ہمیشہ ایک اخلاقی معلّم کا ہی رہتا ہے۔

بن جانسن نے "رومی المیہ" Roman Tragedy کے نمونے پر دو ڈرامے Sejanus اور Catiline بھی لکھے لیکن ان پر عالمیت اور کلاسیکیت کا ایسا دبیز پردہ پڑا ہے کہ وہ زیادہ مقبول نہیں ہو سکے۔ اس کی اصلی شہرت اس کے طربیہ ڈراموں سے ہی ہوئی۔ وہ کامیڈی کے ایک نئے طرز کا بانی ہے۔ جس سے انگریزی ڈرامہ آئندہ نسلوں تک متاثر ہوتا رہا۔ "معاشرتی طربیہ" Comedy Of Manners کو جو ترقی سترھویں صدی کے اواخر میں ہوئی وہ بن جانسن کا ہی فیض ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں شیکسپیئر کی رومانیت، بلیغ تخیل اور منفرد کرداروں کا تنوع نہیں لیکن اس نے جس صداقت سے عصری زندگی کے خاکے پیش کیے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اس کا کینوس نظریاتی مباحث کے باوجود وسیع ہے۔ اور اس کے یہاں فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر Moliere کی طرح انسانی تخیل کا پتہ ملتا ہے۔

(۲) جان مارسٹن (۱۵۷۵ء سے ۱۶۳۴ء تک)

سترھویں صدی کے ابتدا میں بن جانسن نے جن دو ڈرامہ نگاروں کو ہدفِ ملامت بنایا۔ ان میں ایک مارسٹن تھا اور دوسرا ڈیکر۔ اوّل الذکر عریانی اور ہزل کا ماہر تھا۔ چنانچہ اس کا پہلا ادبی کارنامہ اسی رنگ میں ہے۔ ۱۵۹۸ء میں لکھی ہوئی The Scourge Of Villanie سے اس کی طنزیہ طبیعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

بحیثیت ایک ڈرامہ نگار کے مارسٹن ایک خلاق عہد کی پیداوار ہے۔ اس نے اپنے

طنزیہ میلانِ طبع کے باوجود رومانی ڈرامہ پر طبع آزمائی کی۔ لیکن لاطینی ڈرامہ نگار سینکا کے بھوت اور انتقام وجرائم کے موضوعات اس پر حاوی رہے۔ اس کے پہلے المیہ ڈرامہ **Antonio & Mellida** ہے۔ **Antonio's Revenge** میں کِڈ **Kyd** کا رنگ جھلکتا ہے۔ مارسٹن رکیک اور پُرشور لہجہ میں لکھتا ہے۔ اسی لیے کسی ہمعصر نے اسے "کثیف اسلوب" کا مُوجد کہا تھا۔

مارسٹن نے طربیہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ **The Malcontent** (سنہ ۱۶۰۱ء) اس کا پہلا کامیاب ڈرامہ ہے۔ جس میں شیکسپیر کا اثر نمایاں ہے۔ پروفیسر لیگوے نے اسے "ہملٹ کا طربیہ" کہا ہے۔ ڈرامہ کا ہیرو جنیوا کا ایک نواب ہے جس نے حماقت میں اپنی حکومت دوسرے کے سپرد کردی۔ لیکن بالآخر وہ بھیس بدل کر راج بھائی آتا ہے اور انھیں حربوں سے اپنے دشمنوں کو زیر کرکے حکومت پر قبضہ کرلیتا ہے۔ **The Dutch Coortesan** (سنہ ۱۶۰۵ء) میں مارسٹن نے ڈیکر کے مشہور ڈرامہ **The Honest Whore** کی تقلید کی ہے۔ اگرچہ اپنے دَور کے بڑے ڈرامہ نگاروں کے سامنے اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن "معاشرتی طربیہ" کے بانیوں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔

(۳) طامس ڈیکر (سنہ ۱۵۷۰ء سے سنہ ۱۶۴۱ء تک)

اگرچہ بن جانسن نے اپنے طنزیہ حملوں میں مارسٹن اور ڈیکر کو ایک دوسرے کا ایک ہمنوا قرار دیا تھا لیکن درحقیقت وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مارسٹن کے یہاں حزنیہ انداز بیان کے ساتھ ایک قسم کی بیزاری اور کلبیت بھی پائی جاتی ہے لیکن ڈیکر آزاد و منش مُصنّف ہے۔ اس کے یہاں شاعرانہ رجائیت اور نازک خیالی بھی ملتی ہے۔

ڈیکر کی زندگی کے صحیح حالات اب تک نہیں معلوم ہوسکے ہیں لیکن جانسن کے خاکوں سے ہمیں ایک "غریب آوارہ" اور "جاہل اور مغرور" ڈرامہ نگار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان خرابیوں کے باوجود ڈیکر کے یہاں چند ایسی خصوصیات موجود ہیں جن سے وہ جانسن پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ اسلوب بیان کی تازگی اور لطافت اور معاشرتی زندگی کے جیتے جاگتے خاکوں میں ڈیکر اپنے حریف پر حاوی ہے۔ اس کا سب سے مشہور ڈرامہ "موچی کا سوراج" ——————

The Shoe Maker's Holiday ہے جو سنہ ۱۶۰۰ء کے قریب لکھا گیا۔ ڈرامہ میں لیسی Lacy لندن کے میئر کی لڑکی روز Rose سے محبت کرتا ہے۔ میئر اس عاشق سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسے فرانس کے مورچہ پر بھیج دیتا ہے مگر وہ وہاں سے بھاگ آتا ہے اور ایک موچی کے یہاں بھیس بدل کر رہنے لگتا ہے۔ واقعات کی دلچسپ کشمکش کے بعد وہ اپنی محبوبہ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن ڈرامہ کا سب سے دلچسپ کردار "سائمن" نامی موچی ہے جو سرشار کے "آزاد" کا انگریزی نمونہ ہے۔ وہ تمام موچیوں کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور میئر ہو جانے پر بھی ان کے ساتھ رنگ رلیاں کرتا رہتا ہے۔ سر ہیمن Sir Hammon دوسرا مزاحیہ کردار ہے جو کسی دوسرے موچی کی بیوی کی محبت میں گرفتار ہے لیکن "برادری" کی پٹائی سے راہ راست پر لگ جاتا ہے۔

"ایمان دار رنڈی" The Honest Whore سنہ ۱۶۰۴ء میں لکھا ہوا یہ ڈرامہ ڈیکر کے مشہور کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ مصنف کی تمام جذباتیت کے باوجود یہ "خانگی ڈرامہ" Domestic Comedy کا بہترین نمونہ ہے۔ ڈرامہ کے پہلے حصہ میں ہیروئن کو ایک نواب اپنی داشتہ بنا کر صحیح راستہ پر لے آتا ہے لیکن دوسری شادی کے بعد اسے چھوڑ دیتا ہے دوسرے حصہ میں ہمیں وہ ہیروئن ایک ناکارہ آدمی کی وفادار بیوی کی صورت میں ملتی ہے۔ نواب دوبارہ اسے بے آبرو کرنا چاہتا ہے لیکن وہ پاکدامن رہ جاتی ہے۔ اس ڈرامہ میں ڈیکر نے المیہ اور طربیہ کے ملے جلے انداز میں زندگی کی عکاسی کی ہے لیکن اس میں پہلے ڈرامہ کی طرح سرشاری اور تفریح کے عناصر کم ہیں۔

(۴) جان وبسٹر John Webster (سنہ ۱۵۸۰ء سے سنہ ۱۶۲۴ء)

دور ایلزبتھ کے ڈرامہ نگاروں میں وبسٹر مدت تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ انیسویں صدی میں اس کے شاعرانہ آہنگ اور اعلیٰ تخیل سے متاثر ہو کر رومانی ادیبوں نے اس کا سراغ لگایا۔ اگرچہ وبسٹر نے اسٹیج کے لیے سنہ ۱۶۰۲ء سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن پہلے دس برسوں تک وہ اپنے ہمعصروں کی قلمی رفاقت کا دم بھرتا رہا اس کے دونوں شاہکار سنہ ۱۶۱۱ء

اور ۱۶۱۲ء میں لکھے گئے۔

The white Devil ویبسٹر کا پہلا مشہور کارنامہ ہے جو اس کے اٹلی کے دورے کا نتیجہ ہے۔ یہاں اس نے سرزمین اطالیہ کی درباری زندگی کی عیاشیوں اور جرائم اور مظالم کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ ایک نواب اپنی بیوی سے بیزار ہوکر "سفید بھوت" (یعنی وٹوریا) پر عاشق ہوجاتا ہے اور اس کے چھوٹے بھائی کی مدد سے کامیابی بھی حاصل کرلیتا ہے مگر اس کا نتیجہ اس کے حق میں مفید نہیں ثابت ہوتا۔ اس سازش میں سارے کے سارے کردار یا تو قتل کردیے جاتے ہیں یا زہر سے مار دیے جاتے ہیں۔ سولھویں صدی اٹلی کی درباری زندگی میں عیاشی، خونریزی اور قتل و غارت عام تھا۔ ویبسٹر کے اس ڈرامہ سے اس کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

The Duchess of Malfi بھی انتقام کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس ڈرامہ میں ایک بیوہ رانی ایک معمولی آدمی سے شادی کرنے کے باعث اپنے بھائیوں کی دشمنی مول لیتی ہے وہ بہن کی جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے ایک تیسرے آدمی کی مدد لیتے ہیں مگر آخرکار بڑا بھائی پاگل ہوجاتا ہے اور دوسرے شرفا بھی موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔

ویبسٹر کا فلسفۂ حیات قنوطی ہے۔ وہ تمثیلی مظالم کے پردے میں زندگی کی بے رحمی، پستی اور بے ثباتی کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کردار بھی اس جبریت کے شکار ہیں۔ ویبسٹر ان کے ساتھ کبھی رحم و کرم کا اظہار نہیں کرتا۔

(۵) سیرل ٹرنر Cyril Tourner (۱۵۷۵ء سے ۱۶۲۶ء)

ٹرنر کی دنیا ویبسٹر سے بھی زیادہ تاریک ہے۔ اس کے ڈرامے The Revenger's Tragedy اور The Atheist's Tragedy اس سے زیادہ قنوطی فضا پیدا کرتے ہیں۔ اول الذکر ڈرامہ میں ٹرنر اطالوی درباری زندگی کا کریہہ منظر پیش کرتا ہے۔ وہاں عیاشی اور بے رحمی کا سامراج ہے۔ اور کردار بھی مجسم گناہ معلوم ہوتے ہیں۔

"کافر کا المیہ" بھی اطالوی انتقامی ڈرامہ کے نمونہ پر لکھا گیا ہے لیکن مصنف نے شیکسپیر کے ڈراموں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ڈرامہ کی اہمیت دراصل انتقام کی شدت اور دہشت

نالیوں سے ہے اور نہ ڈرامہ نگاروں کے مخصوص زاویۂ نگاہ سے بلکہ مرکزی کردار کے حرکات و اعمال سے ہے جہاں ایک عیاش اور بداخلاق انسان اپنی تمام گناہوں کے بعد مرنے سے پہلے اس قوت سے مرعوب ہو جاتا ہے جو تمام کائنات کی محرک ہے۔

اپنے دونوں ڈراموں کی بدولت ٹرنر نشاۃ الثانیہ کے مشہور المیہ نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ مارلو اور شیکسپیر کے بعد لازمی طور پر وبسٹر کے ساتھ ٹرنر کا نام ہمارے سامنے آتا ہے لیکن اس کے فن میں وہ گہرائی اور رچاؤ نہیں جو اس کے بزرگ معاصرین کا خاصہ ہے۔

(۶) بومنٹ اور فلیچر

سترھویں صدی کی پہلی دہائی میں شیکسپیر کے ساتھ جن دو ڈرامہ نگاروں نے شہرت عام حاصل کی وہ بومنٹ اور فلیچر ہیں جو عرصہ تک ایک دوسرے کے قلمی رفیق رہے۔ انھوں نے مشترکہ طور پر کئی ڈرامے لکھے جنھیں اسٹیج پر بڑی کامیابی حاصل ہوئی ——

Philaster ان کا نیم المیہ نیم طربیہ Tragi-Comedy شاہکار ہے جس پر شیکسپیر کا اثر غالب ہے۔ مرکزی کردار فلاسٹر ہملٹ کا ہمزاد ہے جو اپنی ریاست سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اطالوی ڈرامہ کی عیاشیوں اور جنسی بے راہ رویوں کا بھی یہاں احساس ہوتا ہے شاہزادہ فلاسٹر بالآخر اپنی آزمائشوں میں کامیاب ہوتا ہے اور اپنی حکومت حاصل کر لیتا ہے۔

The Maid's Tragedy اور A King & No King بھی اسی نوعیت کے ڈرامے ہیں۔ بومنٹ اور فلیچر کی دنیا عام انسانوں کی دنیا سے مختلف ہے۔ وہ ایک مصنوعی درباری زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں جہاں غیر فطری جذبات اور مبالغہ آمیز احساسات کو کافی دخل ہے۔ اگرچہ ان ڈراموں میں لکھنے والوں نے بڑی فنکاری کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تکلف، بناوٹ اور سطحیت اس قدر نمایاں ہے کہ کہیں دوپہر میں بہروپیوں کے کھیل کا گمان ہوتا ہے۔

The Knight Of The Burning Pestle ان دو ڈرامہ نگاروں کا سب سے مشہور طربیہ اکتساب ہے۔ لکھنے والوں نے یہاں جیمس اول کے درباری غازیوں کا طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں خوب خاکہ اڑایا ہے۔ رالف Ralph اصلی ہیرو ہے لیکن

اس کے ساتھ ہمنوائی کے لیے ایک خدمتگار اور ایک بونا بھی حاضر رہتا ہے۔ ان کے حرکات و سکنات مستقل تفریح کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

اس ڈرامہ پر سروانٹیز Cervantes کی مشہور تصنیف Don Quixote کا اثر غالب ہے۔

(۷) فلپ مسنجر Philip Messenger (۱۵۸۴ء سے ۱۶۳۹ء)

فلیچر کا قلمی رفیق اور جانشین فلپ مسنجر اپنی کثرت نویسی کی بدولت تھیٹر کی دنیا میں مشہور ہوا۔ اس نے کم و بیش سینتیس ۳۷ ڈرامے لکھے۔ جن میں اب صرف اٹھارہ باقی ہیں۔ ان میں اعلیٰ ڈرامائی فن اور شاعرانہ آہنگ کا پتہ نہیں ملتا۔ اگر زیادہ حق بیانی سے کام لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ مسنجر اپنے پیشرؤں اور بالخصوص فلیچر اور بن جانسن کا مقلد ہے۔

فلیچر یا جانسن کے یہاں فن کا بہر حال ایک اعلیٰ معیار ملتا ہے لیکن مسنجر کے بیشتر ڈرامے سیاسی اور مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ وہ نہ تو خود کو اپنے زمانہ کی سیاست اور مذہبیت سے بچا سکا اور نہ اس کے ڈرامے ہی ان خیالات سے بچ سکے ہیں۔ وہ شہنشاہیت کا مخالف تھا جس کا ثبوت اس کے ڈرامہ The Bondman سے ملتا ہے جس میں غلاموں نے اپنے مالکوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

اپنے دوسرے ڈرامہ Virgin Martyr میں مسنجر اپنے مذہبی خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں اس نے عیسائیوں کے خلاف فطرت پرستوں کی حمایت اور وکالت کی ہے۔

مسنجر نے کئی طربیہ ڈرامے بھی لکھے۔ لیکن ان سب میں مشہور (۱۶۳۳ء) A New Way To Pay old Debts ہے۔ یہاں ایک کنجوس Sir Over-Reach کی کردار نگاری میں مصنف نے اپنے تمام ڈرامائی فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ وہ دولت کی ہوس میں ہیرو تمام ایثار اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنی مہم جاری رکھتا ہے مگر آخر کار اپنے بھتیجے سے مات کھا جاتا ہے۔

سترھویں صدی کے دوسرے مشہور ڈرامہ نگاروں میں ٹامس ہے وڈ Thomas Heywood

طامس مڈلٹن Middleton جان فورڈ John Ford اور جیمس شرلے James Shirley بھی شامل ہیں۔

انگریزی ادب کی تاریخ میں نشاۃ الثانیہ کا ڈرامہ تخلیقی اور اعلیٰ شاعری کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس دَور میں جتنے بڑے ڈرامہ نگار پیدا ہوئے اور جس قدر موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی وہ کسی اور زمانے میں ممکن نہیں ہو سکا۔ مارلو، شیکسپیر، جانسن، ولبسٹر اور فلیچر جیسے نامورانِ فن اپنی جگہ خود عہد آفرین کارناموں کے مالک ہیں۔ انھوں نے ڈرامہ میں جو فنی بلندیاں حاصل کرلیں وہ آج تک کسی دوسرے فنکار کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ دَورِ جدید کا حقیقت پسند یا منظوم ڈرامہ اپنے زمانہ کا ترجمان ہو سکتا ہے لیکن اس میں وہ انسانیت اور آفاقیت نہیں ملتی جو نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ کا خاصّہ ہے۔

باب سوئم

دورِ بحالی کا ادب

سن ۱۶۶۰ء سے سن ۱۷۰۰ء تک

سن ۱۶۶۰ء میں شاہ چارلس دوئم کی تختِ انگلستان پر بحالی Restoration سے کرامویل کی جمہوری حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور شہنشاہیت کا ستارہ پھر بلند ہوا۔ دورِ ایلزبتھ میں انگریز ایک دنیا فتح کرنے پر کمربستہ تھے۔ چنانچہ رُوحِ عصر میں کلاسیکیت کے باوجود "تازہ ویلاؤں" کی تلاش، حسن کی جستجو اور احساسات کے پرجوش اظہار کا جذبہ کارفرما رہا۔ اگرچہ اس زمانہ میں بھی مذہبی عقائد اور خانقاہی روایات کی کشمکش باقی تھی لیکن طبقاتی فساد قومی فتوحات کی دھن میں کھو کر رہ گیا تھا۔ نئے مذہبی جمہوریہ میں انگریز قوم کو اعتدال اور توازن کی طرف مائل کرنے کی جدوجہد جاری رہی مگر کٹر عیسائیوں Puritans کی ساری مجتہدانہ کوششوں کے باوجود انگریزی سماج نشاۃ الثانیہ کے اثرات سے بے نیاز نہیں ہو سکا۔ اب پھر شہنشاہیت کے قیام سے وہ عناصر ابھرنے لگے جو اب تک دبے ہوئے تھے مگر سترھویں صدی کے نصفِ آخر میں علم وادب کے میدان میں نمایاں تبدیلیاں بھی ہونے لگی تھیں۔ ایلزبتھ کا دورِ رومانی

شعور کے اس شباب کا زمانہ تھا لیکن سترھویں صدی کی ابتدا سے ہی ان فکری اور جذباتی ہنگامہ خیزیوں کی رفتار سُست پڑنے لگی۔ تخیل کی بے لگام پرواز کی جگہ اب عام میلان عقلیت Intellectualiam کی طرف تھا۔ شیکسپیر کے آخری کارناموں، لیکن کے تخیلی تجزیوں، ڈن اور مابعد الطبیعاتی مدرسۂ شاعری سے ہمیں اس کا واضح ثبوت مل جاتا ہے۔ کہ انگریزی ادب اب ماورائی فضاؤں سے اتر کر زمین پر قدم جمانے لگا ہے۔ سیاسی اور سماجی، فکری اور ادبی انقلابات کے باعث اب ضابطہ اور توازن کو جذبہ اور تخیل پر فوقیت حاصل ہونے لگی۔ نشاۃ الثانیہ سے لے کر دورِ بحالی Restoration تک کی ادبی تصانیف میں اصول اور ضوابط کی طرف واضح رجحان ملتا ہے جسے "کلاسیکیت" کا نقش اولیں کہہ سکتے ہیں۔

چارلس دوئم کی بحالی پر نہ صرف شہنشاہیت کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں بلکہ عیش و عشرت، دربارداری اور تصنع و تکلف کا بھی دَور دورہ شروع ہوا۔ بادشاہ کو عیش اور درباری چہل پہل سے فرصت نہیں تھی۔ اس لیے دربار پر امراء کا اثر بڑھتا گیا۔ لندن اس درباری زندگی کا مرکز تھا۔ جہاں سے خلعتوں اور خطابوں کا وہ سلسلہ پھر شروع ہوا جو کچھ عرصہ کے لیے ختم ہوگیا تھا۔ ملک کے اندرونی حصوں میں اگرچہ دربار کی پُر تکلف زندگی سے کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوسکی۔ مگر اس کا اثر رفتہ رفتہ بڑھنے لگا۔ اس طرح اس ادب کے لیے زمین ہموار ہوگئی جو رئیسوں اور امیروں کی زندگی سے مواد اور اثر قبول کرنے لگا۔ کٹر اہلِ مذہب نے ہر قسم کے کھیل تماشوں اور تفریحوں پر پابندی لگا دی تھی۔ اب آزادی جو ملی تو لوگ تفریح کی دھن میں عیاشی کی حدود تک پہنچنے لگے۔ عادات و اطوار اور لباس و پوشش میں بھی رنگینی اور بانکپن کو زیادہ سے زیادہ دخل ہونے لگا۔ ان عوامل کا لازمی اثر ادب پر بھی پڑا۔

دورِ بحالی کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں فرانسیسی اثرات کو بالخصوص مدِنظر رکھنا چاہیے۔ شاہ چارلس دوئم کی جلاوطنی کے زمانہ میں اس کے درباریوں، شاعروں اور ادیبوں نے فرانسیسی دربار، پیرس کی زندگی اور معاشرت سے گہرے اثرات قبول کیے۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے فرانسیسی زبان اور ادب کے براہِ راست مطالعہ سے بھی استفادہ کیا۔ فرانسیسی ادب

اعلیٰ شاہکاروں اور کلاسیکی عناصر سے مالا مال تھا اور فرانسیسی زبان بھی اپنی سلاست، قطعیت اور صلاحیت کی بدولت انگریزی سے ممتاز تھی۔ چنانچہ "دورِ بحالی" اور اٹھارھویں صدی کے جدید کلاسیکی ادب پر فرانسیسی اثرات پوری طرح محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ دَورِ بحالی کا ادب بہت حد تک انگریزی ذہن کے مخصوص میلانات کا آئینہ دار بھی ہے۔ خارجی اثرات نے اس پر رنگ آمیزی ضرور کی لیکن اس کی روح خالص انگریزی ہے جس میں توانائی، صداقت اور زندگی ملتی ہے۔

شاعری

"عہدِ بحالی" میں نہ تو اسپنسر، ڈن اور ملٹن کے پایہ کے شاعر ہی پیدا ہو سکے اور نہ شاعری کے لیے ماحول ہی موزوں تھا۔ اس دَور کے بیشتر لکھنے والے یا تو فنِ ڈرامہ میں طبع آزمائی کر رہے تھے یا طنز و تعریض کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے مگر فرانسیسی اثرات کے تحت شاعری میں نئے اسالیب و صور کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔

غنائی شاعری اَور ڈرائیڈن:

ڈرائیڈن (۱۶۳۱ء سے ۱۷۰۰ء) اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے اس دَور پر حاوی رہا کیونکہ اس نے شعوری فن کے اصول قائم کیے اور اپنی شاعری سے ان کی موزونیت بھی ثابت کی۔

ڈرائیڈن کی شخصیت روحِ عصر سے بے حد متاثر ہے۔ خانہ جنگی اور دوسرے تمام مذہبی تنازعوں میں اس کی ساری ہمدردیاں جمہوریت پسندوں کے ساتھ رہیں۔ کرامویل Cromwell کی موت پر اس نے جو مرثیہ لکھا اس سے اس کی قومیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن چارلس دوئم کی بحالی کے بعد اس نے اپنا رویہ بدل دیا اور اس کے بعد سیاسی اعتبار سے زندگی بھر شہنشاہیت کا دم بھرتا رہا۔

ڈرائیڈن کی شاعری کا آغاز مابعد الطبیعاتی شعراء کی تقلید سے ہوا۔ اس نے نہ صرف مشہور شاعر ڈن Donne کا عمیق مطالعہ کیا بلکہ اس کی عقلیت، اجمال پسندی اور معنویت کا بھی قائل رہا۔ چنانچہ اس نے لارڈ ہسٹنگز پر جو نظم لکھی ہے اس میں ڈن کا اثر

نمایاں ہے ۔ ڈرائیڈن کے یہاں اگر ایک طرف جوشِ کلام، بلندیٔ خیال، غنائیت اور رومانی انداز بیان ملتا ہے تو دوسری طرف سلاستِ بیان، اعتدال اور اصول پرستی کے نمونے بھی ملتے ہیں جو اسے جدید کلاسیکی مدرسہ سے منسلک کرتے ہیں ۔ اس طرح وہ دور ایلزبتھ اور کلاسیکی شاعری کے درمیان عبوری حیثیت رکھتا ہے ۔

شاعری میں کامیابی کی کوئی خاص امید نہ دیکھ کر ڈرائیڈن ۱۶۶۰ء سے ڈرامہ کی طرف مائل ہوا اور سات سال تک رزمیہ ڈرامہ Heroic Drama میں طبع آزمائی کرتا رہا ۔ اگرچہ اسے فنِ ڈرامہ میں کوئی خاص مقام نہیں حاصل ہو سکا لیکن وہ عام ڈرامہ نگاروں کا پیش امام ضرور بنا رہا ۔ اس دور کا سب سے وقیع اور اہم تنقیدی کارنامہ فن ڈرامہ پر اس کا مقالہ An Essay Of Dramatic Poesy ہے ۔ جس میں مصنف نے قدماء اور معاصرین اور انگریز اور فرانسیسی ڈرامہ نگاروں کا مقابلہ کیا ہے اور منظوم ڈراموں پر مدلل بحث کی ہے ۔

بیانیہ شاعری سے ڈرائیڈن کو بے حد دلچسپی تھی ۔ وہ اطالوی شاعر ورجل Vir Gil کی طرح ایک "قومی رزمیہ" لکھنے کا ارمان رکھتا تھا ۔ لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا ۔ البتہ ۱۶۶۶ء میں اس کی لکھی ہوئی طویل نظم Annus Mirablis تاریخی اہمیت رکھتی ہے جس میں شاعر نے ولندیزیوں سے بحری جنگ اور لندن کی آتشزدگی کا پُرلطف بیان کیا ہے ۔ بیانیہ شاعری کو ڈرائیڈن سے خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن غنائی شاعری Lyric میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز رہا ۔ اپنے ڈراموں میں اس نے جن نظموں اور گیتوں کو شامل کیا ہے ۔ ان کی موسیقیت اور دلکشی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

۱۶۸۱ء سے ۱۶۸۷ء تک طنزیہ اور اخلاقی نظموں کی بدولت ڈرائیڈن کو عروضی شاعری پر بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی ۔ چنانچہ اس کی زندگی کے آخری پندرہ سال غنائی شاعری کے کمال کے مظہر ہیں ۔ اس نے غنائی نظموں کو نئے اسالیب عطا کیے ۔ ان میں موسیقیت اور فنکارانہ بلوغت کا پتہ چلتا ہے ۔ ۱۶۸۷ء میں سنت سسلیا ——— St. Cecilia's Day پر لکھی ہوئی دو نظمیں فنی اور تاریخی نقطۂ نظر سے بے حد

اہمیت رکھتی ہیں ۔ ڈرائیڈن کو خود اس کا احساس تھا ۔ اس کا قول ہے کہ :-

ع نہ ایسا ہوا تھا نہ ہوگا کبھی

مشہور رومانی شاعر اسکاٹ نے انھیں نظموں کی بنیاد پر ڈرائیڈن کو غنائی شاعری کا استاد مانا ہے ۔ دوسری نظم "ضیافت سکندر" Alexander'sFeast اپنی سلاست، سادگی اور فنکاری کے باعث بہت مقبول ہوئی Ode To Mrs. Killigrew میں ڈرائیڈن کا شاعرانہ کمال اس کی غنائیت اور نفاستِ خیال بھی ہے ۔ اس نظم میں سترھویں صدی کے مذہبی شعراء اور جدید رومانیت کی جھلک نظر آتی ہے ۔

ڈرائیڈن کے معاصرین اگرچہ کسی خاص ادبی اہمیت کے مالک نہیں لیکن ان کے یہاں جدید کلاسیکی شاعری کے عناصر زیادہ نمایاں ہیں ۔ ان شاعروں میں سلاستِ بیان اور غنائیت بھی موجود ہے لیکن وہ اس "روحانی قحط" سے بے نیاز نہیں رہ سکے ۔ جو اس دَور کے ادب کا خاصّہ ہے ۔ شہنشاہیت کی بحالی اور دربار کے دوبارہ قیام کے باوجود یہ شعراء اپنے لیے کوئی مقام نہیں حاصل کر سکے ۔ اسی زمانہ میں متشاعروں اور تُک بندوں نے شاعری کی دیوی پر دھاوے بول دیے تھے جن کے خلاف ڈرائیڈن اور پوپ نے طنزیہ انداز اختیار کیا ۔

سترھویں صدی کے اواخر اور بالخصوص دورِ بحالی میں شعراء غازیانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے لیکن ان کے کلام میں وہ زور واثر نہیں پیدا ہو سکا جو دَورِ ایلزبتھ یا رومانی دَور سے پہلے کے شاعروں کا خاصّہ ہے ۔ ان شاعروں کے یہاں تصنع اور تکلف نمایاں ہے اور بالعموم جذبہ اور احساس کا فقدان ہے ۔ راس کامن Earl Gf Roscommon نے ہورَیس Horace کی "فنِ شاعری" کا منظوم ترجمہ کیا، اور ڈیوک آف بکنگھم نے Essay On Poetry لکھی جسے معاصرین نے بہت پسند کیا ۔ مگر ان تمام کارناموں میں سطحیت اور تقلید کا غلبہ ہے ۔ ڈرامہ میں عشق و عاشقی کے مضامین کی اہمیت کے پیشِ نظر شاعروں نے بھی انھیں باندھنے کی کوششیں کیں ۔ لیکن ماحول کی مصنوعیت اور خود لکھنے والوں کی سطحیت کی وجہ سے یہ نظمیں یا تو محض تفریحی رہ گئیں یا ان پر تعیشانہ رنگ غالب آ گیا ۔

دورِ بحالی کی شاعری کسی طرح بھی اعلیٰ شاعری کا نمونہ نہیں کہی جاسکتی لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ زبان زیادہ منجھتی گئی اور فنکاروں نے اصول و ضوابط کی روشنی میں نظمیں لکھیں۔ جس سے آئندہ جدید کلاسیکی شاعروں نے استفادہ کیا۔

طنزیہ شاعری

چارلس دوئم کی بحالی کے ساتھ انگلستان میں سماجی اور معاشرتی انقلاب بھی رونما ہوا جس کا مجموعی اثر اصنافِ ادب بالخصوص "طنزیات" پر سب سے زیادہ رہا۔ ایک ترقی پذیر سماج کے لیے صالح روایتی اقدار کا احترام اتنا ہی ضروری ہے جتنا رجعت پرستی سے احتراز۔ چنانچہ سنہ ۱۶۶۰ء کے بعد ملک میں مذہبی، اخلاقی اور سیاسی مباحثے اور مناظرے شروع ہوئے تاکہ اقدار کا تعین ہوسکے۔ لیکن باہمی تنازعے اس حد تک بڑھے کہ کاغذی جنگ Paper War کی نوبت آگئی۔

شہنشاہی کے دوبارہ استحکام کے بعد ان ساری پابندیوں کی شدید مخالفت کی گئی جنھیں خانہ جنگی کے بعد مذہبی جمہوریہ نے عوام پر عائد کر رکھی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ خالص مذہبی ریاضت اور نفس کشی کے خلاف احتجاج کے ساتھ نمائشی مذہبیت کے خلاف ردِّعمل بھی شروع ہوا اور کٹّر مذہبیوں کا مضحکہ اڑانا فریضہ سے زیادہ تفریحی مشغلہ بن گیا۔ چنانچہ اس دَور کے طنز نگاروں کے یہاں مزاح و تمسخر کے ساتھ ہمیں تلخی اور دل شکنی کے بھی پہلو ملتے ہیں۔

سیاسی تنازعوں سے بھی طنزیہ ادب کو بڑی تحریک ملی۔ خانہ جنگی کے دوران میں نہایت شدید قسم کے معرکے سر ہوئے اور متنازعہ فیہ مسائل کا ایک سلسلہ قائم ہوگیا۔ "بحالی" Restoration کے بعد اگرچہ ان میں کچھ کمی ہوگئی لیکن اعتدال پسندوں Whigs اور رجعت نوازوں Tories کی باہمی جنگ نے طنز نگاروں اور نامراد اور برگشتہ شاعروں کے لیے کافی مواد بھی فراہم کیا۔

طنزیہ ادب کی شہرت اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں میں کلاسیکی شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفات عام ہوتی جارہی تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر انگریزی شاعروں نے بھی یونانی اور لاطینی طنز نگاروں کے نمونہ پر نظمیں لکھنا شروع کیں۔ اس سلسلہ میں نثر نگار بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے قصّوں اور تمثیلوں میں طنز و مزاح کے خُوب خُوب گل کھلائے۔

طنز نگاروں کی سب سے بڑی مہم متشاعروں اور نام نہاد مصنفین کے خلاف تھی۔ یہ "بدذات" خواہ مخواہ اپنی علمیت اور کلاسیکی مطالعہ کا مظاہرہ کرتے پھرتے تھے جو طبع سلیم پر گراں گزرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر بلند پایہ ادیب اور شاعر بھی احمقوں اور متشاعروں کے خلاف جہاد میں اُتر آئے۔ اٹھارھویں صدی میں تو یہ وبا اس قدر عام ہوئی کہ پوپ نے اپنے "احمقنامہ" Dunciad میں اپنے تمام دشمنوں کو شکنجہ کا سزاوار ٹھہرایا۔

(۱) سیموول بٹلر

بٹلر کی سوانح حیات کے متعلق بہت کم معلومات فراہم ہو سکی ہیں لیکن اس کی طنزیہ تصنیف "ہوڈیبراس" Audibras دَورِ بحالی کے ادبی شاہکاروں میں شامل کی جاتی ہے۔

خانہ جنگی کے دوران میں جب لوگ ایک دوسرے کا گلا بے وجہ گھونٹ رہے تھے ہڈیبراس اپنے چیلے رالف Ralph کے ساتھ مہمات سر کرنے نکلتا ہے۔ یہ دونوں دو مختلف مذہبی عقائد کے پیرو تھے اس لیے ان میں بحث و تکرار سے لے کر دست و گریباں ہونے تک کی نوبت آجاتی تھی مگر مجاہد اعظم کو سب سے زیادہ نفرت کھیل تماشوں اور لہو و لعب سے تھی۔ اِس لیے مداریوں پر اس کا عتاب فطری تھا۔ ہڈیبراس کی فتوحات اسی قدر دلچسپ ہیں جس قدر اس کی قید و بند کی صعوبتیں اور اپنے نصب العین کے ساتھ گرویدگی۔ آخرکار اس کا جنونِ اصلاح ایک بیوہ کی محبت اور نجومی کی پیشین گوئی سے اعتدال پر آتا ہے۔ اس طرح یہ نظم دونوں سواروں کے ہفت خوان پر ختم ہو جاتی ہے۔

اگرچہ بٹلر اپنے ہیرو کو "ڈان کہوٹے" Don Quixote کے سانچہ میں نہیں ڈھال سکا ہے لیکن اپنے دَور کے مذہبی جنون اور احمقانہ جوش و خروش پر جو طنز اس نے کیا ہے وہ اس پیمانہ پر اسی کا حصّہ ہے۔ نثر میں یہ قدرت اٹھارھویں صدی میں سوئفٹ Swift کو ہی حاصل ہو سکی۔ بٹلر طنز کے ساتھ مزاح اور طربیہ عناصر اور اعلیٰ خیالات کے ساتھ پست جذبات کو ملا کر ایک عجیب منظوم مرکب پیش کرتا ہے۔ اس کے طنز و تمسخر پر اگر ہم مسکرانے پر مجبور ہیں تو اس کے مشاہدات پر داد دیے بغیر بھی نہیں رہ

سکتے۔ سماجی اور مذہبی برائیوں اور خود بینی اور دوسری انسانی کمزوریوں کا جس حسن و خوبی سے بٹلر نے تجزیہ کیا ہے وہ اس سے پہلے فرانسیسی طنز نگار ربلے Rabaleis نے ہی کیا تھا۔

(۲) آلڈھم

شاہ چارلس کی واپسی کے بعد انگلستان میں سیاسی طنز نے جو خطرناک صورت اختیار کر لی۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سیاسی طنز نگاروں میں ماروِل Marvell نے "مصوّر کے لیے ہدایات" Instructions To A Painter میں روبہ زوال سماج اور درباری پستیوں پر سخت تنقید کی۔ اس نے "برٹینیا اور ربلے" دو گھوڑوں کے مکالمہ میں اپنے غم و غصّہ کا اظہار بڑی شدّت سے کیا ہے۔

آلڈھم کی شہرت Satire On The Jesuits کی بدولت ہے۔ اس کے یہاں مزاح و تمسخر کے عناصر کم ہیں لیکن اسلوب بیان میں جوش اور طنطنہ ہے۔ اس کی شخصیت میں جو مردانگی ہے وُہی اس کی نظموں کا خاصہ ہے۔

(۳) ڈرائیڈن

ڈرائیڈن کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ غنائی شاعری میں اس نے نہ صرف معاصرین کی قیادت کی بلکہ اپنے لیے بھی ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔ غنائی شاعری اور رزمیہ ڈرامہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے کے بعد وہ فطری طور پر طنزیات کی طرف مائل ہوا۔ اس لیے کہ یہی اس دَور کی مقبول عام صنف تھی۔ ڈرائیڈن کی طنزیہ نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے مذہبی اور سیاسی حریفوں کے علاوہ متشاعروں اور نام نہاد ادیبوں کے خلاف بھی ایک محاذ قائم کر رکھا تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اپنی ابتدائی شاعری کے زمانہ سے ہی طنز نگاری کی تربیت حاصل کر رہا تھا جسے اس کے ڈرامائی دَور میں مزید تقویت ملی۔ ڈرائیڈن کے طنزیہ شاہکار اس کی فطرت سے زیادہ اس کے ادبی مزاج اور زبان و بیان پر قدرت کے آئینہ دار ہیں۔

شاعری میں طنز نگاروں کا سلسلہ یا تو ہوریس Horace کے شائستہ اور مہذب

نمونوں سے ملتا ہے یا جوونیال Iuvenal کی پُر جلال طنزیہ نظموں سے۔ ڈرائیڈن موخرالذکر سے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس کے یہاں بھی غصہ اور ناشائستگی کے ساتھ جارحانہ انداز نمایاں ہے۔ وہ دَورِ ایلزبتھ کے طنز نگاروں کی فنّی خامیوں سے بخوبی واقف تھا۔ کلاسیکی اساتذہ کے مطالعہ اور زمانہ کے تقاضے کا بھی اس پر خاطرخواہ اثر ہوا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے انگریزی طنزیہ شاعری گہوارہ سے باہر قدم نہیں رکھ سکی تھی۔ مگر ڈرائیڈن کا فن بیک وقت ہمعصر طنزیہ شاعری سے منفرد اور قدماء کے اکتسابات پر قابل قدر اضافہ ہے۔

ڈرائیڈن کے طنزیات کی اثرپذیری کا راز اس کی بے مثل قوتِ بیان ہے۔ اس کے زبان وبیان پر قدرت کا اعتراف بائرن، کیٹس، اور ٹینی سن کے علاوہ جو اس کے مدّاح تھے۔ ورڈسورتھ تک نے کیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کا مشہور شاعر پوپ Pope تو ڈرائیڈن کا جانشین ہی مانا جاتا ہے۔ اس کی طنزیہ نظموں کا دائرہ وسیع ہے Absalom & Achitophel سیاسی طنز ہے۔ دوسرے شاہکار Religio Leici میں مذہبی طنز کا رنگ ہے Mac Flecknoe نیم رزمیہ ادبی نظم ہے جس میں اس نے اپنے ادبی حریف کی گت بنائی ہے۔ ان نظموں کے غائر مطالعہ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈرائیڈن کا فن تخلیقی نہیں بلکہ تخیلی ہے۔

Absalom & Achitophel ڈرائیڈن کی شاہکار طنزیہ نظم ہے۔ جو ۱۶۸۱ء میں منظرعام پر آئی۔ اس کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے عصری سیاسی حالات کا مطالعہ لازمی ہے۔ چونکہ چارلس دوئم کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اور جانشینی کا معاملہ بے حد پیچیدہ ہو گیا۔ اس لیے بادشاہ نے اپنے بھائی جیمس یعنی ڈیوک آف یارک کو ولی عہد بنانا چاہا لیکن Earl Of Shaftesbury نے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ——— Duke Of Monmouth کی حمایت کی اور عوام کو پاپائیوں کی مخالفت پر آمادہ کرلیا جنھیں بادشاہ کی حمایت حاصل تھی۔ خوش قسمتی سے انھیں دنوں بادشاہ سخت بیمار ہوا اور اسے عوام کی ہمدردی پھر حاصل ہو گئی۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس

نے جیمس کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ جب سیاسی انجمنیں ختم ہو گئیں تو ڈرائیڈن نے اپنے دشمنوں کے خلاف قلمی جہاد شروع کر دیا۔ شیفٹسبری اور اس کے پیروؤں سے اس کو سخت مخالفت تھی۔ اس لیے اس نے اس قومی مسئلہ پر توریت اور انجیل کی تلمیحات کے پردہ میں اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

The Medal (سنہ ۱۶۸۲ء) نامی نظم ڈرائیڈن نے اپنے سیاسی حریف کی جیل سے آزادی اور اس کے معتقدین کی حماقتوں پر جل کر لکھی تھی۔ یہاں اس نے شیفٹسبری کے خلاف عوام سے سازش کا الزام لگایا ہے۔

Mac Flecknoe کئی معنوں میں ڈرائیڈن کی شاہکار نظم ہے۔ اگرچہ اس کا محرک ایک ہمعصر شاعر اور ڈرامہ نگار شیڈول Sha De Well تھا جس سے ڈرائیڈن کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو گئے تھے لیکن معاصرانہ چشمک اس حد تک بڑھی کہ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں مستقل چھوٹتی رہیں۔ یہ نظم مزاحیہ رزمیہ Mock Heroic انداز میں لکھی گئی ہے۔ اقلیم حماقت کا بادشاہ میک فلکنو Macflecknoe بہت غور و فکر کے بعد شیڈول کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اس لیے کہ اس کا عقیدہ تھا کہ تمام امیدواروں میں وہی باپ دادا کا نام روشن کر سکتا ہے۔ شیڈول کی "تاج پوشی" اور "شاہانہ عظمت" جس انداز سے بیان کی گئی ہے اس سے ہم بیچارے کی بے بسی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ڈرائیڈن اپنی طنزیہ نظموں میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ کلاسیکی شعراء اور بالخصوص جووینال کی یاد دلاتا ہے۔ وہ موضوع کو تکمیل تک پہنچائے بغیر اطمینان کا سانس نہیں لیتا اور ہر زاویہ سے اپنے ہدف پر نگاہ رکھتا ہے۔ ان نظموں میں شاعر کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا "عناد" ہے جو وہ اپنے نشانۂ ملامت کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ وہ بذاتِ خود اخلاقی ذہنی اور جذباتی اعتبار سے کافی بلند و بالا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے حریفوں کو نفرت و حقارت کے تیروں سے چھلنی کرتا ہے۔ پوپ اور دوسرے طنز نگار اپنے حریفوں کو ہر طرح کمینہ، ہیچ اور ذلیل دکھاتے ہیں لیکن ڈرائیڈن انھیں بانس پر چڑھا کر گراتا ہے۔ چونکہ

اسے ڈرامہ نگاری کے ذریعہ کرداروں کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کا موقع ملا تھا اس لیے جزرسی کے ساتھ وہ واقعیت کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔ سولفٹ اور پوپ کے کرداروں میں مثالی رنگ غالب آجاتا ہے لیکن ڈرائیڈن کے کردار بے چارگی اور بے بسی کا مرقع بنے ہوئے ہمارے سامنے سسکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ "تضاد" Anti Thesis سے بے پناہ کام لیتا ہے۔ شیفٹسبری کی شان میں اُس نے کہا تھا:-

"اس کا نام آئندہ نسلوں کے لیے عذاب ہے۔ خطرناک سازشوں اور مہلک مشوروں کا ماہر، عیّار، بے باک اور عقل و دانش کے اعتبار سے سرکش"۔

شیڈول "بچپن سے ہی بے وقوفی میں بالغ تھا"

ڈرائیڈن کی طنزیہ نظموں کو وہ آفاقیت نہیں حاصل ہوسکی جو سولفٹ کا طرۂ امتیاز ہے لیکن انگریزی شاعری میں اس کا مقام مسلّم ہے۔ اس کے یہاں ایک قسم کی تصوّر پرستی کے علاوہ کلاسیکی اعتدال کا بھی شعور ملتا ہے۔ اس کی طنزیہ نظمیں مزاح اور دلچسپی کے علاوہ اس کی فطرت اور شاعرانہ کمالات کی بیّن دلیل ہیں۔

ڈرامہ

چارلس دوئم کے دورِ حکومت میں جن ادبی اصناف کو ترقی ہوئی ان میں ڈرامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں شاعروں اور ادیبوں کے مقابلہ میں ڈرامہ نگاروں کی زیادہ قدر تھی اور انھیں کے تصانیف کے آئینہ میں ہم اس معاشرے کا اندازہ بھی کرسکتے ہیں۔ ڈرامہ میں بھی المیہ کے بجائے طربیہ کو خاص سرپرستی حاصل تھی۔ وائکرلے Wycherley ایتھرج Etherage اور کانگریو Congrev کے ہاتھوں اس مخصوص طربیہ کو مقبولیت عام ملی جسے "معاشرتی طربیہ" Comedy Of Manners کہتے ہیں۔

کٹر مذہبیوں Puritans کی تحریک سے ۱۶۴۲ء میں تمام تھیٹر بند کردیے گئے اور چودہ سال تک کسی قسم کے ڈرامائی تماشوں کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے حامی بھی حکومت کے احتساب سے ہراساں ہوکر خاموش ہورہے لیکن "بحالی" سے چند سال پہلے ۱۶۵۶ء میں سروِلیم ڈیوِننٹ Sir William D' Avenant نے کلاسیکی ڈرامہ اسٹیج کرنے کی اجازت

حاصل کرلی۔ سر ڈیویننٹ کا فرانس سے عرصہ تک گہرا تعلق رہا۔ اس نے وہاں اس ادبی فضا میں سانس لی۔ جب فرانسیسی کلاسیکیت اپنے شباب پر تھی اور راسین Racine کارنئے Corneille کے ڈراموں کی دھوم تھی۔ سر ڈیویننٹ لازمی طور پر ان سے متاثر ہوا۔ اس کے ڈرامہ The Siege of Rhodes میں روایتی محبت کے ساتھ رومان نگار رول کی افسانویت اور "غنائی ڈرامہ" Opera کے بھی اثرات ملتے ہیں۔ اس ڈرامہ کا موضوع رزمیہ ہے جہاں اخلاق حسنہ کی تلقین کے ساتھ ازدواجی زندگی کی کامیابی پر بتریک بھی پیش کی گئی ہے۔ سر ڈیویننٹ انگریزی ڈرامہ میں "رزمیہ المیہ" Heroic Tragedy اور "غنائی ڈرامہ" کا بانی ہے۔

دورِ بحالی کا ڈرامہ انگریزی قومی تحریک کا نتیجۂ صریح ہے۔ اس سے انگریزی ذہن کے مخصوص میلانات کی بخوبی نمائندگی ہوتی ہے۔ اہلِ مذہب کی سخت گیری کے بعد دوبارہ ڈرامہ کے ذریعہ عوام کو "جنت نگاہ و فردوس گوش" محفلوں میں شرکت کا موقع ملا۔ لیکن یہ آزادی افراط کے بعد تفریط تھی یعنی عوام اور ڈرامہ نگاروں نے ایسی بے راہ روی برتی کہ تمام اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز ہو گئے۔ بانکے چھیلوں کو تھیٹر میں بازاری معشوقوں سے ملاقاتوں اور سازشوں کے مواقع ملنے لگے اور فیشن پرست مرد عورت ہمیشہ تفریح و نمائش کے لیے تھیٹر کی زینت بنے ہوئے تھے۔ جب ماحول میں ایسی آزادی ہو تو انجام بھی ظاہر ہے۔

سترھویں صدی کی آخری چار دہائیوں میں انگریزی ڈرامہ پر فرانسیسی اثرات غالب رہے۔ راسین اور کارنئے جیسے باکمال المیہ نگاروں سے انگریزی ڈرامہ نگاروں نے غازیانہ اور رزمیہ المیہ کے لیے مواد حاصل کیا اور مولیئر Moliere جیسے صاحبِ فن سے خوشہ چینی کر کے معاشرتی طربیے لکھے۔ اگرچہ بنیادی طور پر انگریزی معاشرتی ڈرامہ فرانسیسی اثرات کی پیداوار ہے لیکن اس کی ترقی میں قومی ذہن اور مزاج کو بھی کافی دخل ہے۔ دورِ بحالی کا ڈرامہ اپنے دور کی ذہنی اور معاشرتی زندگی کی تاریخ ہے جس میں مذہب و اخلاق اور اعلیٰ اقدار کے بجائے سطحی لذتیت اور جنسی بے عنوانیوں کی جھلکیاں ہیں۔

"رزمیہ المیہ" Heroic Tragedy انگریزی ادب میں رزمیہ ڈرامہ کا

ماحصل مشہور شاعر اور طنز نگار ڈرائیڈن کی ڈرامائی تصانیف ہیں۔ اگرچہ وہ اس فن کا موجد نہیں لیکن اس نے اس کی ادبی سطح بلند کر کے اس مقام تک پہنچا دیا جہاں سے آگے جانا ممکن نہ تھا۔

انگلستان میں سر ولیم ۱۶۵۶ء میں ہی اپنے ڈرامہ "محاصرۂ روڈیش" کے ذریعہ اس صنف کی بنیاد رکھ چکا تھا۔ چنانچہ "محبت اور شجاعت" جیسے اخلاق حسنہ کی تحسین و تہنیت ہی ان ڈراموں کا موضوع ٹھہرے۔ ڈرائیڈن نے سب سے پہلے The Rival Ladies تصنیف کی لیکن اس کے بعد ۱۶۶۷ء میں The Indian Empress اور ۱۶۷۰ء میں "فتح گراناڈا" The Conquest of Granad منظر عام پر آئے مگر اس کا شاہکار ڈرامہ "اورنگ زیب" Aurangzeb مانا جاتا ہے جو ۱۶۷۵ء میں لکھا گیا۔ ڈرائیڈن کے ان ڈراموں میں نشاۃ الثانیہ کے رومانی ڈراموں کی جھلک ملتی ہے لیکن اس کی رومانیت ایک مخصوص اثر آفرینی کی کوشش میں اس شعری کیفیت سے عاری رہ جاتی ہے۔ جو دور ایلزبتھ کے شاہکاروں کا خاصہ ہے۔ مارلو کے "تیمورلنگ" Tambu·laine اور ڈرائیڈن کے "اورنگ زیب" Aurangzeb میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگار کارنئے Conreille اپنے ڈراموں میں اخلاق کے ساتھ جمالیاتی لوازمات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس کے یہاں صحیح معنوں میں کلاسیکی اعتدال ملتا ہے جسے ڈرائیڈن یا اس کے جانشین کہیں نہیں حاصل کر سکے۔

بقول ہابس Hobbes کے رزمیہ ڈرامہ کا مقصد محبت، شجاعت اور حسن کی تعظیم اور ستائش ہے۔ چنانچہ رزمیہ ڈرامہ نگار اپنی ساری کوششیں ڈرامائی شان و شوکت برقرار رکھنے کے بجائے مبالغہ آمیز مکالموں اور پُروقار منظروں کے لیے صرف کرتے جس سے تصنع اور تکلف کا احساس ہوتا ہے۔ ان رزمیہ ڈراموں کے پلاٹ نسبتاً آسان ہوتے تھے لیکن ان میں بادشاہوں اور رانیوں کے اعمال کو خاصہ دخل ہوتا تھا جس سے جنگ، محبت اور حسد کے لیے فضا پیدا کی جا سکتی تھی۔ آخر میں رسمی قتل و خون کے بعد ہیرو اور ہیروئن کی ازدواجی زندگی کے حسین مناظر پیش کیے جاتے تھے۔ ان ڈراموں کے نتائج

خوفناک نہیں ہوتے تھے بلکہ عوام کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے ان میں ترمیم کی جاتی تھی۔
رزمیہ ڈرامہ کا مقصد دراصل رزمیہ Epic کا انداز بیان حاصل کرنا تھا تاکہ
وہی جاہ و حشم اور شان و شوکت جو رزمیہ کے کرداروں کا خاصہ ہے۔ اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکے۔
لیکن یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ ان ڈراموں میں تصنع اور مبالغہ کی وجہ سے متاخرین
نے تقلید کے بجائے تضحیک کی ہے۔ "ریہرسل" نامی ڈرامہ میں سر ولیم اور ڈرائیڈن دونوں پر
طنز کیا گیا ہے۔ مشہور افسانہ نگار فیلڈنگ Fielding نے بھی Tom Thumb
میں رزمیہ ڈرامہ کے مصنوعی پہلوؤں اور بیہودہ مبالغہ آمیزیوں کا بڑا مذاق اڑایا ہے۔ انھیں
اسباب کی بنا پر رزمیہ ڈرامے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

معاشرتی طربیہ

دَورِ بحالی کا "معاشرتی طربیہ" بحیثیت ایک صنف کے "رزمیہ المیہ" کی طرح بہت
پہلے معرضِ وجود میں آ چکا تھا لیکن چارلس دوئم کی حکومت میں اسے خاص سرپرستی حاصل ہوئی۔
اس صنفِ ڈرامہ میں نہ صرف اس دور کے فنکاروں کے شاہکار پائے جاتے ہیں بلکہ ہم صحیح
معنوں میں انگریزی ذہن اور مزاج کی آزادی، رنگا رنگی، بے عنوانی اور سرمستی کا عکس پاتے ہیں۔
دَورِ بحالی میں معاشرتی طربیہ کی کامیابی کا راز سماجی زندگی میں تکلف اور بناوٹ، فیشن اور نقالی
اور خود ڈرامہ نگاروں کا تیز مشاہدہ اور ناقدانہ زاویۂ نگاہ ہے۔ دربار کے زیرِ اثر راجدھانی
اور نواح میں ایک ایسی سوسائٹی پیدا ہوئی جو بذلہ سنجی، ظرافت اور بات میں بات پیدا کرنے
میں مشق بہم کر رہی تھی۔ ظاہر ہے فطری بذلہ سنجوں کے آگے نقالوں کی کیسی بنے گی۔ یہ نقل اور
تقلیدِ بے جا دصرف عام گفتگو بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ ڈرامہ نگاروں
نے اپنے بیشتر کردار ایسے منتخب کیے جن میں نہ صرف شہر اور دیہات، چالاک اور بے وقوف
حسن پرست اور ہوس پرست کا تضاد پیش کیا جائے بلکہ رنگے سیاروں اور بھگتوں کے ساتھ
آوارہ اور دباش کرداروں کو بھی نمایاں کیا جائے۔ یہاں اگر ہم ایک طرف "مرزا بھڑکدار بیگ"
Sir Fopling Flutter جیسے احمق آلذی کردار کو پیرس کی تقلید پر نازاں پاتے
ہیں تو دوسری طرف "حرامی" Hovner کی سازشوں اور بدچلنی سے بھی واقف ہوتے

ہیں۔ اسی طرح اگر ایک طرف یہاں سماری ملاحوں اور دیہاتی ججوں کی احمقانہ سادگی پر طنز ملتا ہے تو دوسری طرف شہری اوباشوں اور شہدوں کی عیارانہ پرکاریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

دورِ بحالی کے معاشرتی طربیہ کا بانی دراصل شیکسپیر کا مشہور ہمعصر بن جانسن Ben Jonson ہے۔ جس نے ڈرامہ کو رومانی کہرے سے نکال کر سماجی واقعیت عطا کی اور تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر معاشرت کی عکاسی کو اپنا شعار بنایا۔ لیکن یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ بن جانسن نے افراد کو ہدف ملامت بنایا اور ان کی لغزشوں کو طشت ازبام کیا مگر دورِ بحالی کے ڈرامہ نگاروں کے یہاں ہمیں "انواع" Type نظر آتے ہیں۔ شخصی کمزوریاں اب سماجی بیماریاں بن گئی تھیں۔ جن کی عکاسی ان ڈراموں میں کی گئی ہے۔ اس طرح یہ قول کہ ان مصنفوں نے فرانس سے سارا مواد حاصل کیا' پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے فرانسیسی اثرات کے ساتھ بن جانسن' مسنجر اور شرلے وغیرہ کے اکتسابات سے استفادہ کرتے ہوئے معاشرتی طربیہ کو خاص رنگ دیا۔ مشہور نقاد پامر Palmer نے اسی بنا پر دورِ بحالی کے طربیہ ڈرامہ کو خالص انگریزی قوم کے ذہن اور مزاج سے منسوب کیا ہے۔

سنہ ۱۶۹۸ء میں جب سے جیرمی کولیئر Jeremy Collier نے انگریزی ڈرامہ پر تنقید کی۔ دورِ بحالی کے ڈرامہ بالخصوص "طربیہ" کو فحش نگاری اور عریانی کا عنوان وبناد ستور رسا ہوگیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس ڈرامہ میں سماج کی ننگی تصویریں کھینچی گئی ہیں اور ان میں جنسی تلذذ' بازاری محبت' بدکاریوں اور سازشوں کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ یہاں عورتیں شہری اوباشوں کی صحبت کو دیہاتی رئیسوں کے مال ودولت پر ترجیح دیتی ہیں اور بیٹیاں والدین کو جلد از جلد شادی کرنے کی دھمکیوں سے بھی باز نہیں آتیں۔ اور سارا لندن "راش لیلا" کے لیے بیتاب نظر آتا ہے۔ لیکن اس ڈرامہ کو خالص اخلاقی معیار سے جانچنا کچھ زیادہ مناسب نہیں۔ دورِ بحالی کے ڈرامہ نگاروں پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے تمام زندگی کا ماحصل جنسی ہوس اور بدعنوانیوں

کو سمجھ لیا تھا۔ اگرچہ ہر فنکار کو اپنے مواد کے انتخاب میں پوری آزادی ہے لیکن اس فن کا مقصد محض اس کی ذاتی تسلی نہیں بلکہ ابلاغ Communication بھی ہے جس کا اثر دوسروں پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چاسر اور شیکسپیر جیسے باکمال شعراء میں فحاشی سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ چاسر کے "حکایات کنٹربری" میں کئی کہانیاں اتنی عریانی کے ساتھ کہی گئی ہیں کہ آزاد خیال سے آزاد خیال شخص بھی انھیں دوسروں کے سامنے دُہراتے ہوئے ہچکچائے گا۔ اسی طرح شیکسپیر کے ڈراموں میں ایسے مناظر آتے ہیں جہاں وہ فطرتِ انسانی کی اس کمزوری پر ایک نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکا ہے لیکن جب ہم ان شاعروں کے مجموعی کلام کی روشنی میں ان عریانیوں پر غور کرتے ہیں تو یہ بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے دورِ بحالی کے طربیہ نگار فحاشی اور عریانی کو اوڑھنا بچھونا بنا کر ڈرامہ کے فن کو قابلِ لعن وطعن بناتے ہیں۔

اخلاقیات سے قطع نظر جب ہم ان ڈراموں پر فنی اور جمالیاتی نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں تفریح اور دلچسپی کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ملتا ہے۔ پامر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ دَورِ بحالی کا طربیہ ایک مہذب سماج کا معیار پیش کرتا ہے جس کے اپنے اصول اور قانون ہیں۔ اس سماج کے نمائندہ افراد کے ساتھ جب نقالوں اور احمقوں کی مٹھ بھیڑ ہوتی ہے تو ہم اس تضاد پر مسکرائے بغیر نہیں رہتے۔ اس ڈرامے میں سترھویں صدی کی آخری دہائیوں کی سماجی زندگی کی پُرلطف عکاسی کی گئی ہے جس سے ہمیں عوام کی فارغ البالی، آزاد منشی اور ذہنی ایمانداری کا پتہ چلتا ہے۔ ہزلٹ جیسا نقّاد بھی یہ کہنے پر مجبور ہے کہ "کانگریو کا ہر صفحہ ذہنی تکان پر نئی فتح ہے۔"

سر جارج ایتھرج ۱۶۳۵ء سے ۱۶۹۱ء

دَورِ بحالی کی پُرتکلف اور ہوس کارانہ زندگی سے فن ڈرامہ بالخصوص طربیہ کو بڑی تحریک ملی۔ اس دَور کے ڈرامہ نگاروں نے اپنے سماج کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں بنائی ہیں کہ دورِ بحالی کے انگریزی سماج کا نقشہ ہماری آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ پلاٹ سے زیادہ ان فنکاروں کو کردار نگاری میں ملکہ حاصل تھا اسی لیے دَورِ بحالی کا ڈرامہ نشاۃ الثانیہ کے ڈرامہ

کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت پسند ہے۔ ایتھرج اپنے زمانہ کا نمایندہ ڈرامہ نگار ہے۔ اس کے فنی اکتسابات پر فرانس کی سیر و سیاحت کا خاص اثر پڑا۔ چنانچہ وہ مکالموں کے زور، نکتہ سنجی اور طنزیہ ظرافت میں اپنے تمام معاصرین میں ممتاز ہے۔

"مزاحیہ انتقام" The Comical Revenge اس کی سب سے پہلی کوشش ہے جس میں اس نے طربیہ اور فنتاشیہ کا امتزاج پیش کیا ہے۔ یہاں فنی خامیوں اور تصنع پسندی کے باوجود ایتھرج کی طنزیہ طبیعت کی عکاسیاں ملتی ہیں۔ ڈرامہ کا پلاٹ "رقابت" کے موضوع پر مبنی ہے لیکن افسانہ بجائے خود بہت مختصر ہے۔ البتہ "میاں کھلنڈر" Sir Fredrick Frolic کا کردار اس کے آئندہ ہیرو "مرزا بھڑکدار بیگ" Sir Fopling Flutter کا نقشِ اولین کہا جا سکتا ہے۔

"اسے لبھا آرزو" She Would If She Could میں ایتھرج کا فن کچھ اور نکھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ مکالمہ کی چستی اور کرداروں کی حاضر جوابی قابلِ تعریف اکتسابات ہیں۔ ڈرامہ کے ابتدا میں ہی رجالِ افسانہ نے اپنی زندگی کا منشور پیش کیا ہے :-

> "قسم خدا کی .... ب نو زندگی اسی ڈھرے پر بنا ہنی ہے ...... خوب کھاؤ پیو اور ایسے مست رہو کہ "پرانے یار" ہی نظر دل کو بھلے معلوم ہوں کیونکہ فی الحال کسی نئے شکار کی اُمید نہیں"۔

اس ڈرامہ کا مرکزی کردار ایک دیہاتی رئیس ہے جو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اپنی بیوی اور دو کنواری لڑکیوں کے ساتھ لندن آتا ہے جہاں من مانی محبت اور ہوس پرستی کا بازار گرم ہے۔ شہر میں آنے پر جب رئیس مخصوص حلقوں میں شناسا ہو جاتا ہے تو لفنگوں کا ایک گروہ اسے بری طرح دق کرتا ہے لیکن وہ نشہ کے عالم میں سب کو بخش دیتا ہے۔

"مرزا بھڑکدار بیگ" Sir Fopling Flutter جو ۱۶۷۶ء میں لکھا گیا، ایتھرج کا شاہکار ہے۔ یہاں عام معاشرتی طربیوں کی طرح پلاٹ برائے نام ہی ہے مگر سماجی زندگی کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی گئی ہے۔ کرداروں کی ذہانت اور نکتہ سنجی

اور مکالموں کی نوک جھونک بہت دلآویز ہے اور مرکزی کردار پیرس کی زندگی کی نقل کرکے ہمیں مسکرانے پر مجبور کرتا ہے ۔ اس سرپھرے عاشق کا مشہور جملہ کہ "تصنیف و تالیف ذہن کا میکانکی پہلو ہے اور شریفوں کو گیت اور غزل سے آگے نہیں جانا چاہیے"۔ خود ایتھرج کی فطرت کا آئینہ دار ہے ۔

ولیم وائکرلے سنہ ۱۶۴۰ء سے سنہ ۱۷۱۶ء تک

وائکرلے کے ڈراموں میں ایتھرج سے زیادہ گہرائی اور گیرائی ملتی ہے ۔اس کے یہاں کردار نگاری اور مکالموں کے علاوہ اس دور کے سماج کی جزئیات بھی نمایاں ہیں ۔ اگرچہ اس کا مطمحِ نظر بھی دورِ بحالی کے فیشن پرست اور تکلف پسند سماج سے متاثر ہے ۔ لیکن وہ طنز و مزاح کو زیادہ موثر طریقہ سے استعمال کرتا ہے ۔ اس کی حقیقت پسندی میں ایک حد تک غیر شعوری طور پر اخلاقی نظام محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

"جنگل میں منگل" Love In A Wood کو فرانس سے واپسی کے بعد وائکرلے کا "تہنیت نامہ" سمجھیے کیونکہ اس نے اپنے کرداروں میں اوباشوں، بانکوں اور احمقوں کے ساتھ بازاری عورتوں اور اس کے قبیل کے دوسرے افراد کو جگہ دی ہے ۔

"اُستادجی" The Gentleman Dancing Master وائکرلے کے شاہکاروں میں پیش کیے جانے لائق ہے ۔اس سے زیادہ تفریحی ڈرامہ دورِ بحالی کے شاہکاروں میں مشکل سے ہی ملے گا ۔"پلاٹ" ایک تنک مزاج کردار Don Diego کی لڑکی ہپولیٹا اور اس کے بھتیجے مسٹر پیرس Monsieur De Paris کے داستان محبت پر مبنی ہے ۔ موخرالذکر پیرس اور وہاں کی زندگی کا دلدادہ ہے اور ہر طرح وہاں کے فیشن کی نقل کرتا ہے اس کی محبوبہ کو اس کی یہ ادا بالکل پسند نہیں آتی ۔ اسی اثنا میں مارے حماقت کے وہ Gerard کو اپنی ہونے والی بیوی کو رقص و موسیقی کی تربیت کے لیے ملازم رکھ لیتا ہے ۔ استاد رفتہ رفتہ اپنا جادو چلا کر ایک خاص ڈرامائی انداز میں اپنی شاگرد سے شادی کر لیتا ہے ۔ ناکام عاشق بالآخر تمام عورتوں سے بدظن ہو جاتا ہے ۔

"..... عورتوں کی تخلیق کا مقصد ہی بنی نوعِ انسان کو احمق بنانا ہے پہلے

وہ اپنے والدین کو احمق بناتی ہیں - اس کے بعد اپنے عاشقوں کو پھر شوہروں کی باری آتی ہے اور بیوہ ہونے پر وہ شیطان کو بھی راستہ دکھاتی ہیں۔"

"دیہاتی بیوی" The Country wife وائکرلے کا بدنام زمانہ ڈرامہ ہے جس میں اس نے ایک بدکار لفنگے Horner (جو اپنے کو نامرد ظاہر کرتا ہے) کی ہوس پرستی کا نہایت شرمناک طریقہ پر ذکر کیا ہے - مرکزی کردار اپنی دیہاتی بیوی کو لے کر لندن آتا ہے لیکن اوباشوں کے خوف سے اسے اعلیٰ سوسائٹی سے دور رکھتا ہے - ادھر "بیوی" اپنی نند سے تھیٹر اور پارک کی دلکشی اور تفریحوں کا حال سن کر چوری چھپے گھومنے لگتی ہے - یہاں تک کہ ایک دن "ہارنر" اسے اپنا شکار بنالیتا ہے -

"سیدھے سپاٹ" The Plein Dealer میں کلاسیکی ڈرامہ بالخصوص بن جانسن کے ڈراموں کا اثر نمایاں ہے - وائکرلے یہاں سازشوں اور انسانی کمزوریوں پر خاص روشنی ڈالتا ہے - یہاں اس کا طنز محض مزاحیہ نہیں بلکہ حقیقت پسندی پر مبنی ہے -

کانگریو سنہ ۱۶۷۰ء سے سنہ ۱۷۲۹ء تک

کانگریو نے ترکہ میں بن جانسن اور اس کے بعد کے سارے ڈرامہ نگاروں کی جملہ خصوصیات پائی تھیں اس لیے اس کے یہاں "معاشرتی طربیہ" کی بہترین روایات کا امتزاج ملتا ہے - دور بحالی کے ڈرامہ نگاروں میں اس کی شخصیت اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر اس کی تصانیف - جب کانگریو نے ڈرامہ نگاری شروع کی تو اس وقت ایتھرج اور وائکرلے کی عریاں نگاری اور فاحشانہ صنعت گری کا دور دورہ تھا - دوسری طرف جیرمی کولئیر اس مخصوص طربیہ کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کر رہا تھا - اسی زمانہ میں اڈیسن اور اسٹیل آنے والے دورِ عقلیت Age of Reasou کی عمارت بھی تیار کر رہے تھے - ان حالات میں کانگریو کو میانہ روی اختیار کرنا پڑی - وہ فطرتاً بھی اپنے ہم پیشہ ڈرامہ نگاروں کی طرح فحاشی کا قائل نہیں تھا - اسی لیے اس نے ادب اور زندگی میں حسن و جمال کے ساتھ صالح عناصر کی تلاش جاری رکھی - اس کے ڈراموں میں ہمیں ایک شاعر اور فنکار کی تخلیقی فکر کی جھلک نظر آتی ہے -

کانگریو کا فن بیک وقت اس کی شخصیت اور فطرت کا آئینہ دار ہے۔ اس نے نہ صرف انگریزی ڈرامہ نگاروں ——— بن جانسن، ایتھرج، وائچرلے، اور شیڈول سے استفادہ کیا بلکہ فرانسیسی مصنف مولیئر Moliere سے بھی فنی رموز سیکھے۔ چنانچہ اس کے پلاٹ اور کردار اگرچہ ہمیں مولیئر کی یاد دلاتے ہیں تو اس کا رومانی اور غازیانہ فلسفہ حیات خالص انگریزی ذہن کی علامت معلوم ہوتا ہے۔

"بڈھا کنوارا" The Old Bachelor کانگریو کا سب سے پہلا ڈرامہ ہے جس میں اس نے اپنے نصب العین اور کردار نگاری کے نظریہ کی وضاحت کر دی ہے۔ "بیلنڈا" Belinda جو اپنے عاشق "بلمور" Bellmour کی شکایت کرتے نہیں تھکتی اور دوسروں کی زبان سے اس کی برائی بھی نہیں سن پاتی، مصنف کی آئندہ پختہ کردار نگاری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عاشق خود اپنے دور کا نمائندہ ہے:-

"چلو چلو ——— کاروبار کاہلوں کے لیے چھوڑو اور عقل مندی احمقوں کے لیے .... انھیں کو اس کی ضرورت ہوگی۔ اپنا سارا کمال تو لطیفہ سنجی ہے اور تفریح رہا اپنا شغل۔"

"چالباز" Double Dealer دور بحالی کے مخصوص موضوع عیارانہ محبت پر مبنی ہے لیکن یہاں Lady Touchwood کا کردار بہت نمایاں ہے۔

"محبت کی سازش" Love For Love میں کانگریو نے اپنے فن میں پختگی حاصل کر لی تھی۔ پلاٹ اگرچہ ایک بوڑھے باپ کی تنک مزاجی پر جو اپنے لائق بڑے بیٹے کے مقابلہ میں احمق چھوٹے بیٹے کو ترجیح دے رہا تھا، طنز ہے لیکن یہاں مجموعی طور پر ہمیں اس سماج کی فیشن پرستی، عیاری اور عیاشی کی جھلک ملتی ہے۔ ٹیٹل Tattle جیسے اوباش سادہ لوح لڑکیوں کو پھانسنے میں جس حاضر دماغی اور چالبازی کا ثبوت دیتے ہیں وہ اس عہد کا خاصہ ہے۔

"دنیا کا چلن" The Way of The World کانگریو ہی نہیں بلکہ تمام "معاشرتی طربیہ" میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں دو مرکزی کرداروں کی محبت کے پردہ

میں مصنف اپنے دور کی معاشرت اور اس کے ناقدانہ میلان پر جو رائے زنی کرتا ہے اس سے ہمیں دورِ بحالی کی زندگی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

کانگریو کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ باوجود ہمعصر ڈرامہ نگاروں سے استفادہ کے اس کے یہاں ذہنی صداقت کا عنصر سب سے زیادہ قوی ہے۔ اس نے لندن کی زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں اس سے اعلیٰ طبقہ کی عیش کوشی، حاضر جوابی اور تفریح کی پسندی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ کانگریو کا دامن بھی دھبوں سے پاک نہیں لیکن اس کے یہاں جو فنکارانہ پختگی ملتی ہے اور فلسفۂ حیات کا جو بیباکانہ اظہار ہے اس سے اس کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ دورِ بحالی اور بالخصوص کانگریو کے کمال کا اندازہ جمالیاتی مسرت کے معیار سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اخلاقی یا فلسفیانہ تنقید سے اس کے خلاق ذہن کا حق ادا نہیں ہوتا۔

نثر

سترھویں صدی کے نصف اول میں مذہبی دولت مشترکہ کی قدامت پرستی سے نشاۃ الثانیہ کی تحریک بیداری کی رفتار مدھم پڑ گئی اور مذہبی حکومت کے زیر اثر ازمنہ وسطیٰ کے فلسفہ اور خیال نے جدید سائنس اور حکمت پر کاری ضرب لگائی لیکن ۱۶۶۰ء میں شاہ چارلس دوم کی تخت نشینی کے بعد پھر سائنس اور فلسفہ کو تجربہ اور عمل کی روشنی ملنے لگی۔ اور علم و ادب کے میدان میں روشن خیالی اور عقلیت کو اہمیت حاصل ہوئی۔

جدید انگریزی نثر کی ابتدا ۱۶۶۰ء سے باقاعدہ طور پر ہوئی جس میں ڈرائیڈن **Dryden** اور اس کے رفیقوں کا بڑا ہاتھ رہا۔ عالموں اور ادیبوں کا ایک طبقہ جلاوطنی کے دوران پیرس اور فرانس میں قیام کے باعث فرانسیسی زبان کی سلاست اور اس کی نثری صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا اور بحالی کے بعد ان کی کوششیں انگریزی نثر کی اصلاح کے لیے وقف ہو گئیں۔ اگرچہ اس تحریک سے پہلے انجیل کی زبان سلاست بیان کا نمونہ تھی۔ لیکن مصنفوں کی اکثریت سلاست کی بجائے شوکتِ بیان کی قائل تھی۔ اب نئے زمانے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر آسان اور عام فہم زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ڈرائیڈن نے اپنے نثری کارناموں میں فرانسیسی نثر کی تمام خوبیاں انگریزی زبان میں لانے کی کامیاب کوششیں

کیں۔ اس کے ساتھ ہی رائل سوسائٹی کے اراکین اور سائنس دانوں نے بھی شعوری طور پر سلیس نثر کی طرف توجہ کی۔ طامس ہابس **Thomas Hobbes** اور جان لاک **John Locke** جیسے فلسفیوں نے بھی اس جدید نثر سے استفادہ کیا۔

طامس ہابس۔ (۱۵۸۸ء سے ۱۶۷۹ء) نے اپنے فلسفہ میں طبیعیاتی تبدیلیوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس کا قول ہے کہ انسان کی زندگی اور اس کے خیالات بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہیں۔ ہمارے حواس خمسہ خارجی دنیا سے اثرات قبول کرتے ہیں اور ہمارے تجربے اور ہمارے اخلاق انھیں تاثرات کے ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ ہم سب اس عمل اور ردعمل کے تابع ہیں اس لیے ان کی نگرانی کے لیے کسی کارفرما کی ضرورت ہے ورنہ ملک میں نزاع کا اندیشہ ہے۔ اس طرح ہابس کی **Leviathan** سامراجی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔

جان لاک (۱۶۳۲ء سے ۱۷۰۴ء) نے اپنے فلسفہ میں ہابس سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ وہ ایک حد تک اپنے پیشرو کی اس رائے سے کہ علم **Knowledge** کا انحصار تجربہ پر ہے، متفق ہے مگر اس نے طبیعیاتی ردعمل پر اس قدر زور نہیں دیا۔ لاک کے شہرۂ آفاق مقالہ **"An Essay Concerning Human Understanding"** (۱۶۹۰ء) کا اثر انگلستان اور برّاعظم یورپ پر بھی پڑا کیونکہ اس میں ایک خاص دور کے انگریزی ذہن اور مزاج کا اظہار ہے۔

سترھویں صدی کے نصف آخر میں سائنس دانوں کی توجہ انسانی ذہن پر مرکوز تھی۔ لیکن اس کے ساتھ لوگوں کو اپنی ذاتی نفس اور انفرادی شخصیت کا بھی خاص خیال تھا چنانچہ اس دور کے روزنامچے اور تذکرے اسی ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ سیموئل پیپز **Samuel Pepys** جس کا زمانہ ۱۶۳۳ء سے ۱۷۰۳ء ہے، اپنے دور کا سب سے بڑا تذکرہ نگار ہے۔ اس کی ڈائری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی صداقت بیانی ہے۔ جہاں مصنف نے بلاکم وکاست اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کا اعتراف کیا ہے۔ رومانی دور کے ادیبوں کی طرح اسے نہ تو اپنی زندگی کو ایک خاص نظریہ کے تحت پیش کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ اس نے خواہ مخواہ مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ اسی لیے اس کی ڈائری میں ہمیں مصنف کی

ظاہری و باطنی زندگی کا نہایت سچا مرقع ملتا ہے۔ ذاتی زندگی کے احوال و کوائف کے علاوہ ہمیں یہاں اس دور کے میلانات و موثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ چارلس دوم کی تخت نشینی، طاعون کی تباہ کاریاں اور لندن کی آتشزدگی کا ڈائری میں بالخصوص تذکرہ ہے۔

پیپز کے علاوہ دورِ بحالی میں اور بھی ادیب ہیں جنھوں نے روزنامچے اور سرگزشتیں لکھی ہیں اور اپنی ذاتی زندگی اور اپنے زمانہ کے سماج پر روشنی ڈالی ہے۔ جان ایولن John Evelyn ان سب میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ وہ رائل سوسائٹی کا ممبر اور ایک مشہور درباری تھا۔ اس کی دلچسپیاں باغوں، درباروں اور سیر و سیاحت کے ساتھ تھیں لیکن اس کی تصانیف میں لارڈ روچیسٹر Lord Rochester کی طرح تعیش کی بُو نہیں آتی۔ پیپز اور ایولن دونوں آسان اور عام فہم نثر کے علمبرداروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

دورِ بحالی کے نثری ادب میں نشاۃ الثانیہ کی رومانیت کے برخلاف فکر اور تجزیہ کا عنصر غالب تھا چنانچہ اخلاقی مضامین جن پر اب تک کلیسا اور عہدِ وسطیٰ کی علمیت کی چھاپ پائی جاتی تھی اب نئی تحریک کے زیرِ اثر عام تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات کا آئینہ بن گئے۔ اس تحریک میں فرانس اور نشاۃ الثانیہ کی اخلاقیت اور مذہبی حکومت کی سخت گیر مذہبیت دونوں کا اثر رہا۔ اخلاقی مضامین کے لیے "انشائیہ" Essay کی صنف بہت مقبول ہوئی جس میں مانتین اور بیکن کے کارنامے مشعلِ راہ تھے۔ "ابراہم کاؤلے" نے اپنی موت سے پہلے متعدد اخلاقی انشائیے یادگار چھوڑے جن پر فرانسیسی اثرات کے علاوہ انفرادی رنگ بھی گہرا ہے۔ ان مضامین میں کاؤلے کی علمیت اور کلاسیکیت سے ایک اسلوبی شان پیدا ہو گئی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے مشہور ادیب اور طنز نگار سوئفٹ Swift کے ادبی سرپرست سر ولیم ٹیمپل Sir William Temple کے مضامین تحریکی حیثیت رکھتے ہیں۔ قدما اور معاصرین پر اس کا مقالہ Ancient & Modern Learning

کلاسیکی اور جدید مصنفوں کے درمیان ادبی جنگ کا پیش خیمہ تھا ۔ ٹیمپل کی حمایت میں سوفٹ نے Battle Of Books تصنیف کی ۔ سر ولیم کے اخلاقی مضامین میں فکر و شعور کی پختگی ملتی ہے اور وہم پرستی کے بجائے عقلیت کا میلان نمایاں ہے ۔ وہاں انشائیوں میں صحت، اطمینان اور فراغت کا جو یا نظر آتا ہے اگرچہ ٹیمپل نے فرانسیسی ادیب مانتین کی اخلاقیت پر افادیت کا رنگ چڑھایا لیکن اس کے انشائیے اسلوب بیان کی حد تک انفرادی کارنامے ہیں ۔ اسی لیے اسے انگریزی کلاسیکیت کا پیشرو کہا گیا ہے ۔

جان بنین ۱۶۲۸ء سے ۱۶۸۸ء تک

اگرچہ جان بنین کا شمار مورخین دَور بحالی کے ادیبوں میں نہیں کرتے لیکن اسے اسی عہد کی مخلوق سمجھنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اس کی تصانیف میں غم و تفکر کے وہ میلانات جو اسے دُنیا سے خیال کی طرف مائل کرتے ہیں ۔ دراصل اس کے اپنے زمانے کے میلانات کا ہی ردِ عمل ہیں ۔

بنین نے تخلیقی بلندیاں اپنے ماحول کی پستیوں سے حاصل کیں ۔ اسے اعلیٰ تعلیم کے مواقع نہیں نصیب ہو سکے ۔ اس لیے اس کی ساری ذہنی تربیت انجیل کے مطالعہ سے ہوئی ۔ اور یہیں اس کی روحانی اور تخیلی قوتوں کو جلا ملی ۔ اس کے روحانی ڈرامے ہمیں مستقل طور پر ایک راسخ الاعتقاد انسان کی داخلی تاریخ معلوم ہوتے ہیں ۔ اس لیے کہ اس نے صرف اپنے دل کی آواز سنی اور اسی کی کہی ہوئی کہانیوں کو دُہرایا ۔

۱۶۷۸ء میں لکھی ہوئی اس کی مشہور تصنیف The Pilgrim's Progress جدتِ خیال سے عاری ہے کیونکہ اس میں وہی اخلاقی اصول و عقائد ملتے ہیں جو صدیوں سے مذہبی ادب کا قابلِ فخر سرمایہ رہے ہیں ۔ یہاں انجیل کا ایک عوامی خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں خیر و شر کی کشمکش مقدم الذکر کی کامیابی پر ختم ہوتی ہے ۔ مگر ان پرانے خیالات کو جس خلوص اور دلنشینی کے ساتھ بنین نے پیش کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے ۔

Grace Abounding میں بنین نے انسانی زندگی کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے ۔ یہاں وہ خود اپنے تجربوں کی بنا پر گناہ، غم و ناامیدی اور روحانی کشمکش کے بعد آخری

سکون اور مغفرت کی بشارت دیتا ہے۔

The Life & Death of Mr. Badman میں بنین ہمیں معلمِ اخلاق کی حیثیت سے حزنیہ مصائب کی تمثیل میں مذہب اور اخلاق کے سبق دیتا ہے۔ ان تمام تصانیف میں اس کا لہجہ پُرسکون اور سلجھا ہوا ہے لیکن داخلی کرائف کی تمثیل نگاری میں اعلیٰ اقدار کو اہم مقام حاصل ہے۔ بنین کے ہیرو داخلی زندگی کے جن مسائل سے دوچار ہیں۔ اور ان سے نجات کا جو حیلہ تلاش کرتے ہیں وہ عام انسانی مسائل ہیں۔ اسی لیے اس کی شہرت اور مقبولیت عیسائیوں کے علاوہ، تمام سنجیدہ پڑھنے والوں کے درمیان بھی ہے۔

بنین کے تمثیلی کارنامے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن وہ صحیح معنوں میں فنی تخلیقات ہیں یا نہیں، اس سوال پر اختلاف رائے کی بڑی گنجائش ہے۔ اس کی تصانیف کی عظمت اس کے خلوصِ تاثر اور صداقت بیان پر مبنی ہے۔ اسی لیے بنین کو فنکار نہ ماننے والے بھی اس کے روحانی مسائل کے تجزیہ اور زندگی کی کشمکش پر اس کے خیالات کی قدر کرتے ہیں۔ ایک صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے بھی بنین کی شخصیت ایسی ہے جس سے ہم تجاہل نہیں برت سکتے۔ اس کی طرزِ نگارش میں کتبِ مقدسہ کی سادگی، زورِ تاثر اور خلوص و ولولہ ہے۔

باب چہارم

جدید کلاسیکی دور

۱۷۰۷ء سے ۱۷۴۰ء تک

باب چہارم

جدید کلاسیکی دور ۱۷۰۲ء سے ۱۷۴۰ء

اور

پیش رومانی عہد ۱۷۴۰ء سے ۱۷۹۸ء

انگریزی کلاسیکیت اٹھارھویں صدی میں مختلف اثرات و محرکات کے زیرِ تحت کئی منزلوں سے گذرتی رہی لیکن ابتدائی چند دہائیوں میں چند مخصوص ادبی میلانات و نظریات نمایاں رہے۔ اس دور کے انگریزی ادب پر کلاسیکیت کا اطلاق کچھ زیادہ صحیح نہیں۔ کیونکہ جن اسالیب اور ہیئتوں کو ہم قدیم یونانی اور بعد کے اطالوی کلاسیکی ادب کے لازم عناصر سمجھتے ہیں وہ انگریزی کلاسیکی ادب میں ہم کو نہیں ملتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تحقیق و تفحص اور اعتدال و توازن کی خاطر انگریزی شعرا نشاۃ الثانیہ کے رومانی پرواز کے خلاف قدیم یونانی اور اطالوی شاعروں اور ادیبوں کی طرف رجوع ہوئے لیکن ان پر سب سے زیادہ اثر فرانسیسی کلاسیکیت کا رہا۔ سترھویں صدی کو فرانس کی تاریخ میں "عہدِ زریں" کہا گیا ہے۔ لوئی چہاردہم کے زمانے میں مطلق شہنشاہی اور درباری نفاستوں کا اثر عصری ادب پر پڑے بغیر

نہ رہ سکا۔ چنانچہ ادب میں انفرادیت اور تخیل کی بلند پروازیوں کی جگہ مخصوص اصول وضوابط نے لے لی اور جدت خیال سے زیادہ ندرتِ اسلوب اور قدما کی تقلید لازمی قرار دی گئی۔

چارلس دوئم کی جلاوطنی کے زمانہ میں انگریزی ادیبوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں کا ایک حلقہ فرانس اور فرانسیسی دربار سے متعلق رہا۔ وہ فرانس کی ادبی تحریکوں سے بہت متاثر ہوئے اور انھیں کی کوششوں سے انگریزی ادب اٹھارھویں صدی میں کلاسیکیت سے آشنا ہوسکا۔ غیر ملکی اثرات کے علاوہ انگریزی کلاسیکیت بہت حد تک تواریخی حالات کی بھی پیداوار ہے کیونکہ عوام وخواص میں اب جذبہ اور تخیل کی جگہ عقل اور استدلال کو ترجیح حاصل تھی۔ دور بحالی Restoration سے ہی عقل کو وجدان پر ترجیح دی جانے لگی تھی۔ مگر کلاسیکیت کے زیر اثر اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اس کے باوجود انگریزی کلاسیکیت یورپی ادب اور قومی مزاج کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت تھی کیونکہ وہاں فرانس کی طرح اصول پسندی اور انتہا پرستی کو راہ نہیں دی گئی۔ قومی مزاج میں دیگر عوامل بھی کارفرما ہے اور پوپ Pope کے باوجود اٹھارھویں صدی کے ادیبوں میں انفرادیت، جذبہ اور تخیل کا فقدان نہیں رہا۔ چنانچہ اس صدی کا انگریزی ادب نشاۃ الثانیہ کے داخلی اور غنائی، تخیلی اور تخلیقی عناصر سے یکسر معرّی نہیں۔

انگریزی کلاسیکیت مخصوص قومی مزاج سے متاثر ہونے کے باوجود فرانسیسی ادیبوں کے قائم کردہ اصول پر مبنی ہے۔ اس کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) <u>افادیت</u>:۔ جدید کلاسیکی ادب کا سب سے بڑا خاصہ اس کا افادی پہلو ہے۔ ہوریس کے زمانہ سے ہی ادب کے غنائی اور افادی Dulce Et Utile پہلوؤں پر خاص زور دیا گیا تھا لیکن اب اس افادیت نے اخلاقی صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ ہر جدید کلاسیکی شاعر کا نصب العین سماج کی اصلاح اور انسانیت کی تہذیب وتحسین قرار پایا۔

(۲) <u>توازن اور آہنگ</u>:۔ اس اصول کے تحت رومانی پرواز اور تخیل کی بے راہ روی کی شدید مخالفت کی گئی۔ "اعتدال" Sanity اور "بے تعلقی" Detachment نہ صرف قدما کی امتیازی خصوصیات تھیں بلکہ ڈرائیڈن، پوپ، اور جانسن کے یہاں بھی

ان خصوصیات کو خاص اہمیت حاصل رہی۔

(۳) قدما کی تقلید:- جدید کلاسیکی ادیبوں اور نقادوں کے نزدیک صالح ادب کے لئے روایات کا احترام اور اساتذہ کی تقلید لازمی ہے۔ چنانچہ انگلستان میں بھی یونانی، لاطینی اور فرانسیسی اساتذہ کی پیروی ضروری قرار پائی اس لئے کہ عام خیال یہ تھا کہ قدما کے فطری مطالعے حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کلیہ کی رو سے جدید شاعروں کا کام قدماء کے خیالات کو نئے انداز سے پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۴) ہیئت پرستی:- جدید کلاسیکیت کے اہم اصول و ضوابط میں ہیئت پرستی کو بھی دخل ہے کیونکہ اس زمانہ میں ادب کو مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ رزمیہ، بیانیہ، غنائی اور ڈرامائی شاعری کے لئے خاص اصول مقرر تھے اور ان سے انحراف کی اجازت نہیں تھی۔

(۵) کلیات و مسلمات Generalization:- قدماء کی تقلید میں جدید کلاسیکی شاعروں نے بھی فطرت اور کائنات کے عام قوانین اور حقائق پر کلیات کے پیرایہ میں روشنی ڈالی لیکن اس کوشش میں ان کی انفرادیت "مدرسیت" کے نذر ہو گئی اور ادب میں وہ رنگا رنگی نہیں پیدا ہو سکی جو اعلیٰ ادب کے لئے لازمی ہے۔

ہر نئی تحریک کی طرح جدید کلاسیکی تحریک بھی اپنے ساتھ چند برکتیں لائی۔ فن اور ادب کو خانقاہ اور ادب سے نکال کر انسانیت اور سماج سے قریب لانا اسی دور کا اکتساب ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ افادیت اور اعتدال کی جگہ کورانہ تقلید نے لے لی اور کسی قسم کے نئے خیال اور جذبہ کے اظہار کو ادبی کفر سے تعبیر کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے ہاتھوں جدید کلاسیکیت ایسی پستی کو پہونچ گئی کہ ورڈسورتھ اور دوسرے رومانی شاعروں کو اس کی خشک عقلیت اور میکانکی اصول پرستی کے خلاف جہاد کرنا پڑا۔ اسی ردعمل نے بالآخر رومانی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔

شاعری

داخلی نقطہ نگاہ سے ادب کا مطالعہ شاعروں اور ادیبوں کے ماخذ اور ان کے طریقۂ اظہار کا مطالعہ ہے جس کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ تخلیقی ادب کے صوری خصوصیات سے بحث کی جائے

انگریزی کلاسیکی شاعری جو محض فنی اور عروضی کمال کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھی ایک مضمون کو سو طرز پر باندھ کر اپنے خیال میں قدما کی تقلید کا حق ادا کرتی رہی۔ جذبہ اور احساس کا فقدان اس دور کی شاعری کے لئے ایسا مہلک ثابت ہوا کہ اس کا فطرت اور عام بنی نوع انسان سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور تنقید و تمحیص اور بحث و تکرار اس دور کے ادب کا مزاج بن کر رہ گیا۔

پوپ Pope سنہ ۱۶۸۸ء سے سنہ ۱۷۴۰ء

پوپ اپنے عہد کا ملک الشعراء رہا ہے۔ اس کے شعری مزاج میں اپنے زمانہ کے میلانات سے زیادہ روایات اور فطری رجحانات کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پیدائشی طور پر نقادانہ ذہنیت کا مالک تھا لیکن زمانہ کا تقاضہ تھا کہ وہ شاعری سے روبہ زوال سماج کی اخلاقی اصلاح کرے چنانچہ اس کی شاعری بھی اخلاقی مباحثوں اور ادبی معرکوں کی آئینہ دار ہے۔ اس کی شاعری اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں انگریزی ذہن کے تناقصات کی عکاسی کرتی ہے لیکن اس کی نظموں میں آزاد منشی اور رومانیت کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اس کے بعد وہ معاصرین کی ادبی صحافتوں کے خلاف مستقل جہاد کرتا رہا جس سے اس کی طنزیہ نظموں کو مواد ملا۔ اسی طرح دینی تشکک اور کج فہمیوں سے اس کی اخلاقی شاعری نے جنم لیا۔

پوپ کی شاعری اس وقت تک بے راہ روی کا شکار رہی۔ جب تک اس نے ڈرائیڈن کے کلام کا غائر مطالعہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر جانسن اس کو یہیں انگریزی شاعری کے بہترین نمونے دستیاب ہوئے۔ پوپ کی تخلیقات ابتدائی مرغزاری نظمیں Pastorals تھیں جو سنہ ۱۷۰۹ء میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانہ میں اس کے کرم فرما والش Walsh نے اسے "بے عیب" Correct شاعری سے روشناس کرایا اور قدما کی پیروی کی تلقین کی۔ چنانچہ پوپ کا مخصوص اسلوب بیان اور اس کی نرمی اور گھلاوٹ والش کی تعلیم ہی کی مرہون منت ہے اس کی ساری مرغزاری نظمیں صرف اس خیال کے تحت لکھی گئیں کہ قدما نے اسے رزمیہ، بیانیہ، ڈرامائی اور غنائی شاعری کے ساتھ مخصوص صنف قرار دیا تھا اور اس کے مستقل اصول متعین تھے۔ پوپ نے بھی اپنی نظموں میں گڈریوں کی زندگی اور ان کے خیالات و

جذبات کو نہایت سادگی سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے اس نے قدیم دور کے تشبیہات و استعارات سے خیالی پیکر بنائے لیکن اس کے ابتدائی کلام کی نرمی اور غنائیت رومانی شاعری سے بالکل مختلف ہے۔

اتفاق کی بات کہ جس مجموعہ Miscellany میں پوپ کی مرغزاری نظمیں شائع ہوئیں اسی میں اس کے ہمعصر شاعر "ایمبروز فلپس" Ambrose Phillips کی چند نظمیں بھی شامل کر لی گئیں۔ دونوں شاعروں کی خوب تعریفیں ہوئیں اور پوپ نے بھی اپنے رفیق کی مداحی میں فراخدلی سے کام لیا لیکن حالات نے جلد ہی پلٹا کھایا اور فلپس کو پوپ پر ترجیح دی جانے لگی۔ پوپ اس ستم ظریفی پر بہت کڑھا اور اس نے اپنی پہلی طنزیہ نظم میں اپنے رقیب کی "حسین دہقانیت" کا بڑا مذاق اڑایا۔ یہاں پہونچ کر اس کی ابتدائی شاعری کا دور ختم ہو گیا۔

پوپ نے نشاۃ الثانیہ اور کلاسیکیت کے شعری اصول کی تلقین اپنی مشہور نظم "تنقید" The Essay On Criticism میں کی۔ یہ نظم ۱۷۱۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے پہلے حصّہ میں شاعر نے اپنے دور کی تنقید کی زبوں حالی پر نوحہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک فطرت کا مطالعہ اور قدمائی تقلید اعلیٰ شاعری کے لئے ضروری ہے۔ نظم کے دوسرے حصّہ میں وہ اپنے اصول و ضوابط کی تشریح کرتے ہوئے مشاعروں کا مذاق اڑاتا ہے اور شاعری کے صوری خصوصیات کو معنویت پر ترجیح دیتا ہے۔ تیسرے حصّہ میں اس نے انگریزی تنقید پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اعلیٰ تنقید کی خوبیاں گنائی ہیں۔ اس نظم میں مرکزیت اور تسلسل خیال نہیں ہے لیکن اس سے پوپ کا نقطۂ نظر بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اس نے "داخلی تنقید" Subjective Criticism کی سخت ملامت کی ہے اور ایسے تمام نقادوں کی گرفت کی ہے جو ذاتی پسند و ناپسند کے معیار پر ادبی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہیں۔ کوئی ناقد خیالات کے اچھوتے پن پر سر دھنتا ہے تو کوئی زبان کی نزاکتوں کا قائل ہے۔ ایسوں کی بھی کمی نہیں جو ساری شاعری کا دارومدار آہنگ Harmony پر ہی سمجھے ہوئے ہیں۔ پوپ خود کلاسیکی اعتدال اور معروضیت کا قائل ہے اور کسی کو اس راستہ سے گمراہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

پوپ کی شاہکار نظم Rape Of The Lock ہے جس میں اس نے ایک معمولی واقعہ کو مزاحیہ رزمیہ Mock-Heroic انداز میں پیش کیا ہے. کسی من چلے نوجوان نے مارے حسد کے اپنی محبوبہ کے گیسو تراش لئے تھے جس پر دونوں خاندانوں میں رنجش پیدا ہو گئی۔ پوپ نے اپنے دوست کی تحریک پر اپنی نظم کے ذریعہ مفاہمت کی کوشش کی لیکن وہ خود دوسری طرف بہک گیا اور نظم طنزیہ رزم نگاری کا نمونہ بن گئی. اس نظم میں اس نے نہ صرف اٹھارھویں صدی کی معاشرت کا خاکہ اڑایا ہے بلکہ "صنف نازک" پر بھی طنز کئے جن سے چوٹ کے بجائے گدگدی محسوس ہوتی ہے۔ دور بحالی سے ہی فیشن پرست خواتین اپنی انتہا پسندی سے طبع سلیم پر بار بننے لگی تھیں مگر اٹھارھویں صدی کے اوائل میں لندن میں چاروں طرف غازہ اور پاوڈر کا ہی سامراج تھا چنانچہ پوپ نے اپنی نظم میں سب سے زیادہ توجہ صنف نازک کی فیشن پرستیوں، خام خیالیوں، جلوہ نمائیوں اور بے وفائیوں پر صرف کی ہے اور اسی سلسلہ میں اپنے دور کے بانکوں کی شاہ بازیوں اور سرمستیوں کو بھی آڑے ہاتھ لیا ہے۔ اگر معشوقوں میں سحر خیزی، نخرہ اور فیشن پرستی عام ہیں تو عاشقوں کی مخصوص حماقتیں بھی کم قابل لحاظ نہیں. پوپ نے نظم کی ہیروئن مس آرابیلا Miss Arabella Fermor کو نہایت خلوص سے یقین دلایا ہے کہ ان کے گیسو مستقبل قریب میں آسمان کے تابندہ شہاب بنیں گے لہذا انھیں لارڈ پیٹر Lord-Peter کا شکر گذار ہونا چاہیئے جنھوں نے ان کی شہرت کا سامان کیا ہے. کیونکہ تمام عشاق اس چمکتے تارے کو محبت کی دیوی Venus سمجھ کر خراج عقیدت پیش کریں گے اور اس طرح انھیں شہرت عام و بقائے دوام حاصل ہوگی۔

پوپ کی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی اس کا رزمیہ اسلوب ہے. شاعر نے بزم کے مضمون کو رزم کے رنگ میں باندھ کر جو جدت طرازی کی ہے وہ اسی کا حصہ ہے. اردو غزل میں محبوب کے سلسلہ میں تیر و کمان، دشنہ و خنجر کے استعمال میں موضوع سنجیدہ ہو جاتا ہے مگر پوپ رزمیہ تشبیہات کے استعمال اور مافوق الفطرت عناصر اور مخلوقات کی شرکت سے ہمیں مضحکہ خیز سطحیت کی طرف لے جاتا ہے۔

اخلاقی اور طنزیہ نظموں سے اگر ایک طرف پوپ کی شہرت بڑھ رہی تھی تو دوسری طرف

اس کے مخالفین کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جارہا تھا۔ بارگاہ ادب میں سرخروئی حاصل کرنے کے لئے قشاعروں اور احمقوں نے اپنا الگ محاذ بنالیا جس کے خلاف پوپ اور سوفٹ دونوں کو میدان میں اترنا پڑا۔ پوپ کی مشہور نظم "احمقنامہ" -Dunciad سوفٹ کی شہ پر لکھی گئی جسمیں اس نے اپنے تمام ادبی حریفوں کو طشت از بام کیا ہے۔ سب سے زیادہ توجہ اس نے قشاعروں کے رہناؤں یعنی لارڈ ہاروے Lord Harvey اور لارڈ مانٹیگ Lord Montague پر صرف کی جو شاعر کی دلآزاری میں سب سے آگے تھے۔ اپنے مطمح نظر کی وضاحت کرتے ہوئے پوپ نے اپنے کرم فرما ڈاکٹر آربتھنوٹ کو لکھا کہ اس کا مقصد طنز سے کسی کی دلآزاری نہیں بلکہ سماج میں اعتدال لانا ہے۔

پوپ کی نیم اخلاقی اور نیم حکیمانہ نظم "انسان" Essay On Man ۱۷۳۴ء میں منظر عام پر آئی۔ یہاں اس کی جدت و اختراع کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس نے جدید کلاسیکی خیالات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کر کے "فلسفہ" کا حق ادا کیا ہے۔ اس نظم میں بھی شاعر نے قدما کی تقلید اور "فطرت" کے مطالعہ پر زور دیا ہے۔ مگر یہ امر ملحوظ رہے کہ پوپ نے "فطرت" سے مراد انسانی فطرت اور مروجہ عادات و اطوار لئے ہیں اس لئے اسے رومانی شعراء کے "نیچر" سے کوئی علاقہ نہیں۔

پوپ اپنے دور کا سب سے بڑا نمایندہ شاعر ہے۔ اس لئے لازمی طور پر اس کے شعری مزاج میں طنز و مزاح کا بڑا حصہ ہے۔ اس دور کے سماجی مطالبوں نے اسے اخلاقیات کی طرف مائل کیا لیکن اس کا اصل کمال طنز ہی ہے۔ اس کی تمام شاہکار نظموں میں طنز و مزاح کے ساتھ اخلاقیات کی بھی تلقین ہے۔ اس کا آخری کارنامہ "احمقنامۂ جدید" The New Dunciad اس امر کی دلیل ہے کہ شاعر نے آخر وقت تک اپنے زمانہ سے مفاہمت نہیں کی۔ پوپ جدید کلاسیکی مدرسہ کا بانی اور قائد تھا۔ اس نے رومانی تخیل کی بے راہ روی پر لگام لگائے اور اپنے "رجزیہ بحر" Heroic Couplet کے ذریعہ انگریزی زبان کی صفائی اور سلاست میں قابل قدر حصہ لیا۔ اس کا اثر رومانی دور کے شاعروں میں بائرن تک کے یہاں محسوس کیا جاسکتا ہے۔

<u>تفریحی شاعری</u> :۔ جدید کلاسیکی شاعری کا اطلاق صحیح معنوں میں پوپ کی شاعری کے لئے ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے معاصرین نے اگرچہ قدما کی تقلید کی لیکن ان کے شعری مزاج اور فطری صلاحیتوں میں بڑا اختلاف رہا۔ چنانچہ اس دور کے شاعروں میں ہمیں ایک ایسا گروہ بھی نظر آتا ہے جو جدید کلاسیکی مدرسہ سے وابستہ رہنے کے باوجود اس کے اصول و ضوابط کو برتنے سے قاصر رہا۔ ان شاعروں پر فرانسیسی شاعر Saint Evere-Mond کا اثر غالب رہا اسی لئے ان کی شاعری میں بھی عشقیہ اور تفریحی عناصر زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ سوفٹ Swift ، پرائر Prior اور گے Gay اس مدرسے کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھوں نے پوپ کے "رجزیہ بحر" کی بجائے بٹلر کی تقلید کی۔

جدید کلاسیکی دور کی شاعری کے متعلق یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ یہاں جذبات و احساسات کے لئے کوئی جگہ نہیں اس لئے کہ خارجیت اور دبستانی نصابیت کے باوجود اس دور کی شاعری میں چند منفرد نمونے ملتے ہیں جن پر رومانیت کا دھوکا ہوتا ہے۔ پوپ کے ابتدائی کلام اور ٹکل Tickell اور پارنل Parnell کی شاعری میں داخلی عناصر ملتے ہیں اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں کاؤپر Cowper اور کالنس Collins نے اس لے کو اور بڑھایا یہاں تک کہ رومانی تحریک سے شاعری کے تمام بنیادی نظریات بدل گئے۔

نثر

(۱) <u>معاشرتی تنقید</u> :۔

جدید کلاسیکی عہد میں آزاد تحقیق و تفتیش کے لئے نہ صرف موقع بہم ہوئے بلکہ ان میں نئے امکانات اور نئی وسعتیں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر شاعری سے زیادہ نثر میں روح عصر کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں چونکہ نثر نگاروں کے لئے ہیئت کا مسئلہ اس قدر اہم نہیں تھا جتنا شاعروں کے لئے۔ اس لئے وہ خیالات کے ذریعے ہی بحث و تکرار میں حصہ لیتے اور پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرتے تھے۔ ادب کا افادی پہلو اس زمانہ تک کافی اہمیت حاصل کر چکا تھا۔ اس وجہ سے اٹھارھویں صدی کے نثر نگاروں کے اسلوب بیان

کی ہم آج تک تقلید کرتے ہیں۔ اس نثر میں جو صفائی، صلاحیت اور لچک ہے وہ اس سے پہلے کسی دور میں ممکن نہیں تھی۔

اس دور کے تمام نثر نگاروں کے یہاں مشترک خصوصیات ملتی ہیں۔ البتہ چند ایسے ادیب بھی ہیں جن کے یہاں عقلیت کے علاوہ دوسرے عناصر اور عوامل بھی شامل ہیں۔ ایڈیسن Addison کے اسلوب بیان میں ایک مخصوص کیفیت ہے جو اسی سے منسوب کی جاسکتی ہے۔ سوفٹ Swift کا انداز اور آہنگ سب سے منفرد ہے۔ اٹھارھویں صدی میں طنزیہ میلان ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔ شاعری کا بیشتر حصہ طنز ہی کی شکل میں ہے لیکن پوپ کے بعد شاعری میں اس کی زیادہ گنجائش نہیں رہی۔ ...ر تنقید کا سب سے اہم ذریعہ Medium نثر ہی بن سکی اسی لئے ادیبوں اور فنکاروں نے طربیہ ڈراموں، افسانوں اور انشائیوں میں اپنے دور کی پوری نمایندگی کی۔ مباحثہ سے مباحثے پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان کا سلسلہ بدستور قایم رہے تو نتیجہ تشکیک Scepticism ہے سوفٹ کا داخلی انتشار اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے۔

"سوفٹ"

سوفٹ کلاسیکی دور کا سب سے بڑا ادیب اور فنکار ہے۔ اس کے یہاں فن اور ہیئت پرستی سے زیادہ تخلیقی عنصر غالب ہے۔ چنانچہ وہ مروجہ اقدار کی تنقید کو اس حد تک لے جاتا ہے جہاں خود "زندگی" خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہاں اعتدال کی تلاش میں جذباتی عقلیت کو بھی دخل ہے جسے اس کے بے پناہ جذبہ تنفر سے ممتاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

معاشرتی تنقید میں سوفٹ اپنے تمام معاصرین سے ممتاز ہے لیکن اس کا فن انشا پردازوں اور طربیہ نگاروں سے بہت مختلف ہے۔ طربیہ نگار انسانی کمزوریوں پر طنز کرتے ہوئے بھی گدگداتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک مزاح و تمسخر ہی تمام کمزوریوں اور خامیوں کا علاج ہے۔ مگر طنز نگار ایسا پیغمبر ہوتا ہے جس کی آنکھوں سے التباسات Illusion کے پردے ہٹے ہوتے ہیں اور جس کے نزدیک مروجہ سماج میں اعلیٰ اقدار سطحیت بدمذاقیوں اور

بے ہنوا انیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ سوفٹ کی طنز نگاری کے پیچھے بھی یہی عوامل کام کر رہے تھے۔ وہ خود ایک تصور پرست اور حساس انسان تھا اسلئے اپنے زمانہ کی اخلاقی اور معاشرتی پستیوں کو نظر انداز کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں بلند و... طبقوں کی ترقی سے اخلاق و اقتدار، مادیت اور خود غرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائے جا چکے تھے اور عام لوگوں میں بھی گناہوں سے رغبت اور نیکیوں سے نفرت کا عام میلان تھا۔ یہی نہیں بلکہ ادب، سیاست، مذہب اور فلسفہ و سائنس کی دنیا میں بھی سفلوں اور ریاکاروں کی حکومت تھی۔ سوفٹ کے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ اس نے مثالی اور واقعی کا تضاد محسوس کرتے ہوئے بے دردی کے ساتھ تنقید کی لیکن اس نے "افراد" کی بجائے "سماج" کو اپنا ہدف ملامت بنایا۔ اس کے نثری کارنامے طنزیہ ادب کے شاہکار ہیں۔

سوفٹ کی طنزیہ تصنیفوں میں "کتابوں کی جنگ" (۱۶۹۷ء The Battle of Books) تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک ہمعصر بوائل Boyle نے جب چند کلاسیکی اساتذہ کے خطوط شائع کئے تو جدید اور قدیم فنکاروں کی اہمیت اور عظمت کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں دونوں طرف سے صف آرائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ سوفٹ نے اس معرکہ میں اپنے کرم فرما سر ولیم ٹمپل Sir William Temple کی حمایت میں قدما کی عظمت کا اعلان کیا۔ چنانچہ اس کی کتاب میں طنزیہ سے زیادہ ادبی رنگ غالب ہے۔ جدید شعرا اور ادبا مکڑیوں کی طرح ایک مخصوص ماحول میں اپنی آنتوں کے لعاب سے جالے بنتے ہیں لیکن قدما شہد کی مکھیوں کی طرح فطرت و کائنات کا احاطہ کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو روشنی اور شیرینی بخشتے ہیں۔ یہاں ضمناً سوفٹ نے اپنے ادبی حریفوں اور نام نہاد عالموں پر بھی چوٹ کی ہے۔ جو "عنوانوں" Titles اور "اشاریوں" Indexes کے زور پر علم کے خزانے کی تلاش کرتے ہیں۔

مذہبی طنز نگاری میں سوفٹ کی Tale of A Tub صحیح معنوں میں شاہکار ہے۔ اس نے کتابوں کی جنگ میں تعریضاً حصہ لیا تھا لیکن مذہب کو وہ آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کتاب میں سوفٹ نے "عیسائیت" کو موضوع سخن بنایا۔ عیسائیوں میں سوا...

صدی سے ہی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دو طبقے ہو گئے تھے اور اس کے بعد پھر پروٹسٹنٹ عیسائی بھی لوتھر Luther اور کالون Colvin کے پیروؤں میں تقسیم ہو گئے۔ اسی طرح سوفٹ ہمیں "پیٹر" Peter، مارٹن Martin اور جیک Jack تینوں بھائیوں کی کہانی سناتا ہے جنھیں اپنے باپ سے ترکہ میں سچے مذہب کا لبادہ ملا ہے۔ یہ تینوں بھائی پردیس جا کر تین عورتوں کے دام محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ جو "ملکۂ زر" Duches d'Argent، "بیگم حرص" Madame de Grand Titres اور "شہزادی غرور" Countess d'orgueil کے نام سے مشہور ہیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ان بھائیوں کا فطری جوہر نکھرنے لگا۔" وہ لکھتے پڑھتے، گالی گلوج کرتے، رزم بزم سجاتے، قسمیں کھاتے اور قرض سے بے حال ہو کر قرضخواہوں کی بیویوں سے ساز باز کرتے .... وہ ایسے ممبران اسمبلی کی خدمت میں حاضر رہتے جو ایوانوں میں خاموش اور قہوہ خانوں میں مُنہ زور ہوتے ؛؛ عامیوں میں شہرت کے باوجود ان بھائیوں کا گذر رؤساء میں نہیں ہو پاتا کیونکہ ہوٹلوں کے بیرے انکی وضع قطع دیکھ کر دور ہی سے راستہ بتاتے اور سرایوں کی خادمائیں انھیں ٹھرے سے بھی نہیں نوازتیں۔

پردیس میں ان تینوں بھائیوں کو اپنی ہتک پر تاؤ آیا لیکن کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ لیکن ایسے کٹھن موقع پر بڑے بھائی پیٹر Petre کی ذہانت کام آئی جس نے ارسطو کے علم کلام اور علم تشریح پر خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ اس نے باپ کے وصیتنامے کی تفسیر یوں کی کہ "جب تم اس لائق ہو جاؤ کہ اپنے لبادوں پر زری کا کام کرا سکو تو اس میں مضائقہ نہیں،" سب نے اس پر آمین کہا۔ اس قول پر سب سے پہلے بڑے بھائی نے عمل کیا جواب "فادر پیٹر" Father Petre کہلانے لگا۔ اس نے عجیب و غریب انکشافات، معجزات اور اجتہادات سے اپنی شہرت کے چار چاند لگا دیئے۔ بڑے بھائی کی روز افزوں ترقی دیکھ کر دونوں چھوٹے بھائیوں کو تاؤ آیا۔ جیک نے مارٹن سے کہا کہ اس لبادہ کو چیر پھاڑ کر کنارے کر دو تاکہ اس بدمعاش پیٹر سے ہمارا کوئی ظاہری رشتہ

نہ ثابت ہو لیکن مارٹن نے عقلِ سلیم کو اپنا رہنما بنایا اور محض آرائشی زیورات سے ہی کنارہ کشی کی۔ جیک اس حرکت سے بددل ہو کر دوسرے ملک (آئرلینڈ) چلا گیا جہاں اس کے پیروؤں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہاں اس نے نئے گل کھلائے اور اپنے پرستاروں پر اپنی دھاک جمادی۔ اسے جب کبھی کوئی نئی شرارت کرنی ہوتی تو گھٹنے نیچے کر کے آنکھیں اوپر کر لیتا اور سجدہ میں گر جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اپنے ملک میں نئے انداز سے "رینکنے" کی بھی تلقین کی جس سے اصل و نقل میں تمیز مشکل ہو جاتی۔ آخر آخر تو اسے ایک خاص عارضہ لاحق ہو گیا تھا اس لئے کہ وہ موسیقی کی آواز سنتے ہی مارے وحشت کے لوٹنے لگتا۔ مگر اس کا علاج وہ قحبہ خانوں میں جا کر خود کر لیتا تھا۔

سوفٹ نے اپنی اس کتاب میں کیتھولک اور مخالف پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی دھجیاں اڑادیں لیکن خود پروٹسٹنٹ بھی اس زد میں آ گئے۔ اس سے مذہبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ رہا اور خود سوفٹ کی منصبی ترقی رک گئی۔

۱۷۲۶ء تک سوفٹ کی زندگی نہ صرف بیحد غمناک ہو گئی تھی بلکہ اس کی انسان بیزاری بھی پوری طرح نمایاں ہونے لگی تھی "گلیور کے سفر نامے" Gulliver's Travels مصنف کے اس دور کے روحانی اضطراب اور ذہنی خلفشار کا نتیجہ ہے۔ "للی پٹ" Lilliput اور "براب ڈنگ نیگ" Brobdingnag کے سفر ناموں میں وہ انسانوں کو ان کی کمزوریوں کا شدید طور پر احساس دلاتا ہے۔ بونوں کے ملک میں جو سازشیں، جعل سازیاں اور ریاکاریاں عام ہیں۔ وہ ہماری دنیا کا ہی عکس لئے ہوئے ہے ادب، مذہب، سیاست اور معاشرت غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں بدنظمی اور طوائف الملوکی ہے۔ للی پٹ کے باشندوں کا سب سے بڑا مرحلہ یہ تھا کہ جوتوں کی ایڑیاں اونچی ہوں یا نیچی یا انڈے بڑے سروں سے کاٹے جائیں یا چھوٹے سرے سے۔ یہی مسائل دوسرے سفر نامہ میں نئی ہیئت سے پیش کئے گئے ہیں۔ "لاپوٹا" Laputa کے لوگ بھی انگلستان کے باشندوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ وہ عقلِ سلیم سے کام نہ لے کر فوراً اشتعال کی آگ میں جل جانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان جزائر کی عورتیں اپنے خاوندوں کو برا

بھلا کہتیں اور غیر محرم مردوں سے اپنی خواب گاہوں کی رونق بڑھاتی ہیں۔ انکی "اکیڈمی" کھیرے سے سورج کی روشنی حاصل کرنے کے لئے تجربے کرتی ہے۔

سوفٹ نے ان جزائر کے "مدرسہ لسانیات" پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ جب معلمین اپنے مباحثوں میں افعال وصفات کو ختم کرنے کی اسکیم پر غور کرنے کے بعد اشارہ کنایہ کی اہمیت پر زور دے ہی رہے تھے تو جاہلوں اور عورتوں کا ایک طبقہ چیخ پڑا کہ انھیں ان کے موروثی حقوق سے بے دخل نہ کیا جائے اور شور وواویلا کی پوری اجازت دی جائے۔ اس مداخلت سے معاملہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔

اس ملک میں ٹیکس وصول کرنے کے بھی عجیب وغریب طریقے ہیں۔ شہریوں پر ان کے ہمسایوں کی رائے سے ٹیکس لگتے ہیں لیکن سب سے زیادہ ٹیکس ان لوگوں پر لگتا ہے جو صنف نازک میں زیادہ باریاب یا مقبول ہیں۔ عورتوں پر ان کے حسن وجمال اور فیشن پرستی کے لحاظ سے ٹیکس لگائے جاتے ہیں جسکا تعین وہ خود کرتی ہیں۔

"گھوڑوں کے ملک کا سفر"

سوفٹ کا مثالی ملک ہے جہاں ایمانداری، دوستی اور رواداری بڑی خوبیاں مانی جاتی ہیں۔ گھوڑ موہنوں کے برخلاف "یاہوؤں" Yahoos کی زندگی اسی قدر کثیف اور نفرت انگیز ہے جس قدر انگریزوں کی۔ سوفٹ نے یہاں انگلستان کی سماجی اور اخلاقی زندگی پر بڑا جارحانہ طنز کیا ہے۔

گلیور اپنے مالک کو انگریزوں کی سیاحت کا راز بتاتا ہے کہ ان میں سے کچھ سیاح تو قانونی مجرم ہوتے ہیں اور کچھ شرابی اور عیاش۔ کچھ سیاسی سازشوں کی وجہ سے بھاگ نکلتے ہیں تو دوسرے قتل، چوری، ڈکیتی اور جعل سازیوں سے بچنے کے لئے دوسرے نوآبادیوں کا رُخ کرتے ہیں۔

دو ملکوں میں جنگ بادشاہوں کی ہوس اور وزیروں کی نااہلی سے ہوتی ہے۔ وزیر اعظم عموماً ایسا جانور ہوتا ہے جو حسرت وغم، محبت ونفرت اور رحم وغصہ سے بالکل بے نیاز رہتا ہے۔ اس کو بس دولت اور جاہ ومنصب کی ہوس ہوتی ہے اور اس

کے لئے وہ اپنے عزت و ناموس کو بھی قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔

سوفٹ نے گھوڑوں کے ملک کو اپنا مثالی ملک تصور کیا ہے جہاں زندگی کا نظام ایمانداری، محنت اور دوستی و رواداری پر مبنی ہے، جہاں مردوں میں شجاعت اور عورتوں میں نسائیت کی قدر ہے اور عام طور پر فطری اور سادہ زندگی کو معیار سمجھا جاتا ہے۔

سوفٹ کی تصانیف اس کے مزاج اور فطرت کا آئینہ ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہمیں اس کی ذہنی صلاحیت، اس کے اصول و اقدار اور پسند و ناپسند کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس کا طنز تلخی اور بیزاری کی حد تک بڑھ جانے سے انسانی دردمندی اور اعلیٰ اقدار سے محروم ہے۔ ادب، معاشرت اور سیاست میں وہ جن اقدار کا قائل تھا ان کا فقدان اس کے لئے سوہانِ روح تھا اسی لئے اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ مردم بیزار ہوگیا اور اس کے رشحات کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

بحیثیت ایک طنز نگار کے اگرچہ سوفٹ نے معاشرتی تنقید کو نفرت اور انسان دشمنی کی حد تک پہنچا دیا لیکن اس کی ادبی اور تاریخی حیثیت مسلّم ہے۔ وہ ادبی، مذہبی اور معاشرتی طنز نگاری میں سب پر بھاری ہے۔ اس کے یہاں جو توانائی اور انفرادیت ملتی ہے وہ بہت کم لوگوں کا حصّہ ہے۔ اڈیسن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ سوفٹ اپنی صدی کا سب سے بڑا ذہین ادیب تھا جس کے یہاں جدت خیال اور ندرتِ بیان کے ساتھ احساسات کی گہرائی اور جذبات کا زور بھی ہے

ب "بورژوا ادب"

تاریخی اعتبار سے ڈیفو، اسٹیل اور اڈیسن کلاسیکی عہد کے ابتدائی دور کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے سماجی اور اخلاقی رجحانات بھی کلاسیکی اقدار سے قریب ہیں لیکن وہ اگر اپنے دور کے نمائندے ہیں تو ان کے کارناموں میں مستقبل کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ان ادیبوں کے یہاں درمیانی طبقہ کی نمائندگی کی وجہ سے ایک مشترک میلان نظر آتا ہے جو انھیں پوپ اور سوفٹ کی بجائے رچارڈسن Richardson سے

نزدیک کر دیتا ہے۔ یہی زیریں لہر آگے چل کر رومانی تحریک کا محرک ہوئی۔

اٹھارھویں صدی کی ابتدائی دہائیوں تک سماج میں طبقاتی نظام باقی تھا اور رؤسا و امرا سیاست اور حکومت میں ممتاز تھے۔ چنانچہ علم و ادب کے مذاق و میلان کے تعین کے لئے لوگ اب بھی ان کی زندگی کو نمونے کے طور پر سامنے رکھتے تھے۔ مگر ۱۶۸۸ء سے اعلیٰ درمیانی طبقہ خاندانی رؤسا سے طاقت و اقتدار میں ہمسری کرنے لگا اور انگریزی ادب میں نئے رجحانات نمایاں ہونے لگے۔ یہاں آکر انگریزی کلاسیکیت صحیح معنوں میں قومی مزاج سے ہم آہنگ ہوگئی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ پوپ اور سوفٹ انگریزی مزاج سے واقف نہیں تھے۔ ان کی تصنیفیں بہت حد تک خواص کے مزاج و معاشرت کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ڈیفو اور اڈیسن و اسٹیل جیسے انشا پردازوں نے عوام تک رسائی حاصل کی۔ ان کا فن بالخصوص اوسط طبقہ کی ذہنی اور نفسیاتی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور یہیں سے ادب میں اخلاقی اور جمالیاتی عناصر اہمیت کے ساتھ جگہ پانے لگتے ہیں۔

ڈینیل ڈیفو Daniel Defoe ۱۶۶۰ء سے ۱۷۳۱ء

ڈیفو کی پیدائش لندن میں ہوئی لیکن وہ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ انگریزی ادب میں وہ درمیانی طبقہ کے لوگوں کی معاشرت اور ذہنیت کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ اس کے اعلیٰ ادبی شعور نے اس کو اپنے ملک اور اپنے دور کی قید و بند سے آزاد رکھا جس کی وجہ سے اس کے کارناموں میں ہم کو مستقبل کی جھلک اور آہٹ ملتی ہے۔

ڈیفو کی تصنیفیں اس قدر مختلف النوع مضامین پر مشتمل ہیں کہ انھیں چند مخصوص رجحانات کے تحت تقسیم کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سماجی اور اخلاقی مسائل پر بحث کرتے ہوئے وہ بھی پہلی دفعہ درمیانی طبقہ کے لوگوں بالخصوص تاجروں اور دوکانداروں کے ذہن و مزاج سے آشنا کراتا ہے۔ وہ ان کے خیالات و جذبات اور سماج اور اخلاق سے متعلق تمام تصورات کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس لحاظ سے "انگریز تاجر" The Complete English Tradesman اور "شریف انگریز" The Complete English Gentleman نہایت

اہم کارنامے ہیں۔ یہاں مصنف نے اپنے دور کے اس سماجی بحران کا خاکہ پیش کیا ہے جس میں درمیانی طبقے کے لوگ شرفا اور امراء سے ہمسری کرنے لگے تھے۔ ڈیفو مشاہدہ کا ایک خاص ملکہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ واقعات و معاملات کا جس حسن و خوبی سے وہ تجزیہ کرتا ہے وہ اس دور میں اسی کا حصہ ہے۔ مشاہدہ اور واقعہ نگاری کے علاوہ ڈیفو کی اخلاقیات بھی کچھ کم اہم نہیں۔ وہ اپنے معاصرین کے مخصوص اخلاقی نظریۂ فن سے کافی متاثر تھا اور خود اس کی طبیعت کا بھی تقاضا یہی تھا اس لئے اس نے اپنی تمام تصنیفوں میں افادی اور اخلاقی پہلو کو مقدم رکھا۔ یہ میلان اس کی تمام ادبی زندگی میں قائم رہا۔ چنانچہ رابن سن کروسو Robinson Crusoe جیسے شاہکار کا بھی ایک اہم پہلو نظر انداز ہو جائے گا اگر ہم ہیرو کی سرگزشت میں مشیت اور قضا و قدر کی کارفرمائی کو بھول جائیں۔

ڈیفو کی شہرت و مقبولیت میں اس کے مہماتی ناولوں Novels of Adventure کا بڑا حصہ ہے۔ یہ افسانے تخیل کے شاعرانہ پرواز ہی نہیں بلکہ حقایق کی دستاویز بھی ہیں۔

Robinson Crusoe نہ صرف اٹھارھویں صدی میں مقبول عام ہوا بلکہ آج بھی اس کی اہمیت باقی ہے۔ اس میں اس نے طوفان کے مارے ایک انسان کی سرگزشت بیان کی ہے جس نے نامساعد حالات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور قدرت کی اندھی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما رہا Captain Singleton اور Moll Flanders بھی اپنی نوعیت کے مشہور کارنامے ہیں۔ یہ سارے افسانے سفرناموں، روزنامچوں اور حقیقی واقعوں سے ماخوذ ہیں لیکن ان کی تشکیل میں ڈیفو نے اعلیٰ فن کاری اور قوت تخیل کا ثبوت دیا ہے۔ رابنسن کروسو کی زندگی نسلاً نسل تک انسان کی قدرت کے ساتھ نبرد آزمائی کا تمثیلی افسانہ بنا رہا۔ انسانی زندگی سے ڈیفو نے اپنے آفاقی مسائل کو اپنے فن کا جز بنایا ہے جس کی قدر ہر زمانہ میں ہو سکتی ہے۔

ڈیفو کی عظمت کا راز نہ تو اس کے اخلاقی دلائل میں ہے اور نہ اس کے ظاہری

محاسن ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت زندگی کے عملی رخ سے ماہرانہ واقفیت اور تخلیقی تخیل ہے جس میں توانائی اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے نثری کارناموں میں شاعرانہ عناصر بھی قابل لحاظ ہیں۔ وہ اپنے دور کی کلاسیکیت کے باوجود ایک منفرد شخصیت اور اعلیٰ ادبی روایات کا حامل ہے۔

ایڈیسن اور اسٹیل

ایڈیسن اور اسٹیل ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کے مزاجوں کے درمیان بڑا فرق ہے مگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہیں۔ دور کلاسیکیت میں ان دونوں نثر نگاروں کا مشترکہ رسالہ The Spectator درمیانی طبقہ کی معاشرت اور فکر و فن میں ان کے میلانات کی نمائندگی کرتا ہے۔

ایڈیسن (۱۶۷۲ء ۔ ۱۷۱۹ء)

ایڈیسن امتیازی طور پر کلاسیکی ہے۔ اس کا مزاج اور اس کی زندگی ایک حسین توازن اور اعتدال کا نمونہ ہیں جن پر کسی باغیانہ میلان یا تشکیک کا شائبہ نہیں پڑا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے نظریۂ فن اور اصولِ اخلاق ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ رہے۔

اپنے رفیق اور ہمعصر اسٹیل کی طرح ایڈیسن نے بھی ادبی زندگی معاشرتی اصلاح کے خیال سے شروع کی۔ سب سے پہلے Tatler اور اس کے بعد Spectator کے ذریعہ دونوں نے درمیانی طبقہ کے ادب کے بہترین نمونے پیش کئے۔ موخرالذکر رسالہ کئی اعتبار سے اپنے دور کے دوسرے رسالوں سے ممتاز تھا۔ اس میں عارضی مسائل سے قطع نظر ادبی، فلسفیانہ اور سیاسی معاملات پر بحثیں ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی شگفتہ طنز و مزاح کو بھی دخل ہوتا جس سے مضامین کی مقبولیت بڑھ جاتی۔ اگرچہ ان مضامین میں اخلاقی عنصر غالب رہا جسے ہم آج زیادہ دلچسپ نہیں پاتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان سے بہتر اس دور کی معاشرتی زندگی کے نقشے بہت کم ملتے ہیں۔ انسانی تعلقات کے طربیہ کا جس فنکارانہ انداز سے داخلی اور خارجی مطالعہ یہاں کیا گیا ہے وہ تعریف سے بے نیاز ہے۔ اگرچہ اصلاح کی خاطر جا بجا طنز و مزاح کا بھی استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے کسی کی دل شکنی نہیں مقصود تھی۔ لکھنے والوں نے ہمیشہ اپنی

پبلک کے ساتھ ہمدردانہ تعاون قائم رکھا۔ زندگی بسر کرنے کا طریقہ۔ گھریلو زندگی کی ذمہ داری
سچی خدمت کے اصول اور تفریح و تماشہ سے لے کر دعا و مناجات تک تمام معاملات و مسائل پر
ہدایت کاروں نے روشنی ڈالی ہے۔ ان تمام مضامین میں ایک قسم کا افسانوی تسلسل ملتا ہے
جیسے دیہاتی رئیس سر راجر Sir Roger کی شخصیت مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس
کردار کا خاکہ اسٹیل نے تیار کیا لیکن رنگ بھرنے کی ذمہ داری ایڈیسن نے خود اپنے اوپر لی۔
راجر کی زندگی سادگی، نیکی، شرافت اور زندہ دلی کا نمونہ تھی۔

ایڈیسن نے تقریباً چار سو مضامین ایک ہی ضخامت کے اور ایک ہی انداز میں لکھے۔ اگر
ان مضامین میں عصری زندگی کے معاشرتی پہلو اور اس کے نقوش واضح طور پر ملتے ہیں لیکن
ان میں ایک آفاقی لہر بھی موجود ہے جس سے مصنف کے غایت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔
ایڈیسن کے متعلق بجا طور پر کہا گیا ہے کہ اس نے علم و حکمت کو کتب خانوں اور حجروں سے
نکال کر کلبوں اور قہوہ خانوں میں عام کر دیا۔ خیالات کے ساتھ ایڈیسن کا اسلوب بیان
اس کے نصب العین سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس نے معاشرتی خیالات کے اظہار
کے لئے عام فہم اسلوب اختیار کیا جس میں اگرچہ اعلیٰ ادبی چاشنی نہیں مگر اوسط اسلوب
Middle Style کا رنگ نمایاں ہے۔ ایڈیسن کو صحیح اور برمحل الفاظ کا ہمیشہ لحاظ
رہتا۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ دلپذیر انگریزی اسلوب کے لئے ایڈیسن کا مطالعہ
ناگزیر ہے۔

اسٹیل (۱۶۷۲ء - ۱۷۱۹ء)

اپنے رفیق کار ایڈیسن کی طرح اسٹیل محض اپنے زمانہ کا آدمی نہیں ہے۔ اس کی شخصیت
کی ترکیب میں دور بحالی Restoration کے عناصر اور محرکات بھی داخل ہیں اور
اقدار کے آثار بھی ملتے ہیں جو عام طور سے اٹھارھویں صدی سے منسوب نہیں کئے جا سکتے۔
اسٹیل نہ صرف ایک ذہین انسان تھا بلکہ اس کے مزاج میں انسانی ہمدردی بھی شامل
تھی جس کے لئے وہ مشہور تھا۔ اس کی اہم تصنیف "کرستانی ہیرو" Christian
Hero اٹھارھویں صدی کے خلاقی اور مذہبی خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ

ادب کی تاریخ میں اسٹیل اپنے رسالہ Tatler کی بدولت زیادہ مشہور رہا۔ اس میں اس نے اپنے معاشرہ کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا۔ وہ اپنے مضامین میں اپنے مخصوص کردار کی زبانی لوگوں کے بیجا غرور و نخوت اور مختلف النوع حماقتوں اور اخلاقی لغزشوں کا پردہ فاش کرتا رہا لیکن سوفٹ کی طرح اس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ اسٹیل اور ایڈیسن دونوں کا مقصد تھا کہ عوام کو دور رجالی کی عیاشی اور کٹر ملاؤں کی خشک مزاجی کے درمیان اخلاقی توازن کا سبق پڑھایا جائے جو سب کے لئے قابل قبول ہو۔ Tatler میں اسٹیل نے اسی مقصد سے سماجی خدمت کا ذمہ اپنے اوپر لیا۔ اس نے گھریلو خوشی اور اعتدال کی زندگی کو سراہا اور عیاشی اور فحاشی کی سخت ملامت کی۔

اسٹیل کے مضامین میں اگرچہ اخلاقیت زیادہ نمایاں ہے اور خیالات میں ترتیب و تسلسل کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کا اسلوب بیان بہت شگفتہ اور دلپذیر ہوتا ہے۔ جس سے پڑھنے والوں کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ انگریزی انشاپردازوں میں اسکا مقام مسلم ہے۔

نصابی کلاسیکیت اور ڈاکٹر جانسن :-

اٹھارھویں صدی کی درمیانی دہائیوں میں خیالات کی تاریخ یا اصناف ادب میں کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی مگر ۱۷۴۰ء کے قریب عقلی نظریۂ فن کا وہ مدرسہ جس نے اٹھارھویں صدی کے اوائل میں دنیائے ادب پر حکومت کی تھی رفتہ رفتہ معزول ہونے لگا۔ اسی طرح اگرچہ ادب اور فن کے میدان میں کسی انقلاب کی علامت دور تک نہیں نظر آتی لیکن زندگی کے مختلف شعبوں میں گوناگوں تبدیلیاں نمودار ہونے لگیں۔ ڈرائیڈن اور پوپ کا دور اب ختم ہو چکا تھا مگر شاعری کے افق پر نئے ستارے ابھرنے لگے تھے۔ اس نئی نسل کے سامنے کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا مگر اس کے نظریات اور خیالات کلاسیکی مدرسہ سے مختلف تھے۔ ان جدتوں کی بنا پر انگریزی ادب میں جن نفسیاتی اور حسیاتی عناصر کی طرف رجحان ہوا وہ بعد کو "رومانی تحریک" کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

سیمول جانسن ۱۷۰۹ء - ۱۷۸۴ء

جانسن کی شخصیت اس کی ادبی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے زندگی

میں مغاہمت سے زیادہ جنگ جوئی اور زبردستی سے کام لیا اور اس نے اپنی تحریر و تقریر سے دوسروں کو مجبور کر دیا کہ اس کے آگے سر تسلیم خم کریں۔ وہ اٹھارھویں صدی میں اوسط درجہ عوام کی ذہنیت اور اخلاقیت کا نمائندہ اور بورژوا کلاسیکیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جانسن کی پیدائش کتابوں کے درمیان ہوئی۔ اس کی دلچسپی جدید ادب کے مقابلہ میں قدما اور ان کے فن سے زیادہ رہی۔ اس لئے اس کی کلاسیکیت کو اعتقاد سے زیادہ احساس اور فکر کی عادت پر محمول کرنا چاہیئے۔ اس نے ابتدا سے ہی کلاسیکی اساتذہ کے آگے زانوئے ادب تہ کیا اور اسی لئے وہ اپنے دور کے دوسرے محرکات و میلانات سے آنکھیں پھیرے رہا۔ جانسن کے یہاں لازمی طور پر عقلیت و اعتدال کو احساس اور جذبہ پر فوقیت حاصل ہے مگر اعتدال کا یہ میلان فطری نہیں بلکہ اکتسابی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ بظاہر رومانیت کا مخالف ہے مگر اس کا داخلی ہیجان اور جذباتی انتشار اس کی غمازی کرتا ہے۔ جانسن کا آمرانہ مزاج کسی قسم کی بے راہ روی گوارہ نہیں کر سکتا۔ اس کے مطابق ہر شے نپی تلی اور واضح تناسب کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب میں نئی کوششوں کو ہمیشہ شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا اور آخر وقت تک دستوری کلاسیکیت کو سینے سے لگائے رکھا۔ جانسن کے زیر اثر کلاسیکیت ایک "قوت" ہونے کی بجائے میکانکی اصول و ضوابط کی زنجیروں میں جکڑ کر رہ گئی۔ مگر یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم رہنے والی نہیں تھی۔ جانسن کی زندگی میں ہی نئے عناصر ادب کو مختلف زاویوں سے متاثر کر رہے تھے اور اس کی موت کے بعد فوراً رومانی بغاوت کا آغاز ہوا۔

جانسن کی ابتدائی زندگی میں جو پراگندگی رہی اس کی وجہ سے اس کے اکتسابات میں کوئی ادبی تسلسل نہیں ہے۔ اسے اپنی شخصیت کو پہچاننے اور اپنا میدان متعین کرنے میں برسوں لگ گئے۔ چنانچہ ابتدائی دور میں تبصرہ نگاری کے علاوہ کوئی تخلیقی اُپج محسوس نہیں ہوتی۔ مگر جب اسے اپنی صلاحیتوں کا احساس ہوا تو اس نے اپنی زندگی اخلاقی اور ادبی مسائل کے لئے وقف کر دی۔ سب سے پہلے وہ پوپ کی طنزیہ شاعری سے متاثر ہوا اور اس کی نظم "لندن" اسی تقلید کا نتیجہ ہے۔ اس کی دوسری مشہور نظم "انسانی آرزوؤں کا حشر" The Vanity Of Human Wishes ہے جس میں شاعر نے دنیا اور

انسانی خواہشوں کی بے ثباتی اور بے حقیقی سامنے ذہن نشین کرائی ہے۔ کسی حد تک یہ نظم ہم کو نظیر اکبر آبادی کے "بنجارہ" کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں جانسن کی اخلاقیت اور قنوطیت بدرجہ اتم نمایاں ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جانسن کو اپنا مقام متعین کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اس لئے کہ اسے شاعری کے بعد فوراً ڈرامہ کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ اپنے "المیہ ڈرامہ" Irene کی ناکامی سے آزردہ ہو کر اس نے انشاپردازی میں طبع آزمائی شروع کی۔ اس کے Rambler اور Idler میں وہی انداز نمایاں ہے جو ان کے پیشرو Spectator کا تھا۔ یہاں جانسن کی شخصیت اور ذاتی میلانات کی باہمی مطابقت سے اس کی انشاپردازی میں زور و اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ آج بھی اگر ہم ان کا مطالعہ کریں تو ہمیں ایک مفکر کی فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کا قائل ہونا پڑتا ہے لیکن اس کے خیالات اس قدر عامیانہ ہیں کہ ان سے کوئی خاص فلسفہ نہیں اخذ ہو سکتا۔ جانسن بہت سی ایسی باتیں کہتا ہے جسے اکثر و بیشتر لوگ جانتے ہیں اور اکثر ایسے مسائل سلجھانے کی کوشش کرتا ہے جس پر خود اسے کوئی عبور نہیں حاصل ہے۔

Rasselas جانسن کا تمثیلی ناول ہے جس میں زندگی بسر کرنے کے طریقہ پر بحث ہے۔ اس کتاب میں اخلاقی مسائل قابل لحاظ ہیں۔ مگر جانسن کی ادبی شہرت کی بنیاد اس کی "لغت" اور اس کے تنقیدی کارناموں کی بنا پر ہے۔ جانسن کی لغت اٹھارھویں صدی تک عوام و خواص کے لئے قاموس Encyclopaedia کی حیثیت رکھتی تھی۔ مصنف نے یہاں انگریزی زبان کی صحت اور سلاست پر خاص توجہ رکھی ہے جس سے معنی و مطالب میں نمایاں فرق نہ پیدا ہو۔ وہ کبھی یہ بات گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ الفاظ کے معانی غیر متعین اور مبہم ہوں۔ جانسن نے فرانسیسی زبان کی بجائے دیسی زبان کے مروج الفاظ اور دور ایلزابتھ کے ادیبوں اور شاعروں کے لفظی خزانہ کو انگریزی زبان کے لئے مفید بتایا۔ اس کی اس رائے سے اختلاف ممکن نہ تھا۔ جانسن کی ڈکشنری اپنی نوعیت کی ایک منفرد کوشش اور تحقیق و تفحص کے ساتھ ذہنی دیانتداری کی بیّن علامت ہے۔

ڈاکٹر جانسن کا شمار بجا طور پر انگریزی کے بڑے نقادوں میں ہوتا ہے شیکسپیر اور معصر انگریزی شاعروں پر اس نے جو تنقید کی ہے وہ تواریخ ادب کا اہم باب ہے۔ وہ شیکسپیر کو کلاسیکی اصول کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے اسے شیکسپیر کے فن میں اخلاقی قدروں کی کمی اور تاریخی غلطیاں محسوس ہوتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ شیکسپیر کا بہت بڑا قدردان بھی ہے۔ اس نے اس دعویٰ کی تصدیق کی ہے کہ باوجود کلاسیکی اصول سے انحراف کے شیکسپیر کا فن فطرت Nature سے نزدیک ہے۔ جانسن کے نزدیک "شیکسپیر کا فن خشک نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ دلپذیر تصویروں کا مرقع ہے"۔ اس کے ڈراموں میں انسانی زندگی کا جوجیتا جاگتا نقشہ ہے وہ اصولوں کی پابندی سے ممکن نہیں۔ غالباً اسی لئے کلاسیکی مدرسہ کا علمبردار ہوتے ہوئے اس نے ڈینس، رائمر اور والٹیر جیسے مخالف نقادوں کے مقابلہ میں آکر شیکسپیر کی حمایت کی۔

"شاعروں کی سوانح The Lives of Poets مختصر تنقیدی شہ پاروں کا مجموعہ ہے جسمیں جانسن نے ابراہم کاؤلے سے لے کر اپنے زمانہ تک کے شاعروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ تمام پیشروؤں اور معاصرین کو ان کی بساط کے مطابق خراج عقیدت پیش کرتا ہے لیکن سیاسی اور سماجی صورت حال کبھی اس کی رائے میں دخل اندازی نہیں کرتی۔ اس کی تنقید میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بڑا دخل ہے۔ اس لحاظ سے جانسن کی تصنیف محمد حسین آزاد کی "آب حیات" کی یاد دلاتی ہے۔

جانسن شاعری کی افادی اور اخلاقی اہمیت کا جمالیاتی اور فنی اہمیت سے زیادہ قائل تھا لیکن اس نے کبھی بے اعتدالی کو روا نہیں رکھا۔ اس نے فن شاعری کے ہیئت اور اسلوب پر بہت سوچ سمجھ کر رائیں دی ہیں۔ اس کی تنقید پر جدید کلاسیکی نصابیت کا اثر ہے اس لئے اس نے سوفٹ کی تلخ طنز نگاری کی ملامت کی ہے۔ وہ قدامت پرست ہے اس لئے گرے اور کالنس کی شاعری اس کے لئے ناقابل قبول ہے۔ اس کا خیال ہے کہ رومان کی پرواز اور احساسات کی روانی سے شاعر کے یہاں ہیئت کا شعور باقی نہیں رہتا۔ وہ بہرحال روایات کا علمبردار ہے اور فن میں "مجموعی تاثر" Total Impression کا مبلغ۔ جانسن کی

شخصیت اس کی تنقیدوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ سڈنی اور ڈرائیڈن کے سوا اس زمانہ تک کوئی دوسرا نقاد اپنے اسلوب کی سنجیدگی اور شگفتگی کی بنا پر ہم کو جانسن کا حریف نہیں نظر آتا۔

جذباتی شاعری

اٹھارھویں صدی کے وسط میں انگریزی ادب میں ایسے عناصر داخل ہونے لگے جن سے نئی جذباتی شاعری کی ابتدا ہوئی مگر شعر و ادب میں یہ انقلاب " ہیئت " Form سے زیادہ "مواد" Matter میں ظاہر ہوا۔ گرے Gray اور کالنس Coilins جیسے شعراء زیادہ تر کلاسیکی ہیئتوں میں ہی طبع آزمائی کرتے رہے۔ لیکن ان کے یہاں احساسات اور جذبات کی بھی فراوانی ملتی ہے۔ یہ شعراء اپنے کلاسیکی رفقاء سے ایک دم مختلف نہیں ہیں بلکہ دونوں کے حدود اکثر ایک دوسرے کے اندر داخل معلوم ہوتے ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک مشترکہ روایت تھی جن سے چند مشاہیر نے انحراف کر کے اپنے لئے نیا راستہ متعین کیا۔ اگرچہ ان عبوری شاعروں سے خالص رومانی شاعری وجود میں نہ آسکی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سب سے پہلے انھوں نے ہی " رومانی تحریک " کے لئے زمین ہموار کی۔

پوپ اور جانسن کے زمانہ میں طامسن، گرے اور کالنس کی شاعری محض اتفاق نہیں۔ انگریزی شاعری میں کلاسیکی نصابیت اور عقلیت کے بعد دوبارہ قدماء کا احیاء ہونے لگا اور پیش بین شاعروں نے فن کو خواص کے دائرہ سے نکال کر عوامی حیثیت دی۔

جیمس طامسن James Thomson سنہ ۱۷۰۰ء سے سنہ ۱۷۴۸ء تک

جدید کلاسیکی شاعری میں نصابی اصول و ضوابط کے تحت فطری شاعری ایک طرح سے مفقود سی ہو گئی تھی مگر انگریزی ذہن اور مزاج سے اسے خارج کرنا آسان نہ تھا۔ اس پس منظر میں طامسن کی شاعری کو سر زمین انگلستان کی فطری پیداوار سمجھنا چاہیئے۔ اس کی شاعری اپنی تمام تر واقفیت کے باوجود رنگین احساسیت کا نمونہ ہے۔ وہ اگر ایک طرف پوپ اور جانسن سے مختلف ہے تو دوسری طرف ادب میں نئے عناصر کا بھی حامل ہے۔ اسی لئے مورخین کا خیال

ہے کہ طامسن کی شاعرانہ شخصیت میں اگر پوپ کے کچھ عناصر ملتے ہیں تو دوسری طرف رچارڈسن Richardson کے اثرات بھی کم نہیں۔

طامسن کی شاہکار نظم "موسم" The Seasons ۱۷۳۰ء میں منظر عام پر آئی جس کی شہرت دنیائے ادب میں بہت جلد پھیل گئی۔ اس نظم کے مطالعہ سے ہمیں یہ محسوس ہوئے بغیر نہیں رہتا کہ طامسن نے روایتی کلاسیکی شاعری سے خاص نمونے حاصل کئے اور انھیں پر طبع آزمائی کی۔ سورج کی سالانہ گردش اور موسم کی تبدیلیوں کے علاوہ شاعری کی دیوی Muse کا ذکر کلاسیکی طریق شاعری کی یادگار ہیں۔ اسی طرح اس کی شاعری میں دیہاتی زندگی کے مناظر ہیں۔ لاطینی شاعر ورجل کی مرغزاری نظموں Georgics کی یاد دلاتے ہیں۔ زبان و اسلوب میں بھی طامسن اپنے پیشروؤں سے مختلف نہیں۔ چنانچہ لاطینی ترکیبیں، عالمانہ بندشیں اور اخلاقی انداز بیان اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ باوجود تمام باغیانہ رجحانات کے کوئی شاعر اپنی روایات سے یکسر آزاد نہیں ہو سکتا۔

طامسن کی شاعری صوری حیثیت سے کلاسیکی ہے مگر معنوی اعتبار سے رومانی۔ اس کی شاعری میں مجرد سے زیادہ مجسم حقیقتوں کا احساس ہوتا ہے اور مشاہدہ اور احساس کی نزاکت سے اس کی منظر نگاری میں ایک نئی کیفیت ملتی ہے۔ طامسن کی حقیقت نگاری خالص ادبی اور فنی مطالبات کے مطابق تھی اس لئے اس میں وہ بے کیفی نہ پیدا ہو سکی جس سے جدید کلاسیکی شاعری کا دامن آلودہ ہے۔ "موسم" شاعر کی انفرادیت اور انسانی دوستی کی بہترین مثال ہے۔ عوامی زندگی سے دلچسپی اور غریب طبقہ سے ہمدردی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس کو "عوامی شاعر" کا خطاب دیا گیا۔

طامس گرے Thomas Gray ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۱ء تک

گرے جدید کلاسکی اور رومانی شاعروں کے درمیان عبوری حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک تربیت یافتہ ذہن کا مالک تھا مگر کیمبرج کی تعلیم اور یورپ کی سیاحت کا بھی اس کے شعور پر گہرا اثر پڑا۔ گرے کی شہرت اس کی معدودے چند نظموں کی بنا پر ہے لیکن اس کی کم گوئی کی وجہ سے اس کے نقاد اپنی اپنی رسائی فکر کے مطابق قیاس آرائیاں

کرتے رہے۔ میتھو آرنلڈ کا یہ قول کہ گرے ایک فطری شاعر تھا جو اپنے زمانہ کی نثریت کا شکار ہو گیا ایک حد تک صحیح ضرور ہے مگر قول آخر نہیں ہو سکتا۔ جدید نقادوں نے یہ معقول رائے ظاہر کی ہے کہ گرے کی جمالیاتی عینیت (۳) کے معاصرین کے مقابلہ میں اس درجہ ممتاز تھی کہ وہ خود اپنی تخلیقات سے آسودہ نہ تھا۔

اگرچہ گرے نے ۱۷۱۶ء میں ہی شاعری شروع کر دی تھی لیکن اس کی ابتدائی دور کی نظمیں کلاسیکی مدرسہ سے زیادہ نزدیک ہیں۔ ان میں اس دور کی شاعری کی تمام خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کلاسیکی استعا[illegible] ہے اور تلمیح [illegible] اور اخلاقیت کے ساتھ تشخص Personification کی بھی کمی نہیں۔ ان نظموں میں "ایٹن کالج" Eton College اپنی مرثیت اور اخلاقیت کے لئے مشہور رہے۔ مگر "موسم بہار سے خطاب" Ode On The Spring اپنی نوعیت کی منفرد تخلیق ہے۔ یہاں موسم بہار کی شادابی اور رنگینیوں کی رومانی تصویر ملتی ہے اور شاعر نے کوئل اور بلبل کی موسیقی سے ایک خاص آہنگ بھی پیدا کیا ہے مگر آخری بند میں بے ثباتی عالم کی طرف اشارہ خالص کلاسیکی انداز میں کیا گیا ہے۔

۱۷۴۲ء کے بعد گرے کی ان شاہکار نظموں کا سلسلہ شروع ہوا جن کی بدولت وہ آج بھی زندہ جاوید ہے۔ ان میں سب سے مشہور نظم "گور غریباں" Elegy Written In Churchyard ہے جو اپنے سوز و گداز اور انسان دوستی کے باعث دنیا کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا یہ قول کہ اس نظم میں ایسے بلیغ استعارے استعمال کئے گئے ہیں جن کے آئینہ میں انسانی ذہن اور جذبات کا عکس ملتا ہے، مبالغہ نہیں۔ نظم کی ابتدا شاعر نے شام کے وقت دیہاتی قبرستان کے پرسکون پس منظر میں کی ہے جب دن بھر کی محنت مشقت کے بعد ساری دنیا آرام کے لئے اپنے گھروں کی طرف جا رہی ہے۔ شاعر نے ان "خفتگان خاک" کی بدنصیبی اور گمنامی پر ماتم کیا ہے جن کو زمانے نے اس کے موقعے نہ دئے کہ وہ زندگی میں اپنے جوہر دکھا کر کوئی مقام حاصل کر سکیں۔ نظم میں ایسے بند بھی ہیں جن میں شاعر نے حیات و کائنات پر تفکرانہ نظر ڈالی ہے لیکن

تمام فکر انگیز اداسی کے باوجود یہاں قنوطیت کا گز نہیں۔
"گورغریباں" کے علاوہ "شاعری کا ارتقا" The Progress Of Poesy" اور "شاعر" The Bard مشہور نظمیں ہیں۔ موخرالذکر دونوں نظمیں عالمانہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں جس سے تعقید اور ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ آخری دور میں گرے نے مواد سے زیادہ ہیئت پر زور دیا۔

گرے چونکہ عبوری دور کا شاعر ہے اس لئے اس کے یہاں کلاسیکی دبستان کا رنگ بھی ہے اور رومانی تحریک کے مبہم نقوش بھی۔ پوپ اور کلاسیکی مدرسہ سے استفادہ کے باوجود اس کی شاعری دستوری کلاسیکیت سے بہت حد تک آزاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارھویں صدی میں برنس اور بلیک کے علاوہ گرے کا نام بھی نیم رومانی شاعروں میں لیا جاتا ہے۔ وہ اگر اصناف اور بیان و اسلوب کی حد تک کلاسیکی شعرا سے نزدیک ہے تو دوسری طرف اپنی قوت متخیلہ، فطرت نگاری اور انفرادیت کے باعث رومانی شعرا سے زیادہ قریب ہے۔ تاریخی حیثیت سے گرے کی شاعری اس امر کا بین ثبوت ہے کہ ملٹن اور ڈرائیڈن کے زبان و محاورہ سے طنز نگاری کے علاوہ اور بھی کام لئے جا سکتے ہیں۔ گرے کی فکر انگیز اداسی، اس کی غنائیت، فطرت نگاری اور انسان دوستی سے رومانی شاعروں کو اپنی تحریک کی راہیں متعین کرنے میں بڑی مدد ملی۔

کالنس Collins ۱۷۲۱ء سے ۱۷۵۹ء تک

پوپ کی جدید کلاسیکی اور ورڈسورتھ کی رومانی شاعری کے درمیانی زمانہ میں جو نئے شعرا میدان میں آئے ان میں کالنس بھی اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کے یہاں بھی عبوری دور کے دوسرے شاعروں کی طرح مضامین کی وسعت اور نئی شاعرانہ ہیئتوں کی تلاش ہے لیکن اس کی سب سے امتیازی خصوصیت بیان کی سادگی کے ساتھ جذبات واحساسات کا وہ نکھار ہے جو پیش رومانی Pre-Romanties شاعری کا خاصہ ہے۔

گرے کے ساتھ کالنس نے بھی جدید کلاسیکی مدرسہ کی عقلی نصابیت اور تربیت یافتہ

جذباتیت کے خلاف آواز بلند کی اور "روایت" سے زیادہ شاعر کی "انفرادیت" پر زور دیا دونوں شاعروں نے عام شاعری کے ساتھ مافوق الفطرت کرداروں، تمثیلی قصّوں اور اساطیر سے استفادہ کیا۔ ایک حد تک کالنس کی شاعری کا میدان محدود ہے لیکن اس سے اس کی تاریخی اہمیت میں سرمو فرق نہیں آتا۔ اس کے یہاں نہ گولڈاسمتھ کی شیریں نوائی ہے اور نہ ڈن Donne کی ذہانت۔ وہ شیلی کی جذباتیت اور ییٹس Yeats کی خواب ناکی سے بھی عاری ہے مگر اس کے یہاں جذبہ کی صداقت اور اس کے پُر خلوص اظہار سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔

کالنس کی کلاسیکیت اس کا ذہنی رجحان نہیں ہے۔ وہ اس طرف رومانی اساطیر اور جذباتی کشش کی بنا پر رجوع ہوتا ہے لیکن اس کے یہاں کہیں سے بھی مشکل پسندی کا احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کی مشرقیت Orientalism بھی مشرقی زندگی اور معاشرت کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں بلکہ بالواسطہ اکتساب ہے۔ وہ مشرق کو رومانوں کی سرزمین تصور کرتا ہے جہاں الف لیلائی داستانوں کی دنیا آباد ہے۔

فطرت نگاری کالنس کے تمام کلام میں نمایاں ہے لیکن اس کی نظم "شام سے خطاب" Ode To Evening میں یہ خصوصیت بھرپور موجود ہے۔ وہ ورڈسورتھ کی طرح فطرت کا پرستار نہیں بلکہ اس کے حسن اور دلربائی کا قائل ہے۔ کالنس جدید کلاسیکی شاعروں کی طرح فطرت کو مقید نہیں سمجھتا تھا اسی لئے خارجی فطرت کی عکاسی میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ مجموعی طور پر اس کے یہاں فطرت کے متعلق کوئی مربوط فلسفہ نہیں مگر مصورانہ ذوق اور انہماک ہر جگہ نمایاں ہے۔ اس کی فطرت نگاری میں یونانی اساطیر مشرقی رومانوں اور مافوق الفطرت کا بھی حصہ ہے۔ بقول ڈاکٹر جانسن "کے کالنس کو دنیائے تحیر کی پر پیچ وادیوں سے گزر کر سنہرے محلوں کے نظارہ اور باغِ ارم کے آبشاروں کے نیچے آرام کرنے میں لطف آتا ہے"۔

کالنس کی شاعری کا سب سے بڑا خاصہ اس کی غنائیت ہے۔ اٹھارھویں صدی کو عام طور پر نثر کا دور کہا گیا ہے لیکن گرے اور کالنس کے یہاں وہ غنائی اثر ملتی ہے جو بلیک Blake کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ کالنس نہ تو بلیک کی صوفیانہ ویژن

کا مالک تھا اور رنگ تے کے پایہ کا شاعر ہی تھا مگر اس کی نظموں کا انداز سب سے مختلف تھا ۱۸۱۹ء میں لکھی ہوئی اس کی بارہ خطابیہ نظمیں Odes غنائیہ شاعری کی بہترین مثال ہیں۔ ان میں سلاست، روانی، جذبہ اور موسیقیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ مشہور شاعر سوئنبرن Swinburne نے انھیں نظموں کی بنیاد پر کہا تھا کہ "غنائی شاعری کی حد تک گوئٹے کا کیٹس کے قدموں میں بھی بیٹھنے لائق نہیں "

کا لِنس کلاسکی شاعری کے آخری دور کی پیداوار ہے لیکن اس کے یہاں نئی شاعری کی تمام خصوصیات ——— فطرت نگاری، مشرقیت، رومانیت اور موسیقیت ——— پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ لفظوں اور محاوروں، فقروں اور ترکیبوں میں اکثر اپنے پیشروؤں کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کا تخیل یکسر رومانی ہے اور اس کی شاعری اپنی سادگی، رفعت خیالی اور زور واثر سے ممتاز ہے۔

ڈرامہ

جدید کلاسکی عہد کے ابتدا سے ہی ڈرامہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ جو ترقی دور ایلزابتھ میں اس فن نے پائی اور جو مقام دور بحالی میں اسے حاصل رہا وہ پوپ اور جانسن کے زمانہ میں ممکن نہیں تھا۔ اٹھارھویں صدی کا زمانہ دراصل ڈرامہ کے لئے بہت ناساز گار تھا جس کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ اوّل یہ کہ جب ادب کے پڑھنے والے زیادہ ہونے لگے تو تھیٹر جانے والوں کی تعداد بھی فطری طور پر کم ہونے لگی اس لئے کہ لوگ مطالعہ سے بہت حد تک اپنے ذوق کی تسکین کر لیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ کٹر قسم کے عیسائیوں کی تحریکیں بھی ڈرامہ کے لئے بہت مضر ثابت ہوئیں۔ انھوں نے اپنے فتووں سے "ڈرامہ" کو مخرب اخلاق فن قرار دے کر شہر بدر سا کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ اٹھارھویں صدی میں اعلیٰ درجہ اداکار اور فنکار موجود تھے اور سرپرستوں نے بھی ڈرامہ کی حمایت سے ہاتھ نہیں اٹھایا نہیں تھا لیکن تمام کوششوں کے باوجود اس فن کو کوئی تازہ زندگی نہیں مل سکی۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ بیسویں صدی میں بالآخر ابسن Ibsen کے زیر اثر برنارڈ شا اور گالز وردی کے ہاتھوں اس فن نے نئی

زندگی پائی۔

اٹھارھویں صدی کے کلاسیکی دور میں عوام کی ذہنیت اور پسند کے معیار بھی تیزی سے بدل رہے تھے جس کا ساتھ روایتی ڈرامہ نہیں دے سکتا تھا۔ ایسے دور میں شیکسپیئر یا مولیئر جیسے فنکار ہی ڈرامہ کو زوال سے بچا سکتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ کا کوئی ڈرامہ نگار اس دور میں نہیں پیدا ہو سکا۔ مروجہ اصناف کے علاوہ عوامی مذاق کے مطابق "غنائیہ ڈرامہ" Opera اور "داستانی غنائیہ ڈرامہ" Ballad Opera وغیرہ کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔ روایتی ڈرامہ کا زوال عوام کی بدلی ہوئی ذہنیت کا نتیجہ تھا۔ جذباتی ناولوں کی مقبولیت سے تھیٹر کی گرم بازاری کم ہو گئی لیکن جذباتی طربیہ ڈرامے Sentimental Comedy سب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان ڈراموں میں اخلاقی اور اصلاحی رجحانات کو جذباتی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ ان سے کسی خاص تحریک یا ڈرامہ کے احیاء کی امید لاحاصل تھی لیکن ان کی نئی خصوصیات نے انھیں عوام کو اپنی طرف مائل مزید کیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اٹھارھویں صدی میں شیکسپیئر اور اس کے ہمعصروں کے ڈراموں کو بڑی مقبولیت حاصل رہی۔ ۱۷۳۰ء سے ۱۷۶۰ء تک شیکسپیئر کے اکثر ڈرامے بدل کر پیش کئے گئے۔ اس دور میں جتنے نئے ڈرامے لکھے گئے ان سب پر ان پیشروؤں کا اثر نمایاں ہے۔

۱۷۳۰ء سے ۱۷۹۰ء تک انگریزی ڈرامہ میں نئی ہیئتوں کی تلاش جاری رہی لیکن کسی خاص صنف کا اجراء نہ ہو سکا۔ جذبہ اور احساس اٹھارھویں صدی ڈرامہ کے بنیادی محرکات رہے مگر روایتی اور جذباتی ڈراموں کے خلاف رد عمل کا میلان بھی رہا۔ اس ناموافق زمانہ میں اگرچہ گولڈ اسمتھ اور شیریڈن نے طربیہ ڈراموں سے اسٹیج کو نئی روشنی دی۔ اس کے بعد پھر مختلف تجربوں کی بے راہ روی سے ڈرامہ عرصۂ دراز کے لئے دوسرے اصناف کے مقابلہ میں گمنام رہا۔

(۱) خانگی ڈرامہ

۱۷۳۰ء اور ۱۷۶۰ء کے درمیان للّو Lillo اور مور Moore کے ہاتھوں ایک مخصوص قسم کا ڈرامہ وجود میں آیا جسے "خانگی ڈرامہ" کہا جاتا ہے۔ اس ڈرامہ کو ہم المیہ

انداز میں طربیہ کا تتمہ کہہ سکتے ہیں۔

للو (۱۶۹۳ء۔۱۷۳۹ء) نے سب سے پہلے تھیٹر میں درمیانی طبقہ کی نمائندگی کی۔ اس کی زندگی اور اس کا نظریہ اس خوشحال تجارت پیشہ طبقہ کی پیداوار تھا جو ملک میں سماجی اور معاشی اعتبار سے اپنی ساکھ جمارہا تھا۔ للو کے یہاں مذہبیت کا بھی غلبہ ہے جس سے اسے "ڈرامہ کا رچارڈسن" کہا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں اخلاقی اور مذہبی تاثر پیدا کرنے کی دھن میں فن سے بہت حد تک بے نیاز ہو گیا۔

خانگی ڈرامہ کے خالق کی حیثیت سے للو کی اہمیت تاریخی ہے۔ اگرچہ دور ایلزابتھ کے ڈراموں میں کہیں کہیں اس ڈرامہ کے عناصر موجود ہیں لیکن "ہیئت اور ترس" Terror & Pity کا احساس اس شدت سے اٹھارھویں صدی سے پہلے کسی دوسرے ڈرامہ نگار نے نہیں دلایا تھا۔ "جارج بارنیول" George Barnwell ایک نوآموز کی کہانی ہے جس میں ہیرو کسی فاحشہ کے اشارہ پر قتل کا مرتکب ہوتا ہے اور آخر میں اسے اس جرم کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ للو کے ان ڈراموں میں کہیں کہیں جدت اسلوب کا پتہ لگتا ہے مگر ان میں کوئی "زندگی" نہیں پائی جاتی۔ یہ ڈرامے قدیم اخلاقی تمثیلوں Morality Plays سے زیادہ نزدیک ہیں اس لئے کہ یہاں مصنف کا اخلاقی نظریہ بہت نمایاں رہتا ہے۔ ان ڈراموں کو اگرچہ کوئی خاص مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی لیکن ان کا اثر یورپ میں فرانس اور جرمنی تک پھیل گیا۔

ایڈورڈ مور (۱۷۱۲ء سے ۱۷۵۷ء) انگلستان میں للو کا سب سے بڑا جانشین تھا۔ اگرچہ بعض اعتبارات سے وہ اپنے استاد پر بھی سبقت لے گیا لیکن اس کے یہاں للو کا انداز بیان مفقود ہے۔ اس کا مشہور ڈرامہ The Gamester للو کے "جارج بارنویل" کا خاکہ معلوم ہوتا ہے۔ یہاں بھی مصنف کے اخلاقی اور مذہبی رجحانات کا احساس ہوتا ہے اور مرکزی خیال میں وہی گناہوں سے نفرت اور نیکیوں سے رغبت کی تلقین ہے۔ مگر فنی اعتبار سے اس ڈرامہ میں "جارج بارنویل" سے زیادہ انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ترتیب ماجرا میں رسمی اور غیر حقیقی طریقے اختیار کئے گئے ہیں لیکن

کا ڈرامہ کی ساخت میں ایک منطقی ارتقا موجود ہے جس سے وحدت کا تاثر باقی رہتا ہے۔ مور کے یہاں کہیں کہیں اعلیٰ شاعری کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جس کی بنا پر اس کے ڈرامہ للو کے مقابلہ میں زیادہ تاثیر آگئی ہے۔ مشہور فرانسیسی ادیب "دِدرو" Diderot اس ڈرامہ کا بڑا مداح تھا۔

(۲) "طربیہ کا احیاء"

اٹھارھویں صدی کے آخری حصہ میں انگریزی ادب کی تشکیل مختلف تحریکوں سے ہوئی مگر جذباتیت اور عقلی تشکیک کی وجہ سے صالح ادب کی ترقی میں رکاوٹیں حائل تھیں۔ اس زمانہ میں پڑھا لکھا طبقہ اگر ایک طرف اس قسم کی جمالیاتی بے آہنگی کا شکار تھا تو دوسری طرف خشک اور طنزیہ ادب سے بھی بیزار تھا۔ سطحی جذباتیت Sentimentalism کا اثر ڈرامہ پر سب سے بڑا اور وہ خشک واعظانہ مکالموں اور رسمی کہانیوں کا مرکب ہوکر رہ گیا۔ اب عوام کو گولڈ اسمتھ اور شیریڈن جیسے خلاق فنکاروں کا انتظار تھا جنھوں نے اپنی فطری جودت سے طربیہ کے ذریعہ اسٹیج کی رونق بڑھائی۔

فن ڈرامہ میں شیریڈن کے مقاصد گولڈ اسمتھ سے مختلف تھے۔ گولڈ اسمتھ اگر شکسپیر اور دور الیزابتھ کے ابتدائی ڈرامہ نگاروں سے متاثر رہے تو شیریڈن کے یہاں بن جانسن اور کانگریو کے اثرات نمایاں ہیں۔ گولڈ اسمتھ نے رومانی طربیہ کی روپہلی دھوپ سے اسٹیج کو چمکایا مگر شیریڈن نے مزاح اور تفریح کو ہی مقدم رکھا۔ دونوں فنکاروں نے دو مختلف زاویوں سے جذباتی طربیہ کی مخالفت کی اور اسے تصنع اور روایت پرستی سے بچاکر پھر زندہ کیا۔ گولڈ اسمتھ اور شیریڈن دور الیزابتھ کے عظیم روایت کے آخری نمائندے ہیں۔

گولڈ اسمتھ Goldsmith ۱۷۲۸ء سے ۱۷۷۴ء تک

انگریزی ادب میں گولڈ اسمتھ کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور یکساں طور پر کامیاب رہے۔ اس نے شاعری کے علاوہ افسانہ اور انشائیہ میں اپنا مقام پیدا کیا اور فن ڈرامہ میں بھی اپنے ہمعصر شیریڈن کی طرح سب سے ممتاز رہا۔ وہ مروجہ جذباتی طربیہ اور خانگی ڈرامہ کی خشک اخلاقیت سے بیزار تھا اس

لئے کہ ان ڈراموں میں مذہبی تلقین کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ گولڈ اسمتھ نے اپنے ہمعصر کے ساتھ تفریحی ڈرامہ کا احیا رکیا۔ اپنے ڈرامہ The GoodNaturedman میں اس نے جذباتی طربیہ کی پیروڈی کی ہے اور سخاوت و فیاضی کا مذاق اڑایا ہے مگر ہیرو سے ہماری ہمدردی ہمیشہ باقی رہتی ہے She Stoops To Conquer گولڈ اسمتھ کا شاہکار ہے اور اٹھارھویں صدی کے کامیاب ترین ڈراموں میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ مزاحیہ طربیہ ڈرامہ دور بحالی کے طربیہ نگاروں کی یاد دلاتی ہے۔ یہاں ہارڈکیسل Hardcastle اور لمپکن Tony Lumpkin کی کردنگاری اور واقعات کا رومانی تسلسل ہمیں گرویدہ کئے بغیر نہیں رہتا۔

شیریڈن Sheridan سنہ ۱۷۵۱ء سے سنہ ۱۸۱۶ء تک

شیریڈن کی پیدائش اور تربیت تھیٹر کی دنیا میں ہوئی۔ اس کا باپ اداکار تھا اور اسکی ماں ایک کامیاب ڈرامہ نگار۔ اس طرح ابتدا سے ہی اسے فن ڈرامہ سے دلچسپی ہو گئی جسے اس نے اپنے اظہار کا بھی آلہ بنایا۔ فطری طور پر وہ زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کا شیدائی ہے اس کے خیال میں تمام انسانی زندگی ہی ڈرامہ کے لئے مواد فراہم کر سکتی ہے۔ اسی لئے اس نے اپنے ڈراموں میں تماشائیوں کی تفریح اور مسرت کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں فیشن پرستی، تکلف اور بناوٹ کی جو عام لہر تھی اس میں شیریڈن بھی شریک رہا۔ سیرگاہوں کی رنگینی، نصف شب کی روپوشی اور فرار حسینوں کی خاطر نبرد آزمائی اور رومانی شادی اس کی زندگی کے ذاتی تجربے تھے جن سے اس کے ڈراموں میں توانائی اور دلچسپی پائی جاتی ہے۔ مروجہ طربیہ کے خلاف بغاوت میں شیریڈن نے "معاشرتی طربیہ" کا احیا رکیا اور اس نے اسٹیج کو تصنع اور اخلاقیت سے بچا کر تفریح کا مرکز بنایا مگر اپنی تمام انقلابیت کے باوجود وہ جذباتی طربیہ اور زمانے کے میلانات سے بے نیاز نہ رہ سکا۔ اس کے بیشتر کرداروں کے نام علامتی ہوتے ہیں اور رجال افسانہ کے حرکات و سکنات بھی روایتی ہی ہوتے ہیں۔ مصنف کبھی زندگی کے اہم اور سنجیدہ پہلوؤں پر غور نہیں کرتا۔ بلکہ سطحی طور پر ہمیں گدگدا کر مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔ حیات و کائنات کے رموز و نکات اسکے

بس کی بات نہیں لیکن ڈرامہ میں مزاح، مکالمہ اور چستی دیکھنا ہو تو شیریڈن کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

"رقیب" The Rivals شیریڈن کا پہلا کامیاب ڈرامہ ہے جس میں پلاٹ ناممکن قسم کے واقعات کی ترتیب پر مشتمل ہے۔ ایک نوجوان عاشق اپنے خبطی باپ کے اجازت کے بغیر اسی لڑکی سے محبت کرتا ہے جسے باپ نے اس کے لئے منتخب کیا ہے۔ دونوں دھوکے میں مبتلا ہیں۔ باپ اسے عاق کر دینے کی دھمکی دیتا ہے مگر عاشق صادق اپنی محبوبہ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ بالآخر واقعات سے پردہ اٹھتا ہے اور دونوں رشتوں میں منسلک ہو جاتے ہیں۔

اس ڈرامہ میں شیریڈن نے اپنی جوانی کی داستان دہرائی ہے وہی در پردہ معاملے ہیں۔ وہی رومانی محبت اور فرار کے نقشے۔ سب سے دلچسپ کردار "بی بے محل" Mrs Malaprop کا ہے جو اپنے بے محل انداز بیان سے سب کو محظوظ کرتی ہے۔

"بدگوئی کا مدرسہ" The School of Scandal

شیریڈن کا شاہکار اور اٹھارھویں صدی کا سب سے کامیاب طربیہ ڈرامہ ہے۔ یہاں مصنف نے ہم عصر سماج سے اپنے کردار منتخب کئے ہیں لیکن ان پر روایت کی مہر بھی لگی ہوئی ہے۔ ایک خبیث بڈھا شوہر اور اس کی نوجوان بیوی، دو بھائی جن میں ایک شریف اور دوسرا اوباش اور ان کا مالدار چچا جو عرصہ دراز سے پردیس میں ہے۔ ڈرامہ کے اہم ارکان ہیں۔ پلاٹ بوڑھے شوہر اور فضول خرچ بیوی کے درمیان جھگڑنے سے شروع ہوتا ہے۔ دو بھائیوں میں سے ایک اس نوجوان عورت پر نگاہیں رکھنے لگتا ہے۔ ان کے تعلقات اس حد تک بڑھتے ہیں کہ ایک بڑے نازک موقع پر اس کی عصمت بچالی جاتی ہے۔ بوڑھا چچا اس بدمعاش بھتیجے کو وراثت سے محروم کر دیتا ہے اور نوجوان عورت کفارہ ادا کرنے کے لئے اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی ہے۔

اس ڈرامہ میں شیریڈن نے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے ماحول کی عکاسی کی ہے۔ اس نے دور بحالی کے طربیہ کے ہوس کارانہ ماحول کے بجائے "بدگوئی کا مدرسہ" قائم کیا ہے۔ جہاں مختلف کردار ایک دوسرے کی ہجو اور برائی کرتے ہیں اور جن کی خفیہ کرامات سے نت نئے

ہنگامے اور میاں بیوی کے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مصنف نے اس ڈرامہ میں اٹھارھویں صدی کی معاشرت کی ایک کامیاب جھلک دکھائی ہے مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ یہاں جس رہن سہن کی عکاسی کی گئی ہے وہ واقعی ہے یا محض مصنف کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس بات سے البتہ انکار ممکن نہیں کہ شیریڈن نے عصری رجحانات و میلانات کو ایک عمومیت اور ہمہ گیری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ شیریڈن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی مسائل یا فلسفہ سے بحث نہیں کرتا بلکہ اپنے تماشائیوں کی دلچسپی کو مقدم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں تفریح کا جتنا سامان ہے وہ شیکسپیر کے سوا کم ڈرامہ نگاروں کے یہاں ملتا ہے۔

شیریڈن انگریزی طربیہ ڈرامہ نگاروں میں آخری کڑی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کے بعد اس عظیم ڈرامائی روایت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ شکسپیر اور دور ایلزابیتھ کے فنکاروں نے ڈرامہ کی صورت میں عام کیا تھا۔ اس کے بعد معاصرین نے سطحی پلاٹ، روایتی کرداروں اور مزاحیہ داخلاقی انداز میں جذباتی ڈرامے لکھے جن کا کوئی خاص ادبی مرتبہ نہیں۔ شیریڈن کا زمانہ انگلستان کی مادی ترقیوں اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اسی لئے اس کے ڈراموں میں ہمیں آزاد منش، دلچسپ اور بے ضرر قسم کے انسانوں کا ایسا میلا نظر آتا ہے جہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے تمام تردداتکو بھول جاتے ہیں۔ یہ اکتساب اپنی جگہ خود کچھ کم قابل قدر نہیں۔

ناول

ڈاکٹر جانسن کے عہد میں ناول نہ صرف شاعری بلکہ ادب کی ہر صنف پر اپنی توانائیوں کے اعتبار سے فائق اور مقدم رہا۔ شاعری ایک قدیم ہیئت کے شکنجہ میں گرفتار تھی لیکن ناول ان پابندیوں کا اسیر نہ تھا۔ وہ بالکل آزاد صنف تھا جو اپنے سامنے غیر معمولی وسعتیں رکھتا تھا۔ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ تکنک میں بھی نئے طریقوں کے لامحدود امکانات اسکو میسّر تھے جن سے بڑا کام لیا جا سکتا تھا اور لیا گیا۔

اٹھارھویں صدی میں ابہامیت، رمزیت اور مثالیت کے گورکھ دھندے کے بعد ناول صحیح معنوں میں سماجی زندگی کا آئینہ دار ہو گیا۔ اگرچہ اس صدی کے ابتدائی ناولوں میں احساسات

اور جذبات کا غلبہ رہا لیکن اس سے معاشرتی واقعہ نگاری میں بڑی مدد ملی۔ جذباتی ناول کے ساتھ حقیقت پسندی کا میلان بھی عام تھا۔ چنانچہ انگریزی ناول کا باوا آدم رچارڈسن Richardson اگر مذہبی جذباتیت سے متاثر ہے تو دوسری طرف فیلڈنگ Fielding حقیقت پسندی کا علمبردار ہے۔ صدی کی آخری دہائیوں میں "ہیبتی ناولوں" "Terror Novels" کا بھی بڑا چلن رہا جس سے رومانی شاعروں نے بہت استفادہ کیا۔

(۱) جذباتی ناول

اٹھارھویں صدی میں مذہبی جذباتیت کا سب سے زیادہ اثر ناول پر پڑا چنانچہ ناول کا یہ مخصوص انداز عرصہ تک رائج اور مقبول رہا۔ رچارڈسن کے بعد گولڈ اسمتھ اور اسٹرن نے اس صنف میں اپنی انفرادیت کا اظہار کیا۔

سیمول رچارڈسن ۱۶۸۹ء سے ۱۷۶۱ء تک

اگرچہ رچارڈسن کی تعلیم و تربیت لندن میں ہوئی لیکن اس کو اعلیٰ علوم کے مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا۔ اس نے نقاشی اور طباعت جیسے پیشوں میں استعداد حاصل کی اور ان میں وہ کامیاب بھی رہا۔ لیکن اسی دوران میں وہ ذہنی طور پر اپنے کو ایک ادبی فنکار کی حیثیت سے بھی تیار کر رہا تھا۔ وہ کنواریوں کو شادی کے مسائل کے متعلق مشورے دیتا، نوآموزوں کو اسامیوں کے لئے تیار کرتا اور جانشینوں کو ناراض بزرگوں کو منانے کے گر سکھاتا تھا۔ مکتوب نگاری کے ذریعہ اسے اظہار کا نیا وسیلہ ہاتھ آیا اور اس طرح اس نے "پامیلا" (۱۷۴۰ء) "کلیریسہ" (۱۷۴۸ء) اور "سر چارلس گرانڈسین" (۱۷۵۴ء) جیسی کتابیں تصنیف کیں۔

رچارڈسن کے ان تمام ناولوں میں مرکزی کہانی نہایت سادہ سی ہے۔ "پامیلا" Pamela ایک نیک خادمہ ہے جس نے اپنے کو اپنی مرحوم مالکہ کے بیٹے کی ہوس ناکیوں کا شکار نہ ہونے دیا بلکہ اپنی شرافت کی بدولت اس نوجوان کو مجبور کر دیا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ "کلیریسہ" نے بے میل شادی سے بھاگ کر "لولیس" Lovelace کے یہاں پناہ لی مگر جب وہ اسے بدکاریوں پر آمادہ کرنے لگا تو اس نے موت کو ایسی زندگی پر

ترجیح دی۔ "سرچارلس" گرانڈ مین نے اپنی مرضی کے خلاف اپنی محبوبہ کی بجائے کسی دوسری عورت سے شادی کی۔ اس کا طریقۂ عمل قابل تحسین تھا۔

ابتدا سے ہی رچارڈسن کے ناول مخصوص مذہبی معیار زندگی کے باعث ہدف ملامت رہے۔ "پامیلا" اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھی جا سکتی تھی جب تک اسے نیک چلنی کے صلہ میں شادی کا پیغام نہ مل جائے۔ "کلیریسہ" Calerissa موت کے بعد دوسری دنیا میں اپنی نیکیوں کا انعام پاتی ہے۔ اس طرح قصہ کی بنیاد پر ناول کی تاریخ میں رچارڈسن کی کوئی خاص اہمیت نہیں لیکن اس کا فن تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مکتوب نگاری کے ذریعہ ناول میں ایک نئی تکنک کا اضافہ کیا جو آج تک اہم خیال کیا جاتا ہے اور بہت سے نقاد کو اس تکنک کو جدید نفسیاتی ناول کی ابتدائی شکل بتاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رچارڈسن داخلی زندگی کا اس پیمانہ پر سب سے پہلا ترجمان ہے۔ رچارڈسن کو انسانی فطرت کا بڑا ادراک حاصل ہے۔ اس نے جذبات اور احساسات کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ متقدمین کے یہاں داخلی زندگی کی عکاسی ضرور ملتی ہے لیکن اس سے پہلے کسی نے اس تکنک کو اس کمال تک نہیں پہنچایا تھا۔ رچارڈسن کے یہاں احساس اور سوز و گداز کا پہلو ہمیشہ نمایاں رہتا ہے اور اس کے افسانوں میں مذہبی ذہنیت کا شدید احساس ہوتا ہے مگر مصنف اپنا فنی مقصد کبھی نہیں بھولتا۔ اس کے ناولوں میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جہاں فنکار اور ماہر نفسیات کی حیثیت سے وہ اخلاقی غایت کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس کے یہاں ایسے کرداروں کی بھی کمی نہیں جن کے ارتقا میں ایک منطقی رجحان ہے اور جن کی جامعیت اور ہمہ گیری سے انکار ممکن نہیں۔ "کلیریسہ" میں "لویس" کے کردار میں شیطانی عناصر کی کارفرمائی ہے اور جب رچارڈسن "پامیلا" کا کردار پیش کرتا ہے تو اکثر اس کی اداؤں اور غمزوں کی بھی تصویریں کھینچنے میں اپنی مہارت دکھائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ اس کے فطری فنکار ہونے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔

رچارڈسن کی ادبی اہمیت انگلستان کے علاوہ یورپ میں بھی مسلّم ہے۔ فرانس جرمنی اور ان تمام ممالک میں جہاں جذباتیت Sentimentaism کا دور دورہ

رہا، وہ بے حد مقبول و معروف رہا۔ فرانسیسی ادیب "دِدرو" Diderot "کلیرسہ" کے خالق کا قصیدہ خواں رہا۔ روشو Rousseau نے اپنی افسانوی تخلیقات میں رچارڈسن سے استفادہ کیا اور مشہور جرمن فنکار گوئٹے Goethe کے شاہکار The Sorrows of Werther میں بھی "کلیرسہ" کے آثار محسوس طور پر ملتے ہیں۔ ہارڈی کی ہیروئن ٹیس Tess اور جارج مور کی "ایستھر واٹرس" Esther Waters کلیرسہ ہارلوہی کے نسل سے معلوم ہوتی ہیں۔

گولڈ اسمتھ

جذباتی ناول کی کامیابی اگرچہ دیرپا رہی لیکن رچارڈسن کے بعد گولڈ اسمتھ کے علاوہ کوئی اس کے فن پر اضافہ نہیں کر سکا۔ گولڈ اسمتھ کے ناول "ویک فیلڈ کا پادری" The Vicar of Wakefield میں رچارڈسن کے سوز و گداز کے لئے کافی گنجائش تھی لیکن اس نے اپنا مخصوص طریقۂ اظہار اختیار کیا۔ اس نے نرم جذبات کو زیادہ واضح اور براہ راست بنانے کی کوشش کی اس لئے اس کا اثر بھی زیادہ قوی اور ہمہ گیر رہا۔ مصنف کی شگفتگی، مزاح اور اخلاقی جذباتیت سے ناول میں اسٹیل کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔

ناول میں "ویک فیلڈ" کے پادری پرمروز Primrose اور اس کے خانگی زندگی کا بڑا دلچسپ خاکہ ہے۔ پادری کے چھ بچے (دو بیٹیاں اور چار بیٹے) بڑے آرام کی زندگی گزار رہے تھے کہ یکایک ان پر معاشی مصائب کا پہاڑ ٹوٹتا ہے۔ وہ اپنی سکونت بدلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن جس نئے مقام پر یہ لوگ پہنچے ہیں وہاں ایک دوسرا اوباش پادری پرمروز کی لڑکی کو ورغلا کر اس کی عصمت دری کرتا ہے اور پھر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ نیک پادری اپنی گمراہ بیٹی کو گھر لا کر اس کی تسلی و تشفی کرتا ہے مگر گھر جل جانے سے ان پر نئی مصیبت نازل ہوتی ہے اور قرض کے سلسلہ میں وہ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ حالات پھر پلٹا کھاتے ہیں اور برے دن اچھے دنوں سے بدل جاتے ہیں۔

اس ناول کے ترتیب ماجرا میں اگرچہ فنی چستی نہیں لیکن گولڈ اسمتھ نے واقعات

میں ایک مرکزیت پیدا کر کے کہانی کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ ناول کا ابتدائی حصہ طربیہ مناظر اور موقع کا ایک مرقع ہے لیکن آخری حصہ میں ڈرامائی انداز زیادہ نمایاں ہے۔ ماحول کا خاکہ مصنف نے اپنے بچپن کی یادوں سے تیار کیا ہے۔ چنانچہ یہاں اس کے ذاتی پسند ناپسند اور سیاسی و معاشرتی رایوں کو کافی دخل ہے۔ افسانہ میں شروع سے آخر تک گولڈ اسمتھ کی ہمدردی اور انسان دوستی نمایاں ہے۔ وہ عدالتوں کی بے انصافیوں اور شخصی مبارزوں Duels کا سخت مخالف ہے لیکن اس کے ساتھ ہی سماجی اصلاح اور قید خانوں کے سدھار کے لئے بھی آواز بلند کرتا ہے۔ گولڈ اسمتھ کے یہاں ڈکنس کی عوام پسندی اور گداز اور تھیکرے کے مزاج کی چاشنی پہلے سے مل جاتی ہے۔

"ویک فیلڈ کا پادری" گھریلو زندگی کا ناول ہے۔ تصنع کے خلاف سادگی کی تلقین اور معاشرتی خرابیوں کے خلاف بغاوت، مصنف کی ذہنیت کا آئینہ دار ہے جس میں روسو کا رنگ جھلکتا ہے۔ گولڈ اسمتھ کے یہاں رومانیت کے ابتدائی نقوش نہایت واضح اور محسوس طور پر ملتے ہیں۔ اس کے یہاں داخلی اور انفرادی عناصر اس طرح نکھرے ہوئے ملتے ہیں کہ ہمیں رومانی دور کے بڑے ادیب یاد آ جاتے ہیں۔ وہ عام دیہاتیوں کی زندگی اور معاشرت کے اس قدر دلچسپ مرقعے کھینچتا ہے جو شاعری میں ورڈسورتھ کے یہاں ہی ممکن ہے۔ اگر چہ بنیادی طور پر گولڈ اسمتھ کلاسیکی اعتدال اور ہئیت ہی کا قائل معلوم ہوتا ہے مگر زبان و اسلوب اور تشبیہوں اور استعاروں میں اس کے یہاں نئے ادب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اسٹرن ۱۷۱۳ء سے ۱۷۶۸ء تک

اسٹرن کی تصنیفیں اس کی شخصیت کا آئینہ ہیں۔ اس کے فن میں جذباتی ناول اپنی آخری حدود کو پہنچ جاتا ہے۔ رچارڈسن جن ذہنی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی انفرادیت کا مکمل کر اظہار نہیں کر سکا تھا وہ اسٹرن کے دور تک آتے آتے ختم ہو چکی تھیں۔ اسٹرن احساسات کو پوری آزادی دے کر داخلی زندگی کی بے روک ٹوک عکاسی کرتا ہے۔ اس کے ہاتھوں فن ناول کو بڑی وسعت ملی اور اس صنف میں تمام ذہنی، سماجی اور مذہبی خیالات کے لئے

گنجائش نکل آئی ۔

Tristram Shandy (۱۷۶۰ء-۱۷۶۷ء) میں ہمیں ایک عظیم ذہن کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے ۔ اگرچہ محض افسانہ کی بنا پر ناول کامیاب نہیں کہا جا سکتا کیونکہ تیسرے باب تک ہیرو کی زندگی مبہم رہتی ہے اور قصہ میں واقعات، مکالمے اور غیر متعلق بحثیں زندہ ہو گئی ہیں لیکن اس ناول میں مصنف کی طبعی محزونیت، مطالعہ کی گہرائی اور علمی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔ اسٹرن نے اپنے دور کی دنیا کو ہر طرح کے گرد و غبار سے آلودہ دیکھا ہے ۔ وہ اگر ایک طرف انسانی زندگی کے مزاحیہ اور طربیہ پہلوؤں پر ہنستا ہے تو دوسری طرف مظلوم انسانیت پر آنسو بھی بہاتا ہے ۔

"جذباتی سفر" Sentimental Journey ۱۷۶۸ء میں منظر عام پر آئی اسٹرن کی یہ تصنیف اس کی تربیت یافتہ فنی صلاحیت کی علامت ہے اور اس سے پہلے جو کچھ لکھا جا چکا تھا اس پر اضافہ ہے ۔ یہ ناول اگرچہ کہنے کے لئے فرانس کے ایک سفر کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن اگر غور سے پڑھا جائے تو یہاں ہم کو فرانس اور فرانس کے لوگوں کے بارے میں اتنی معلومات نہیں حاصل ہوتیں جتنی کہ مصنف کے ذہنی رجحان اور اس کے زمانہ کے بدلتے ہوئے میلانات و مطالبات کا احساس ہوتا ہے ۔ یہاں نہ تو رابیلے Rabelais کی قہقہہ بازی ہے اور نہ سروانتیز Cervantes کی طنازی ۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیک وقت انسان کی حیوانی فطرت اور اس کے اس قابلیت کی ایک ہم آہنگ تصویر پیش کی جا رہی ہے ۔ اگر ہم اس ناول کا غور سے مطالعہ کریں تو ظاہری مزاح و ظرافت کے پیچھے ہم کو وہ تلخی اور المناکی محسوس ہوتی ہے جو مسیحی قنوطیت کا تقاضہ تھا ۔ یہ ناول محض جسمانی یا مکانی سفر نہیں ہے بلکہ ذہن اور زمانہ کی بھی سیاحی ہے ۔

اسٹرن نے جذباتی ناول کو درمیانی طبقہ کی اخلاقیت سے نکال کر اسے انسانی زندگی کا آئینہ دار بنایا ۔ اور عام زندگی کے اقدار کی اہمیت جتا کر رومانی تحریک کے لئے زمین ہموار کی ۔

(۲) حقیقت پسند ناول

اٹھارھویں صدی میں ناول کی تاریخ میں جذباتی میلان کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری

کی تحریک بھی کچھ کم اہم نہیں۔ یہ امر البتہ قابل غور ہے کہ ان دونوں میلانات کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں بلکہ دونوں کے درمیان اکثر ہم آہنگی ملتی ہے۔

ناول میں حقیقت نگاری ڈیفو کے زمانہ سے ہی موجود تھی۔ درمیانی طبقہ کے مزاج اور کلاسیکی میلان سے اس کو اور تقویت ملی مگر اس صنف کا سب سے بڑا نمائندہ ہنری فیلڈنگ ہے جو اپنے پہلے ناول کی بنا پر رچارڈسن کے اخلاقی ناولوں کا حریف سمجھا گیا۔ اٹھارہویں صدی کی حقیقت نگاری دراصل جذباتیت Sentimentaism کا ردّ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ مذہبی خیالات کی حد بندیوں سے آزادی اور وسعتِ خیال کی طرف پہلا قدم تھا یہی وجہ ہے کہ فیلڈنگ نے اپنے ہمعصر کی تضحیک تو کی لیکن اس کی عظمت کا بھی قائل رہا۔ اسکے فن کو رچارڈسن کا آخری منطقی نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ وہ دونوں نہ صرف ایک ہی روح عصر کے پیداوار تھے بلکہ ان کے مقاصد بھی ایک حد تک یکساں تھے۔ اگر چہ ان کا طریقۂ اظہار ایک دوسرے کے برعکس تھا لیکن اُن میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں۔

ہنری فیلڈنگ ۱۷۰۷ء سے ۱۷۵۴ء تک

فیلڈنگ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی تعلیم بھی "ایٹن" جیسے ادارہ میں ہوئی تھی۔ وسعت مطالعہ کی بنا پر اس کو کلاسیکی ادبیات بالخصوص فن ڈرامہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ اس کو صحافت، وکالت اور عدالتی کارروائیوں سے بھی سابقہ رہا جس سے اسے فطرت انسانی کے مطالعہ میں بڑی مدد ملی۔

فیلڈنگ کا زاویۂ نگاہ رچارڈسن سے بہت حد تک مختلف تھا۔ وہ جذباتیت کی بجائے حقیقت پسندی کا قائل تھا۔ وہ اپنے ناولوں میں "اخلاقی معلم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ فطرت انسانی کے مبلّغ اور نظام معاشرت کے مصلح کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔ اس کا پہلا ناول "جازف اینڈروز" Joseph Andrews ۱۷۴۲ء میں رچارڈسن کے "پامیلا" کی نقالی میں لکھا گیا۔ یہاں مصنف نے حالات و واقعات کو الٹ کر زندگی کا جو طنزیہ رُخ پیش کیا ہے وہ بیک وقت اس کے مزاج اور گرد و پیش کی واقعی دنیا سے بہت قریب ہے۔ اس ناول میں ایک نیک طینت ملازم "جازف" کو "لیڈی بوبی" Lady Booby اس طرح

لبھانے کی فکر میں ہے کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ جازف اور پادری آدم کی مزاحیہ سرگذشت بہت ہی دلچسپ ہے مصنف نے بجا طور پر اس ناول کو "نثر میں مزاحیہ رزمیہ" کہا ہے۔

"جوناتھن وائلڈ" Jonathan Wild بھی فیلڈنگ کے طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ یہاں اس نے ایک سراپا فتنہ چور کو مرکزی کردار بنایا ہے اور ایک سپاہی اور مدبر کے مقابلہ میں لاکر دونوں کا فرق اس طرح ذہن نشین کرایا ہے کہ اشارۃً چور کا کردار زیادہ دلپذیر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات رکھنے کے قابل ہے کہ اس طنز کا مرکز سر رابرٹ والپول Sir Robert Walpole ہے جس نے اپنی لائسنس ایکٹ (۱۷۳۷ء) سے فیلڈنگ کو تھیٹر کی دنیا سے نکال دیا تھا۔

"ٹام جونس" Tom Jones فیلڈنگ کا شاہکار ناول ہے جو ۱۷۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ یہاں مصنف کا اپنا نظریہ حیات اور اس کی فنکاری بغیر کسی موازنہ یا مقابلے کے خود اپنی جگہ ایک کامیاب اکتساب ہے۔ اس ناول میں فیلڈنگ نے مختلف کرداروں کے ذریعہ زندگی اور اخلاق کے مختلف نظریے پیش کئے ہیں۔ اور اس کا ردعمل بھی دکھایا ہے۔ کچھ لوگ پیدائشی طور پر اچھے ہوتے ہیں اور کچھ پیدائشی برے۔ اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اچھے بھی ہیں اور برے بھی اور نہ اچھے ہیں نہ برے۔ مگر رواداری اور درگزر، اخلاق اور شرافت ہمیشہ ایک کامیاب معاشرہ کی اصلی ضمانت ہیں۔ ٹام جونس میں اسی نام کے ہیرو کی سرگذشت رزمیہ پیمانہ پر بیان کی گئی ہے لیکن یہاں حیات و کائنات سے متعلق غیر ضروری مباحثے قصے کی دلکشی میں اکثر خلل انداز ہوتے رہتے ہیں اور مصنف کی موجودگی کا احساس بھی کھٹکتا رہتا ہے۔ ان فنی خرابیوں کے باوجود "ٹام جونس" انگریزی زبان کے عہد آفریں ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دیہاں یہاتی اور شہری معاشرت، راجدھانی کی تفریحیں، دیہاتوں کے سرائے، تھیٹر اور جرم و گناہ کے تمام اڈے اپنا اپنا مقام پاتے ہیں۔

فیلڈنگ حیات انسانی کا داستان گو ہے جس کی داستانوں میں ہم کو فطرت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے یہاں طنز و مزاح کے پیرایہ میں اصلاح کی تلقین بھی ہے اور ہمارے لئے

تفریح کا سامان بھی۔ اس کے یہاں جو وسعت نظر، رواداری اور اثباتیت Positvism ملتی ہے وہ دنیا کے بڑے ادیبوں کا خاصہ ہے۔ اس نے ناول میں جذبہ اور احساس کے ساتھ غلو کا برتاؤ نہیں کیا بلکہ اسے معقول اور مناسب جگہ دیا۔ اس کے سماجی مرقعوں میں اسمالیٹ Smollet کی خشونت اور کلبیت کو کوئی دخل نہیں۔ فیلڈنگ کی قبل از وقت موت انگریزی ناول کے لئے ایک افسوسناک سانحہ تھی لیکن اس کے ناول اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ آخری عمر میں اس نے رچارڈسن کے نمونہ پر "ایملیا" P melia لکھی جس میں انسانی ہمدردی اور سماجی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے۔ روسو Rousseau نے اپنی کتاب میں فیلڈنگ سے براہ راست استفادہ کیا۔

اسمالیٹ ۱۷۲۱ء سے ۱۷۷۱ء تک

فیلڈنگ کے ہمعصروں میں رچارڈسن کے علاوہ اسمالیٹ کا بھی نام لیا جاتا ہے اگرچہ اسے وہ عظمت نہیں حاصل ہو سکی جو مقدم الذکر مشاہیر کا حصہ تھا۔ اسمالیٹ نے فن ناول نگاری میں کوئی خاص جدت نہیں کی لیکن اس کے ناولوں کے پس منظر اور مصنف کی ذہنی زندگی ہمیں ضرور متاثر کرتے ہیں۔ اس کے یہاں ہمدردی، رواداری اور انسان دوستی کا وہ عنصر مفقود ہے جو رچارڈسن اور فیلڈنگ کا طرۂ امتیاز ہے۔ زندگی کی محرومیوں اور ناکامیوں سے اسکے یہاں سوز و گداز سے زیادہ کلبیت Cynicism کا میلان پیدا ہو گیا اسی لئے اسکے ناولوں میں غم و الم کا دائمی تصور انسان بیزاری کی حد تک بڑھ گیا ہے۔

اسمالیٹ کو "عوام" کے ساتھ "سرپرستوں" سے بھی شکایت ہے۔ وہ نہ صرف اپنے حریفوں سے عاجز معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سماج سے بھی نالاں ہے جو ایسے لوگوں کی پرورش کرتا ہے۔ اس برافروختگی کی وجہ سے اس کے مزاج میں طنز نگاروں کے جارحانہ انداز کو دخل ہونے لگا۔ اس کے ناول بھی طنز نگاری ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن اس کی نثر میں ایک شاعرانہ کیفیت ملتی ہے جو کہیں کہیں غنائیت کی حد تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ اسمالیٹ کی تصنیفیں اس کی شخصیت کی پوری طرح غمازی کرتی ہیں۔ "راڈرک رینڈم" ...derick Random میں اگر اس کی زندگی کے ابتدائی حالات اور اس کے عنفوان شباب کی

محرومیوں کا ذکر ہے تو "میتھو برامبل" Matthew Bramble کے کردار میں بڑھاپے
کی گداختگی موجود ہے۔ ان ناولوں میں Gilbilas اور Don Quixote
کا اثر نمایاں ہے لیکن اسمالیٹ کی نظر بہت سطحی ہے جس سے اس کی حقیقت نگاری محض خارجی
اور بیانیہ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے یہاں فیلڈنگ کا فنکارانہ شعور کبھی نہیں پیدا ہو سکا۔
وہ تماشہ آرائیوں کا قائل ہے مگر اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں زندگی اور توانائی کم نظر آتی ہے۔
"ہمفری کلنکر" Humphry Clinker اسمالیٹ کا آخری کارنامہ ہے
جس میں اس نے مختلف اثرات سے کام لیا ہے۔ یہاں فیلڈنگ سے کردار نگاری، اسٹرن
سے مزاح اور رچارڈسن سے مکتوباتی اسلوب لے کر ناول نگاری کی کامیاب کوشش کی
گئی ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا سنجیدہ اندازِ بیان ہے۔ کیونکہ
یہاں سن رسیدہ مصنف کی زمانہ کے ساتھ مفاہمت اور صلح و آشتی کی خواہش نمایاں ہے۔
وہ رواداری اور انسانیت کا پاسبان نظر آتا ہے اور زندگی کا آخری سفر صبر و سکون کے
ساتھ طے کرنا چاہتا ہے۔

جین آسٹن ۱۷۷۵ء سے ۱۸۱۷ء تک

اگرچہ تاریخی اعتبار سے جین آسٹن کا شمار انیسویں صدی میں کیا جا سکتا ہے لیکن
مزاج اور میلان کے اعتبار سے وہ اٹھارھویں صدی کی پیداوار ہے۔ اس کے فن پر اس کی
شخصیت اور انفرادیت کی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ اس کا کسی خاص مدرسۂ فکر سے کوئی تعلق
نہیں بلکہ اس کی تمام تر دلچسپیاں ایک خاص دائرہ کی زندگی اور معاشرت کے مطالعہ پر مرکوز
ہیں۔ وہ اوسط طبقہ کے لوگوں کی ترجمان ہے اس لئے اس کے یہاں امیروں اور غریبوں
کی خلیج حائل نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے فن کا محور دیہات کے وہ فارغ البال خاندان ہیں
جہاں زندگی خارجی تردداّت سے ماورا پر سکون طریقہ پر گزر رہی ہے۔ جین آسٹن کی حقیقت نگاری
رچارڈسن سے زیادہ نفسیاتی واقفیت پر مبنی ہے کیونکہ اس کے یہاں اخلاق اور ضمیر کے بیجا تصرفات کم
ہیں۔ اس کے مرقعوں میں انسانوں کی زندگی، ان کے باہمی تعلقات، ان کی قرابت اور دلچسپ تنازعات
کی تصویریں نہایت دلکش ہوتی ہیں۔

کرداروں کے مطالعہ اور مشاہدہ میں جو ملکہ جین آسٹن کو حاصل ہے وہ بہت کم فنکاروں کا
حصہ ہے۔ وہ اپنے رجال افسانہ دیہاتی رئیسوں، پادریوں، تاجروں اور دوسرے اوسط طبقہ
کے لوگوں سے منتخب کرتی ہے اور انہیں اس حسن و خوبی سے پیش کرتی ہے کہ فرضی کرداروں میں بھی حقیقت
کا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ جین آسٹن کے ناولوں میں جذباتیت کے بجائے توازن اور اعتدال اور ہیئت
کا کلاسیکی تصور ملتا ہے۔ اس کے یہاں رچارڈسن اور اسٹرن کی داخلیت اور رومانیت کا پتہ نہیں ملتا۔
اگرچہ ابتدائی ناولوں میں اس کا رویہ قطعی طور پر رومانیت کے خلاف تھا لیکن آخری کارناموں میں خارجی
مصوری کے علاوہ جذبات کی گرمی اور احساسات کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ اس کے باوجود جین آسٹن
کے بنیادی تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے یہاں ماورائیت سے زیادہ ارضیت اور رومانیت
سے زیادہ مادیت کا احساس ملتا ہے۔

جین آسٹن کے ناولوں میں "حس اور احساس" Sence & Sensibility
"غرور اور تعصب" Pride & Prejudice کے علاوہ "ایمہ" Emma بہت مشہور
ہیں۔ اگرچہ اس کا طرز و اسلوب روایتی ناولوں سے مختلف ہے لیکن جو رواداری، وسیع المشربی اور
اثباتی نقطہ نظر اس کے یہاں ملتا ہے وہ انسان دوست ادیبوں کا خاصہ ہے۔ جین آسٹن کے یہاں
مزاح کا ہلکا سا چٹخارہ ہمیں اردو میں نذیر احمد کی یاد دلاتا ہے لیکن جین آسٹن نذیر احمد سے بہتر فنکار
ہے۔ اس کے کردار علامتی نہیں اور نہ اس کے مسائل محض عارضی یا مذہبی نوعیت کے ہیں۔ وہ انسانی
طربیہ کے بڑے فنکاروں میں شامل کی جا سکتی ہے جس کے یہاں بصیرت سے زیادہ مسرت کا سامان
ملتا ہے۔

(۳) "ہیبتی ناول"

اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں اگرچہ انگریزی ادب پر رومانی اور نفسیاتی عناصر کا
اثر محسوس ہونے لگا تھا لیکن سماجی اور ادبی زندگی میں ایسی فضا نہیں پیدا ہو سکی تھی جو فکر و عمل میں
انقلاب کے لئے سازگار ہو سکتی۔ شاعری میں کلاسیکی اسالیب اب بھی مقبول تھے لیکن نثر میں وسیع
امکانات تھے۔ فن ناول میں اس جدت کو سب سے زیادہ راہ ملی۔ مسز ریڈ کلف Mrs.
Radeliff کے ناولوں میں آزاد تخیل کی وہ جولانیاں ملتی ہیں جو آگے چل کر رومانیت کے لئے سازگار

ثابت ہوئیں۔ اس کے ناولوں میں اس شعور کا پتہ ملتا ہے جس سے ورڈسورتھ اور کولرج کی شاعری کا خمیر ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ریڈکلف نے اپنے قصّوں میں خوفناک عناصر اور ہولناک حادثات سے نفسیاتی پس منظر تیار کیا جس سے ایک طرف مانوس چیزوں میں ایک نئی کیفیت محسوس ہونے لگی اور دوسری طرف کولرج کی مافوق الفطرت شاعری کے لئے زمین ہموار ہو سکی۔ استعجاب کا احساس اور ہیبت کا تصور یقینی طور پر انگریزی ادب میں نئے عناصر کا پیش خیمہ تھے۔

مسز ریڈکلف سے پہلے بھی۔ رومان نگاروں میں اس نئے رجحان کی علامتیں ملتی ہیں۔ لیکن بعد کے لکھنے والوں نے اس پر حاشیہ چڑھایا اور ان سے نئے کام لئے۔ درحقیقت "ہیبتی ناول" جذباتی ناولوں کے طرز پر ہی لکھے گئے لیکن ان میں یہ التزام رکھا گیا کہ احساسات میں سستی پیدا کرنے والے رومانی ہیجانات کے لئے مواقع فراہم ہو سکیں۔ اس طرح محض خیالی طور پر عجیب و غریب اور خوفناک عناصر کی تلاش سے ان ناولوں کو جمالیاتی مسرت کا ذریعہ بنایا گیا۔

ہیبتی ناولوں کے سلسلہ میں "میکنزی" Mackenzie کا نام سب سے پہلے آتا ہے وہ کوئی بڑا فنکار نہیں تھا لیکن اسٹرن اور روسو سے براہ راست متاثر تھا۔ اس کا ناول Man Of Feeling جو ۱۷۷۱ء میں شائع ہوا اسٹرن کے Sentimental Journey کی یاد دلاتا ہے لیکن میکنزی تکنک میں کبھی اپنے پیشرو کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ اس کا مرد حساس اکثر جذبات کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی دنیا بھی بھری معلوم ہوتی ہے۔ اس ناول میں ایک قسم کی رومانی اداسی ملتی ہے جو بالخصوص رومانی مزاج کا خاصہ ہے۔

ہوریس والپول Horace Walpole اپنے مشہور ناول Castle Of Otranto کی بنا پر بہت مقبول ہوا اس نے اپنے ناول کا پس منظر ازمنۂ وسطیٰ میں رکھا ہے جس کی رنگین ماضی سے افسانہ کے نفسیاتی ماحول کو پیش کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے یہاں سحر و افسوں سے ایک خاص قسم کی فضا پیدا کی گئی ہے جو ہمیں مبہوت کئے بغیر نہیں رہتی۔

مسز ریڈکلف Mrs. Red Cliff ہیبتی ناولوں کی سب سے بڑی نمائندہ ہے۔ اس کا اصل نام این وارڈ Ann Ward تھا لیکن لندن میں ایک صحافی وکیل ولیم ریڈکلف سے شادی کی نسبت سے "مسز ریڈکلف" کے نام سے ہی مشہور ہوئی۔ اس کے

تمام ناول اٹھارھویں صدی کی آخری دہائی میں لکھے گئے۔ ان میں سب سے مشہور A Sicilian Romance, The Castle Of Athlin, The Mysteries Of Udolpho, The Romance Of The Forest اور The Italian ہیں۔

مسز ریڈکلف کے ناولوں میں سب سے پہلے حیرت و استعجاب اور مافوق الفطرت سے ایسا کام لیا گیا جس کا اثر دوسرے اصناف پر بھی پڑے بغیر نہیں رہ سکا۔ اگرچہ ان میں طول بیان اور گراں بار اسلوب کے علاوہ کرداروں کا سپاٹ پن کھلنے لگتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے مافوق الفطرت سے جو کام نثر میں ریڈکلف نے لیا وہ نظم میں کولرج Coleridge ہی کا حصہ ہو کر رہ گیا۔ یہ اپنی جگہ خود ایک اہم اکتساب ہے۔ ریڈکلف کے افسانے معمولی واقعوں اور سازشوں سے کچھ اس طرح مرکب ہوتے ہیں کہ ہمارے اوپر ایک قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ہم خفیہ دروازوں، زنگ آلود نیچوں اور جادوگری کے کارناموں میں یقین کرنے لگتے ہیں۔ ان ناولوں میں سب سے امتیازی خصوصیت ان کی پراسرار فضا ہے جس سے مصنف کے قوت بیان کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ کہانی جسقدر آگے بڑھتی جاتی ہے ہم مختلف مناظر سے ہی محظوظ نہیں ہوتے بلکہ نامعلوم وسعتوں میں سیر کرنے لگتے ہیں۔ ناول نگار نے مانوس اشیا اور عام حالات میں بھی دور از قیاس شعبدہ بازیاں دکھائی ہیں جن کی دلچسپی آج کے سائنسی دور میں بھی ختم نہیں ہو سکی ہے۔

مسز ریڈکلف کے زمانہ تک انگریزی ناول وسطی فرانس، پیرنیز۔ اپنائن اور آلپس پہاڑ اور جنوبی اٹلی سے نامانوس تھا لیکن اس نے اپنی قوت متخیلہ سے ان ممالک کو اس طرح رومانی انداز میں پیش کیا ہے کہ ان کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ پہاڑوں، جنگلوں اور دوسرے فطری مناظر کی مصوری میں بھی ریڈکلف کو خاص ملکہ حاصل ہے یہاں تک کہ عام فطرت خود کہانی کا پس منظر ہو جاتا ہے۔

نثر

اٹھارھویں صدی کے آخری تیس سالوں کے تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں نثر میں روایات کی پاسداری اور جدید تحریکوں سے بیزاری کا ثبوت ملتا ہے۔ اگرچہ ان روایات پر روح عصر

کا پرتو پڑے بغیر نہیں رہ سکا لیکن ادبی اصناف میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں رونما ہوسکی۔ افادی تحریک Utilitarian Movement بھی روایت سے علاقہ کے باوجود درمیانی طبقہ کے روایتی نظریات سے زیادہ نزدیک تھی۔ اس تحریک کے بنیادی عوامل مادی خوشحالی اور معاشی آزادی رہے اور چونکہ اس زمانہ میں ہر مسئلہ کو عقل و استدلال سے تشریح کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا اس لئے فلاسفہ و مذہبی پیشوا اپنے خیالات کی تبلیغ میں اس نکتہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ ہارٹلے Hartley اور پریسٹلے Priestley جیسے مصنفین اسی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں۔

جمالیات اور ادبی تنقید میں بھی یہی روح کام کرتی رہی۔ اٹھارھویں صدی میں عام ذہن قوانین و ضوابط کا گرویدہ تھا۔ اور مادی و روحانی مسئلوں میں کوئی خاص امتیاز نہیں کیا جاتا تھا اس لئے فن اور ادب کو بھی خاص نظام و اصول کے تحت لانے کی کوششیں جاری رہیں۔ اس طرح کلاسیکی اثرات کی بدولت ادبی تنقید نے مستقل فلسفہ کا روپ اختیار کرلیا۔ اس زمانہ میں قدیم اور جدید مشاہیر کے تقابلی مطالعہ کا خاص میلان تھا۔ اٹھارھویں صدی کے ابتدا میں ہی سر ولیم ٹمپل سوفٹ نے اس معرکہ میں نمایاں حصہ لیا تھا لیکن وسط صدی میں جب قدما کی بیجا تقلید کی مخالفت ہونے لگی تو یہ مسئلہ پھر اپنی تمام توانائی کے ساتھ ابھرا۔ تجدید کے حامیوں اور روایت کے پاسبانوں میں ایسی ٹھن گئی کہ دونوں فریقین اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے لئے مجاہدانہ کوششیں کرنے لگے۔ رومانی ادیب اور فنکار ادب میں نئے عناصر کو راہ دے رہے تھے لیکن قدیم مدرسہ کے حامی ابھی تک پرانے اقدار کو سینے سے لگائے بیٹھے تھے مگر فتح رومانیوں کو ہی نصیب ہوئی۔ فن اور ادب میں حسن کے نظریات کلاسیکی اثرات سے آزاد ہوکر مرتب ہوئے اور قبل اس کے کہ ورڈسورتھ کولرج اور شیلی عملی طور پر میدان میں اتریں۔ ہوگارتھ Hogarth جیسے مصور نے "حسن کا تجزیہ" The Analysis of Beauty وارٹن Warton نے Essay On Pope برک Burke نے "حسین اور ارفع" Sublime & The Beautiful لکھ کر انقلاب سا بپا کردیا۔

اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں آدم اسمتھ نے "دولت اقوام" Wealth Of Nations اور گبن Gibbon نے "سلطنت روما کا عروج و زوال"

ناکھ کر دنیا کے ادب میں قابل رشک مقام حاصل کر لیا۔

پیش رومانی دور The Pre-Romantic Period

(سنہ ۱۷۴۰ء سے سنہ ۱۷۹۸ء)

اٹھارھویں صدی کے آخری تیس سال انگریزی ادب کی تاریخ میں ایک جداگانہ دور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کلاسیکی رجحانات کے ساتھ اس عبوری دور کا ادب رومانیت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ اس دور کے ادب میں وہ عناصر اور عوامل ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن سے رومانی تحریک کو تقویت ملی اور فکر کی بجائے جذبہ واحساس کو ترجیح حاصل ہوئی۔ اس عہد کی امتیازی خصوصیت تخیل کی بیداری ہے جس سے احساس کے احیا میں مدد ملی اور کلاسیکی عقلیت کو زوال ہونے لگا۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس دور کے ادب میں جذباتی تسکین کے لئے جہاں ازمنۂ وسطیٰ کی داستانوں اور کہانیوں کا سہارا لیا گیا وہاں قدیم یونان اور روما کے اساطیر و خرافات سے بھی شغف پیدا ہونے لگا۔

اگرچہ انگریزی شاعری اور ناول میں تخیلی بیداری کے آثار جدید کلاسیکی دور میں بھی نمایاں ہے لیکن سنہ ۱۷۶۰ء کے بعد انقلاب کے سارے علامات باہم مربوط ہو کر نئے زمانہ کا پیغام دینے لگے ماضی کے احساس، نیرنگیوں کی تلاش اور اسرار و رموز کے انکشاف کی خواہش نے دیکھتے دیکھتے ادب کا مزاج بدل دیا۔ ان تمام نئے میلانات میں دور دراز ماضی کے ساتھ یگانگت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ جو زمانہ ہم سے بہت دور ہو جاتا ہے اس کا تصور بہت دلپذیر ہوتا ہے اس لئے پیش رومانی عہد میں ادیبوں کا میلان لازمی طور پر حال کی پراگندگی کے باعث ماضیات کی طرف ہوتا گیا۔ اس دور کے ادب میں جدید کلاسیکی روایات کے خلاف بغاوت کا جذبہ تو ضرور موجود ہے لیکن کسی واضح تعمیری نصب العین کا پتہ نہیں چلتا۔ شاید ورڈسورتھ سے پہلے جدید رجحانات کو تحریک کی صورت میں کسی اور ادیب نے نہیں پیش کیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں تخیلی نشاۃ الثانیہ دراصل ازمنۂ وسطیٰ کی بازیافت تھی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس قسم کی کوشش دور ایلزبیتھ سے ہی انگریزی ادب میں ہمیشہ جاری رہی لیکن ان کے لئے سازگار ماحول اب تک میسر نہیں ہو سکا تھا۔ سترھویں

اور اٹھارھویں صدی میں ڈرائیڈن، اڈیسن اور پوپ، چاسر سے بخوبی واقف تھے لیکن صدی کے اواخر میں یہ رجحان بہت عام ہوا۔ شاعروں نے آئس لینڈ اور اسکینڈ نیویا کی گاتھاؤں سے نئی شاعری کے لئے مواد حاصل کیا اور میکفرسن Macpherson نے Ossian Tales سے قدیم غنائیانہ طرز زندگی اور شمال کی پراسرار فضاؤں کو عوام سے روشناس کرایا۔ طامس پرسی Thomas Percy کی مشہور تصنیف "آثار باقیہ" Reliques جو ۱۷۶۵ء میں شائع ہوئی اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے۔ پرسی کے قدیم لوک گیت میکفرسن کی داستانوں سے مشابہت کے باوجود اپنا الگ انداز رکھتے ہیں۔ ان میں قدیم و جدید کا امتزاج ہے مگر ماضی کو ظاہر کرنے کی کوشش زیادہ نمایاں ہے۔ جواں مرگ شاعر چیٹرٹن Chatterton کی "راؤلے نظمیں" Rowley Poems میں بھی تخیل اور احساس کی شدت محسوس ہوتی ہے۔ چیٹرٹن نے اپنی نظموں میں قدیم شاعری کا ایسا چربہ اتارا ہے کہ عرصہ دراز تک لوگ انھیں کسی اور شاعر کا کارنامہ سمجھتے رہے۔ اس کے یہاں بیان کی شیرینی، احساس کی گھلاوٹ اور پر ترنم روانی ملتی ہے۔

پیش رومانی دور میں مورخوں اور نقادوں کی خدمات بھی بہت حد تک قابل قدر ہیں۔ رچارڈ ہرڈ Richard Hurd کے یہاں انقلاب پسندی کے عناصر دور تک نظر نہیں آتے مگر اس کے باوجود وہ اپنی تصانیف میں نئے عناصر کو داخل کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ادبی تنقید میں کلاسیکی نصابیت کو شکست ہونے لگی یہاں تک کہ صدی کے آخر میں رومانی جہاد نے ایک بالکل نیا موڑ اختیار کر لیا جو آنے والی صدی کی کئی دہائیوں تک انگریزی فکر و فن کے لئے نئی شاہراہ بنا رہا۔

پیش رومانی شعراء

(۱) کاؤپر Cowper سنہ ۱۷۳۱ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک

انگریزی ادب میں احیائے تخیل کے ساتھ مذہبی فکر نے بھی ایک نیا راستہ اختیار کیا جس سے غیر شعوری طور پر رومانی تحریک کو تقویت ملی۔ ابتدا میں یہ تحریک یونیورسٹیوں تک محدود رہی لیکن

رفتہ رفتہ اس کا اثر عوام تک پہنچا اور اس مذہبی بیداری کے اثرات دیر پا رہے۔ اس مذہبی تحریک کے زیر اثر ادب اور شاعری میں بالخصوص روحانی اور اخلاقی اقدار پر زور دیا گیا مگر جمالیاتی ذوق کی کوئی خاص حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ اس ضمن میں کاؤپر کی شاعری خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ رومانی شاعروں سے پہلے انگریزی شاعری میں مواد اور ہیئت کے اعتبار سے جو تجربے کئے گئے ان میں کاؤپر کی شاعری نہایت اہم درجہ رکھتی ہے۔

کاؤپر کی زندگی تلخیوں اور ناکامیوں کا مرقع تھی لیکن اس کے یہاں کلاسیکی اعتدال اور اخلاقیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کے شاعرانہ نظریہ کی بنیاد اس کے اپنے مذہبی ایمان پر رہی جس میں خلوص اور صداقت کا خاص حصہ ہے۔ اگر کاؤپر کے یہاں انسانیت سے ہمدردی ملتی ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے ذاتی آلام نے اس کے اندر ایک گھلاوٹ اور سوز و گداز پیدا کر دیا تھا۔ اسکی مقبولیت کا راز اس کے مذہبی خیالات و عقاید سے زیادہ اس کی انسانی ہمدردی ہی ہے فطری شاعری میں ورڈسورتھ اس سے سبقت لے گیا اور غنائی شاعری میں بھی شیلی اور ٹینی سن سے اسکا کوئی مقابلہ نہیں مگر عام انسانی خیالات کو خلوص اور سادگی سے بیان کرنے میں کوئی دوسرا شاعر اس کا حریف نہیں ہو سکا۔ کاؤپر نے اپنی شاعری کے لئے مواد عام زندگی کے تجربے اور مطالعے سے حاصل کیا جس میں تصنع اور تکلف کا کوئی شائبہ نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے تاثرات نہایت سچے تلے انداز میں بیان کئے ہیں جس سے کچھ لوگوں نے اسے پوپ کے متبعین میں شامل کرایا مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلوب بیان کے اس سطحی مشابہت کے علاوہ کاؤپر اور پوپ میں مشترک عناصر بہت کم ہیں۔ پوپ کی شاعری کا موضوع حیات انسانی نہیں بلکہ اپنے زمانہ کی "سماجی زندگی" ہے۔ اس کے برخلاف کاؤپر گھریلو اور دیہاتی زندگی کا شاعر ہے۔

کاؤپر نے درمیانی طبقہ کی دیہاتی زندگی کی جو جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں وہ اس دور کے کسی اور شاعر کے یہاں مفقود ہیں۔ وہ اٹھارھویں صدی کے فارغ البال گھرانوں کی روزمرہ زندگی کو تمام جزئیات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ خانگی زندگی کی آسودگیاں اور نجی مسرتوں کا اظہار ہے۔

کاؤپر نے اپنی مشہور نظم "الیگزینڈر سلکرک کی تنہائی" میں اپنی انسان دوستی اور خانگی زندگی کی مسرتوں کو نہایت دلسوزی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظم کا ہیرو کسی جزیرہ میں وطن سے دور اپنی وسیع مگر غیر آباد سلطنت کا گویا شہنشاہ ہے مگر تنہائی سے تلخ ہو کر کہتا ہے:۔

"اے تنہائی! تیری وہ دلربائیاں کہاں ہیں
جو رشیوں نے تیرے چہرے میں دیکھی ہیں
مجھے تو زندگی کے خطروں میں رہنا زیادہ پسند ہے
بنسبت اس کے کہ اس بھیانک ویرانہ میں حکومت کروں"

سنہ ۱۷۸۲ء میں کاؤپر کے مجموعۂ کلام میں اگرچہ اخلاقیت کے ساتھ کلاسیکی عناصر بھی ملتے ہیں لیکن شاعر کی اجتہادی صلاحیتوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ اس کے یہاں طامسن کی فطرت نگاری اور پوپ کی مرصع فنکاری نہیں مگر اس کی شاعری یقیناً نئے دور کی آئینہ دار ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح جانسن کے ساتھ انگریزی ادب میں ایک دور کا خاتمہ ہو گیا اسی طرح کاؤپر سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے اپنی نظم Table Talk میں جدید کلاسیکی مدرسہ کی نفاست پسندی اور اعتدال کوشی کی اسی طرح مذمت کی ہے جس طرح ورڈسورتھ نے اپنے مقدمہ Preface To Lyrical Ballads میں کی ہے۔ وہ خود شاعری میں شدت احساس اور جدتِ بیان کا قائل ہے:

Give Me The Line That ploughs Its stately
Course Like A Proud Swan, Conquering
The Stream By Force.

اگرچہ خود کاؤپر کے یہاں اس اعلیٰ تخیل اور بلیغ آہنگ کا فقدان ہے جو ورڈسورتھ جیسے شعراء کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس کے یہاں ایک خاص قسم کا ولولہ اور انہماک موجود ہے جس سے اس کی منظر نگاری جاندار معلوم ہوتی ہے۔ جذبہ کا خلوص اور براہ راست تاثرات کو نظم کرنے کی قابلیت نے ہی اسے رومانی تحریک کے پیشروؤں میں ممتاز مقام دیا ہے۔

کاؤپر کا سب سے اہم کارنامہ The Task ہے جس میں اسکی شعری قابلیت کے بہترین جوہر کھلتے ہیں۔ سادگی اور خلوص کے ساتھ روزمرہ زندگی کی ترجمانی اور

فطرت نگاری قابل تقلید ہے۔ اگرچہ یہ نظم بھی رسمی تکلفات سے پاک نہیں لیکن پوپ کے مدرسہ کا کوئی شاعر اس پایہ کی نظم نہیں لکھ سکتا تھا۔

(۲) جارج کریب George Crabbe سنہ ۱۷۷۵ء سے سنہ ۱۸۳۲ء

پیش رومانی شاعروں میں کاؤپر کے ساتھ کریب کا نام لازمی طور پر آتا ہے۔ کریب کے یہاں بھی جدید کلاسیکی اثرات کے ساتھ کچھ دوسرے نئے عناصر اور عوامل کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی شاعری میں روایت اور رسم پرستی سے زیادہ جذبہ اور احساس کی سچائی اور فطرت کی عکاسی ملتی ہے جو اس دور کے دوسرے شاعروں کا خاصہ ہے۔

اگرچہ کریب کی پیدائش اور تربیت ماہی گیروں کے ایک معمولی گاؤں میں ہوئی تھی لیکن اس کو شاعری سے فطری مناسبت تھی۔ اپنی نظم "امید" Hope پر انعام پاکر وہ سیدھے لندن آیا جہاں برک کی مدد سے اس نے اپنی نظم Library شائع کی مگر آخر کار وہ اپنے گاؤں جاکر پادری ہوگیا۔

کریب کی نظموں میں Village اور Parish Register کے علاوہ Borough مشہور کارنامے ہیں۔ یہاں ہمیں پوپ کی چستی اور انداز بیان میں اختصار کی جھلک ملتی ہے۔ لیکن کریب کے یہاں جو خلوص اور جذبہ کی سچائی ہے وہ پوپ کے یہاں مفقود ہے۔ اس کی تلخیوں نے کہیں نامرادی کا لہجہ نہیں اختیار کیا۔ اسی وجہ سے اس کی شاعری میں اس کے کردار کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ کریب فطرت کی مصوری میں جزئیات اور حقیقت نگاری کو مدنظر رکھتا ہے۔ اگرچہ اس کے یہاں کاؤپر کی پرتاثیر حلاوت نہیں ملتی مگر فطرت کو اس کے واقعی رنگ میں پیش کرنے میں اسے خاص کمال حاصل ہے۔

(۳) برنس Burns سنہ ۱۷۶۲ء سے سنہ ۱۸۵۰ء تک

وہ تمام شعراء جن کی شاعری میں نئے محرکات اور رجحانات سے رومانیت کا آغاز ہوا اپنے فن اور طریق اظہار کے لحاظ سے عبوری دور ہی کی مخلوق ہیں۔ چنانچہ اگر ہم میسن Mason سے لے کر بلیک Blake کی شاعری کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ میسن کے یہاں ابھی پرانی روایات کے آثار موجود ہیں اور اس کی شعری کائنات میں فطرت، غم اور

ماضی کا حسین تصور گونج رہا ہے مگر اس کے برخلاف برنس اور بلیک جیسے شاعروں کے کلام میں ان کی انفرادیت روایات پر غالب نظر آتی ہے۔ برنس نے داخلی شاعری کے سوتوں کا ازسرِنو پتہ چلایا اور بلیک نے حقائق کو وجدانی رنگ دیا۔ اگرچہ برنس اپنی مخصوص طبیعت اور فطری میلان کے باعث کسی مدرسہ کا بانی نہیں ہو سکا مگر رومانی شاعری کے پیش اماموں میں اس کا بھی شمار ہے۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ برنس جاہل مطلق تھا اس لئے کہ وہ بھی اٹھارھویں صدی کی نئی شعری قدروں کا وارث ہے اور اس نے بھی اس وراثت سے اپنے طور پر استفادہ کیا۔ وہ انگریزی شاعروں میں پوپ، طامسن اور گرے سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے جب وہ انگریزی زبان میں لکھتا تھا تو اس کے پیچھے اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کی شاعری کی بہترین روایات ہوتی تھیں انھیں اسباب کی بنا پر انگریزی شاعری میں برنس کا مقام متعین کرنا قدرے مشکل ہے۔ اس کی زبان بہت حد تک آسان مگر شدت احساس لئے ہوئے ہے اور اسی طرح اس کے محرکات شعری جس میں دیہاتی فضا اور معاشرت کو خاص دخل ہے، منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی برنس اسکاچستانی بولی کو جس شعور اور سلیقہ کے ساتھ استعمال کرتا ہے اور اس سے جو نیا آہنگ پیدا کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس نے اپنے تاثرات کو جس سادگی اور ساختگی سے بیان کیا ہے اس سے اس کے یہاں "آورد" کا گزر نہیں۔

برنس کے شعری کارنامے اعلیٰ درجہ کلاسیکی تخلیقات کا نمونہ ہیں۔ ان نظموں میں کسی قسم کی مدرسیت کی بجائے جمالیاتی اقدار ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اختصار اور اعتدال، سلاست اور برجستگی شاعر کے اسلوب بیان میں نمایاں ہیں۔ برنس محض جذبات کا شاعر نہیں بلکہ اس کے یہاں عقلیت اور جذباتیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اس کی نظموں میں رومانیت کے عناصر —— داخلیت، احساس، فطرت سے رغبت اور تخیل کی پرواز —— بھرپور موجود ہے مگر اس کے باوجود وہ خالص رومانی شاعروں کی خرابیوں سے آزاد ہے۔ اس کی روح ایک صحتمند اور توانا شاعر کی روح ہے جو مذہبی اور سماجی قید و بند کو توڑ کر آزادی کی تحریک کرتی ہے۔ اس کی نظموں میں Jolly Beggars اور Holy Willie's Prayer کے علاوہ

John Barleycorn اور دوسرے مرثیے اور گیت بہت مشہور ہیں۔

(۴) بلیک Blake ۱۷۵۷ء سے ۱۸۲۷ء تک

اٹھارھویں صدی کے آخر میں انگریزی ادب ایک نئے مزاج سے آشنا ہو رہا تھا اور کلاسیکیت کے آثار رفتہ رفتہ محو ہونے لگے تھے۔ اگرچہ ۱۷۹۸ء سے قبل باقاعدگی سے ادب پر رومانیت کا غلبہ نہیں ہو سکا لیکن بلیک نے اپنی وقیع شخصیت، جذباتی خلوص اور بیان کی سادگی سے وہ انقلاب برپا کر دیا جس کے بغیر ورڈسورتھ اور کولرج کی تحریک شاید ایک عرصہ تک صدا بصحرا رہتی۔

بلیک ایک فنکار کی حیثیت سے کسی نظریہ کا پابند نہیں۔ اس کے یہاں شعوری طور پر کسی مدرسہ یا نصاب کی تقلید کے نقوش نہیں ملتے۔ ادب کے کسی مصلح نے شاید ہی کبھی اس طرح اپنی اندرونی تحریک کی پیروی کی ہوگی جتنی بلیک نے کی۔ وہ داخلیت کا اس حد تک پرستار ہے کہ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص لغات استعمال کرنے لگتا ہے جو عوام کے تجربات و تاثرات اور زبان و بیان سے بہت دور ہے۔ اسی لئے جب ہم ورڈسورتھ کو رومانی تحریک کا بانی کہتے ہیں تو بلیک کو محض ایک منفرد شخصیت ہی تصور کرتے ہیں۔

بلیک کی شاعری میں ہیئت و مواد کے اعتبار سے ایسی جدت ملتی ہے کہ وہ دوسروں سے ہمیشہ منفرد رہا۔ اس کا حلقہ احباب بھی بے حد محدود تھا اور ان لوگوں میں بھی اس کی شاعری کے متعلق مختلف رائیں تھیں۔ حق تو یہ ہے کہ تخلیقی اُپج کی تمام انفرادیت بلیک پر ختم ہو جاتی ہے یہ تو کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ خارجی اثرات سے یکسر بے نیاز تھا لیکن اس کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ بالکل نرالا تھا۔ مصوری میں اس کے یہاں ایک ناقابل تقلید مجتہدانہ بصیرت کا پتہ ملتا ہے اور اس کی شاعری بھی ایک مخصوص اشاریت Symbilism کی حامل ہے جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ اس کا تصورِ حیات اور اس کی شاعری دونوں مجرد دنیا میں مسلسل پرواز ہیں جو ہمارے لئے محض مجذوبانہ قسم کی باتیں ہیں لیکن بلیک کے لئے سراپا حقیقت۔

بلیک کی ابتدائی نظمیں جنھیں وہ اپنی زندگی کے وقفوں میں لکھتا رہا ایک نئی قسم کی شاعری کی پیشین گوئی کرتی ہیں۔ ان کی سب سے اہم خصوصیت ان کی "آمد" اور شدید قسم کی داخلیت ہے جس میں عارفانہ وجدانیت اور تخلیقی قوت کا احساس ہوتا ہے۔ بلیک کی شاعری

میں سب سے اہم موضوع "بچوں کی روحانی قوت" ہے۔ اس کے اسلوب بیان میں اسی اعتبار سے روانی، سادگی اور اثر ہے۔ ان مختصر نظموں میں ہمیں رومانیت کے عناصر نظر آتے ہیں چنانچہ "معصومیت کے راگ" Songs Of Innocence میں اگر محبت اور مسرت کے گیت ہیں تو "بلوغت کے راگ" Songs Of Experience میں دنیا اور سماج کی خرابیوں کے خلاف بغاوت اور غم کا لہجہ ہے۔ بلیک نے بچہ کی آنکھوں سے کائنات کا مشاہدہ کیا ہے، اسی کے حواس سے اسے محسوس کیا ہے اور اسی کے دل سے اس کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے نزدیک "بچہ" انسانی ذہن کا بہترین نمایندہ ہے جس کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔

بلیک کے یہاں رومانی عناصر اس کی شدید انفرادیت، احساس استعجاب، فطرت کے تصور اور اس کے غنائی لہجہ میں شدت کے ساتھ ملتے ہیں۔ متاخرین شعراء میں شیلی نے بلیک کا باغیانہ انداز اختیار کیا لیکن اس کے یہاں بلیک سے زیادہ واضح تصورات ملتے ہیں۔ بلیک کی شاعرانہ بصیرت اور اسلوب کی سادگی کے درمیان پورا آہنگ ہے۔ اس کے الفاظ میں ایک مخصوص روانی اور موسیقیت ہے جو ہمیں دور ایلزبتھ کی غنائی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔

"الہامیات" The Prophetic Books میں بلیک ایک تصوراتی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ یہاں اس کا فلسفۂ حیات عجیب وغریب میلانات کا مجموعہ ہے جسمیں آزادی کا منشور پیش کرتے ہوئے شاعر نے تمام اقدار وعقائد پر جارحانہ تنقید کی ہے۔ چاہے مذہب ہو یا سیاست، عقلی ہو یا سائنٹفک عقائد ہوں یا خیر وشر کے تصوّرات، بلیک سب کا ایک مخصوص نظریے سے جائزہ لیتا ہے۔ اس کے یہاں صوفیا کا انداز جمہوریت کے تصور سے گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے نقادوں نے اسے روحانی بغاوت کا علمبردار کہا ہے۔

باب پنجم

رومانی دَور The Romantic Age

۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۲ء تک

نشاۃ الثانیہ کے بعد اگر کسی تحریک نے یورپین ادب پر ہمہ گیر اور دیرپا اثرات چھوڑے تو وہ رومانی تحریک Romantic Movement ہے جو اٹھارھویں صدی کی آخری دہائی سے لے کر انیسویں صدی کی تین دہائیوں تک اس دور کی فضا پر چھائی رہی اس تحریک کی ابتدا کسی خاص ملک یا زبان میں نہیں ہوئی بلکہ زمانہ کا مطالبہ تھا کہ مصنوعی کلاسیکی روایات کے خلاف ادب اور زندگی میں نئی قدریں لائی جائیں۔ اس حد تک رومانی تحریک کلاسیکی ادب کی خشک ہیئت پرستی اور عقلی فلسفہ کی مادیت کے خلاف ردعمل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس تحریک میں عالمی ادب کے توانا عناصر کو از سر نو زندہ بھی کیا گیا۔ اسی لئے رومانی تحریک کے متعلق یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ یہ بیک وقت بغاوت بھی ہے اور احیار Revival بھی۔ رومانیت دراصل ایک مخصوص مزاج کا نام ہے جو ہر دَور میں کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہوتا رہا ہے لیکن "رومانی تحریک" ۱۷۹۸ء سے ۱۸۳۲ء کے درمیان یورپین ادب پر خاص اثرات کی وجہ سے زیادہ اہم ہے۔

شاید اس بات سے کسی کو انکار ممکن نہیں کہ فرانسیسی مفکر اور ادیب روسو

رومانی تحریک کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا رہنما ہے۔ روسو کلاسیکی ادب کا قائل ہوتے ہوئے زندگی اور ادب میں انقلاب چاہتا تھا اور اس نے دونوں کو نئی قدروں سے آشنا کرنے کے لئے نئے راستہ پر لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد کے صالح سیاسی مفکروں نے اسے اپنا پیغمبر مانا اور فلسفیوں مثلاً ہیوم، کانٹ اور ہرڈر وغیرہ نے اس کے خیالات کو بڑی عقیدتمندی سے قبول کیا یہی نہیں بلکہ گوئٹے اور شلر جیسے شاعروں اور ادیبوں نے اس کے اسلوب بیان کی پیروی کی اور اسکی فطرت پرستی سے استفادہ بھی کیا۔

رومانی تحریک کی چند خصوصیات جو جرمن، فرانسیسی اور انگریزی ادب میں مشترک ہیں لہذا ان کا مختصر جائزہ انگریزی ادب کے طلبار کے لئے ضر[illegible]

(۱) انفرادیت :- رومانیت پسندوں نے سماج یا حکومت کی اصلاح سے زیادہ افراد کی اصلاح کو مدنظر رکھا۔ وہ ایسی سوسائٹی کے خواہاں تھے جس میں ہر قسم کی سیاسی اور معاشرتی آزادی حاصل ہو۔ اس جمہوری تصور کا سنجیدہ پہلو فرانسیسی بغاوت کے نعروں میں مضمر ہے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو ادیبوں اور شاعروں کی انانیت اور خودنمائی ہے جس کا اثر ادب پر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔

(۲) جذباتیت :- رومانی فلسفہ نے عقلیت کی بجائے جذبات اور احساسات کی برتری کا دعویٰ کیا۔ رومانیت پسندوں کا قول تھا کہ سماج میں مذہب، حکومت اور دوسری پابندیوں سے انسان کی صلاحیتوں کا گلا گھوٹ کر رہ جاتا ہے۔ چونکہ کلاسیکی طریق معاشرت میں جذباتیت کو انسانی شخصیت کا وحشیانہ اظہار سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے نئی آزادی کی رو میں جذبات کے آزادانہ اظہار کو کلاسیکی اعتدال پسندی پر ترجیح دی گئی۔

۳ فطرت پرستی :- روسو جدید تہذیب کی مادیت اور مصنوعیت کے پیش نظر فطری زندگی کا قائل تھا۔ اس کی تحریک سے فطرت حسن اور خیر کی ایسی مظہر بن گئی جس کے آغوش میں انسان کی صلاحیتیں بخوبی تربیت پاکر بروئے کار لائی جاسکتی ہیں۔ اس خیال نے شاعروں اور ادیبوں کو اس قدر گرویدہ کیا کہ وہ انسانی بستیوں کو چھوڑ کر پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں کا خواب دیکھنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ رومانی تحریک کے زیر اثر عام جاہل دیہاتیوں کی زندگی سے

سے دلچسپی بڑھنے لگی اور ان کی زبان کی سادگی اور تاثیر کا اعتراف ہونے لگا۔

(۴) رومانی ماورائیت :۔ فطرت سے دلچسپی اور فطری زندگی سے گرویدگی نے شاعروں اور ادیبوں کو دور دراز ملکوں کے عوام اور ان کی معاشرت کے براہ راست یا بالواسطہ مطالعہ کی طرف بھی رجوع کیا۔ محسوس دنیا کی تہ تہ نئی رنگینیوں کا راز معلوم کرنے کے بجائے یہ لوگ مافوق الفطرت اور ماورائی دنیا میں کھو کر رہ گئے۔

(۵) انسان دوستی :۔ رومانی شاعروں نے خود کو انسانیت کا مصلح قرار دیا اور اس کے لئے انھوں نے سیاسی، سماجی اور ادبی آزادی کا نعرہ بلند کیا۔ مختلف ملکوں میں لوک گیتوں سے دلچسپی بڑھنے لگی جس سے ابتدائی انسانی تہذیب کے چشموں کا سراغ لگایا گیا۔ سیاسی حد تک رومانی شاعروں نے غلام ملکوں کی بے بسی پر آنسو بہائے اور ان کی آزادی کے لئے آواز بلند کی۔

۶ بیزاری اور قنوطیت :۔ انیسویں صدی کے اوائل سے ہی رومانی شعرا کی رجائیت میں قنوطیت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ فرانسیسی انقلاب سے نئی انسانیت کو جو امیدیں بندھی تھیں وہ نپولین کی جابرانہ حکومت سے خاک میں مل کر رہ گئیں۔ رومانیت پسندوں پر اس شکست کا شدید اثر ہوا اور وہ انسان کے مستقبل انسان سے ہی ناامید ہونے لگے۔ اس صدمہ سے حساس طبائع کا سنبھلنا مشکل تھا۔ چنانچہ ورڈسورتھ اور کولرج کی شاعری میں اس محزونیت نے گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔

انگریزی رومانی تحریک کے پس پشت قومی اور یورپی اثرات ساتھ ساتھ کارفرما تھے۔ ورڈسورتھ اور کولرج نے فرانس اور جرمنی سے جو اثرات قبول کئے وہ نہ صرف ان کی طبیعت سے ہم آہنگ تھے بلکہ قومی ادب بھی اس کا متقاضی تھا۔ پوپ اور جانسن کے مدرسہ نے شاعری کو جن روایتی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اس کے خلاف ردعمل گرے اور کالنس کے زمانہ سے ہی شروع ہو چکا تھا لیکن برنس، بلیک اور ورڈسورتھ کی شاعری کے ذریعہ یہ نئی تحریک انگریزی ادب کی روح رواں بن گئی۔ انگریزی رومانی تحریک دراصل نشاۃ الثانیہ اور مذہبی اصلاح Reformation کی ایک کڑی ہے جو اس دور کی بڑھتی ہوئی مادیت اور عقلیت کے خلاف شدید

ردعمل کی شکل میں نمودار ہوئی۔

انگلستان میں سب سے اہم رومانی تحریک نشاۃ الثانیہ تھی جس کے زیر اثر سب سے پہلے فرد کی آزادی اور شاعری کی جذباتی اہمیت کو تسلیم کیا گیا تھا مگر انیسویں صدی کی رومانیت میں حیرت اور استعجاب کا وہ احساس بھی کارفرما ہے جو بعید سے بعید ماضی بالخصوص ازمنہ وسطیٰ کی زندگی اور اس کے طرز فکر و انداز اظہار کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ پرسی کی "آثار باقیہ" Reliques نے اگر ایک طرف قدیم ادبی اصناف کو زندہ کیا اور لوک گیتوں اور گاتھاؤں کی ترویج و اشاعت میں اہم حصہ لیا تو دوسری طرف کولرج نے فطرت کو مافوق الفطرت سے قریب کر دیا۔ دوسرے رومانی شاعروں میں ورڈسورتھ اور شیلی دونوں انسان دوست ادب کے بہترین نمائندے ہیں اور ان کے شاہکار تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ورڈسورتھ کا سب سے بڑا کارنامہ انگریزی زبان کو سلیس اور بامحاورہ بنا کر عوامی حیثیت دینا ہے۔ اس نے اپنے "مقدمہ" میں عام بول چال کی زبان کو مہذب سوسائٹی کی پرتکلف زبان پر ترجیح دی ہے۔ کیونکہ دیہاتی لوگ ہمیشہ اپنے جذبات کا اظہار بغیر کسی تصنع کے سیدھے سادے طور پر کرتے ہیں جس سے ان کی بات ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ڈرائیڈن نے انگریزی زبان کو لاطینی اثرات سے آزاد کیا مگر ورڈسورتھ نے زبان کی صفائی کے ساتھ انگریزی شاعری کو ایک بے حد لچکدار آلہ دیا جس کے بغیر رومانی شاعری اور عہد وکٹوریہ کے شاعروں کو خاطر خواہ کا[illegible]بی نہیں ہو سکتی۔

رومانی تحریک بھی ہر دوسری ادبی تحریک کی طرح اپنے ساتھ چند برکتیں لائی۔ چنانچہ یورپین ادب اور بالخصوص انگریزی ادب میں جو مختلف عناصر شامل ہوئے وہ اسی کا فیضان ہے۔ سیاسی اور انفرادی آزادی، فطرت پسندی، ماورائیت، عینیت Idealism وغیرہ تصورات سے ادب بالخصوص شاعری کا دامن بہت وسیع ہوا اور اس اثر سے مختلف مذہبی، فکری، سیاسی اور سماجی تحریکوں کا بھی ظہور ہوا جن کی بدولت زندگی کا عام تصور اور زندگی کے تمام شعبوں کے نظریے بدل گئے۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے رومانی تحریک کے صالح عناصر کا اثر زائل ہونے لگا تھا یہاں تک کہ رومانیت "ماورائیت" اور "فراریت" کے ہم معنی ہو گئی۔ شاعروں اور ادیبوں نے بھی ایسا انداز اختیار کیا جس سے اس تحریک میں زوال

کے آثار تیزی سے رونما ہونے لگے۔ امریکہ میں پو Poo فرانس میں بودلیئر Buedelaire اور انگلستان میں پری رفلائٹ شاعروں کے یہاں وہ توانائی نہیں ملتی جو رومانی تحریک کی اصل روح تھی۔ ان تمام شاعروں کے یہاں مریضانہ ذہنیت یا سستی لذتیت کا احساس ہوتا ہے غالباً اسی انحطاطی میلان کے پیش نظر گوئٹے کو کہنا پڑا کہ کلاسیکیت "صحت" ہے اور رومانیت "مرض" ہے۔ اس بات سے تو ہمیں بھی انکار نہیں کہ تخیل پر ضرورت سے زیادہ زور، داخلیت اور انفرادیت کے غلبہ اور روایات کی اندھا دھند تردید نے رومانی شاعروں کو بے مایہ کرکے چھوڑ دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ رومانی تحریک نے یورپی اور انگریزی ادب کو جو وسعت اور توانائی بخشی وہ عہد آفریں ہے جس تحریک نے کانٹ، ہیگل، بتھوون Beethoven ویگنر Wagner ورڈسورتھ، شیلی، بائرن، ایمرسن، ہیوگو Hugo اور گوگول Gogol جیسے مفکر اور فنکار پیدا کئے۔ اس کے متعلق زیادہ اختلاف رائے کی گنجائش نہیں۔

رومانی شاعروں کی پہلی نسل :-

ولیم ورڈسورتھ (سنہ ۱۷۷۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء)

ورڈسورتھ کی پیدائش انگلستان کے حسین و پرفضا خطہ کمبرلینڈ میں ہوئی جہاں اس نے ابتدائی تعلیم پائی۔ کیمبرج یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ فرانس کی سیاحت کے دوران میں "فرانسیسی بغاوت" کے سرگرم حامیوں میں بھی رہا۔ اگرچہ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و شاعری سے شغف رکھتا تھا لیکن فرانس سے واپسی کے بعد اس نے اپنے کو گویا شاعری کے لئے ہی وقف کر دیا۔

انگریزی شاعروں میں ورڈسورتھ کو جو ممتاز مقام حاصل ہے وہ اس کے باغیانہ خیالات سے گہرے تعلقات کی بنا پر ہے۔ لڑکپن ہی سے وہ اپنے علاقہ میں غریبوں اور کسانوں کی زندگی کا مشاہدہ کرتا رہا مگر یورپ کی سیاحت نے عام بنی نوع انسان سے اس کے روحانی رشتہ کو اور پختہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے ابتدائی کلام میں جو خلوص و اثر ہے وہ اسی جذبہ کا نتیجہ ہے۔ اس کا باغیانہ ولولہ سیاسی میدان میں ناکام ہو کر ادب کے میدان میں حیرت انگیز حد تک کامیاب رہا۔ یہ امر

واقعہ ہے کہ بلیک اپنی تمام جدت طرازیوں کے باوجود اٹھارھویں صدی کی شاعری کے مروجہ اسالیب کو چیلنج نہیں کرسکا لیکن ورڈسورتھ اور کولرج نے نہ صرف جدید کلاسیکیت کے خلاف بغاوت کی بلکہ رومانی تحریک کو بھی فروغ دینے میں کامیاب رہے۔

ورڈسورتھ کے ۱۷۹۸ء کے مجموعۂ کلام Lyrical Ballads اور انیسویں صدی کی پہلی دہائی کے مجموعوں سے ہم کو بہت صاف محسوس ہوتا ہے کہ انگریزی شاعری نے اب بالکل نیا رُخ اختیار کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے بڑی محنت اور ریاضت سے اپنے فن کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور اسے نفسیاتی گہرائی دی ہے جو کاؤپر اور بلیک کی نفسیات سے زیادہ واضح اور اثرانگیز ہے۔ ان تجزیاتی مطالعوں میں اگر ایک طرف یہ التزام رکھا گیا ہے کہ حقیقت نگاری کا دامن چھوٹنے نہ پائے تو دوسری طرف اعلیٰ اور مہذب طبقہ کے بجائے ادنیٰ طبقہ کے انسان کی روزمرہ زندگی سے اثرات قبول کئے گئے ہیں۔ ورڈسورتھ کی حقیقت نگاری ایک قسم کی مرکب تخلیق ہے جس میں حقیقت کی تلاش کے ساتھ فطرت سے دلچسپی اور غلط سماجی تفوق کے خلاف ردعمل، عام انسان کے سماجی وقار کے احساس کے ساتھ کارفرما ہے۔

رومانی شاعروں میں ورڈسورتھ کی شہرت اور عظمت کی بنیاد اس کی فطری شاعری پر ہے جس میں وہ نہ صرف متقدمین پر سبقت لے گیا بلکہ متاخرین میں بھی کوئی اس کا ہمسر نہ ہوسکا۔ وہ فطرت اور فطرت زندگی کا سب سے بڑا مبلغ اور پیغمبر ہے اور اس کی شاعری کتاب فطرت کی تفسیر ہے۔ طامسن، ٹنی سن اور آرنلڈ جیسے شعرا خارجی فطرت نگاری میں اکثر ورڈسورتھ سے آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن موخرالذکر کے کلام میں فطرت کو جو روحانی حسن نصیب ہوا ہے۔ وہ کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے۔ ورڈسورتھ نے فطرت کے خارجی حسن پر کبھی توجہ نہیں کی۔ بچپن کی خوش وقتیوں کے بعد وہ کائنات اور انسان کا مطالعہ فطرت ہی کے آئینہ میں کرنے لگا Prelude اور Tintern Abbey جیسی نظموں کو پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ورڈسورتھ کی فطرت پرستی کے تین ادوار ہیں۔ بچپن کا زمانہ شاعر کا حسّی دور تھا جب فطرت اس کی طفلانہ مسرتوں اور حیوانی حرکتوں کی مطیع تھی۔ جوانی میں وہ فطرت سے زیادہ قریب ہوگیا اور اس کا فطرت کا تصور زیادہ بلیغ ہوگیا۔ اس دور میں شاعر کا احساس تربیت پا کر ادراک کی منزل تک پہونچا ہوا

معلوم ہوتا ہے۔ آخری دور "فکری بلوغت" کا دور تھا جب شاعر نے فطرت اور انسان کو ہم آہنگ پایا اور انہیں سلسلۂ کائنات کا لازمی جزو قرار دیا۔

ورڈسورتھ نے فطرت کو ہر صورت اور ہر کیفیت میں دیکھا ہے اور اس سے مختلف اثرات قبول کئے ہیں۔ وہ ایک حسین محبوبہ کی طرح اپنی شوخیوں اور طنازیوں میں بھی اس کے قابل قبول ہے اور اپنی غضبناکیوں میں بھی۔ شاعر نے فطرت کے عاشق کی حیثیت سے "انفعالیت" کو ترجیح دی ہے کیونکہ اس کے نزدیک "عارفانہ مجہولیت" کے بغیر کوئی فطرت کے جلوۂ صد رنگ سے مستفیض نہیں ہو سکتا۔ اس کا یہ بھی نظریہ ہے کہ ہمیں فطرت کے خوش آئند پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی غارت گریوں پر بھی نظر رکھنا چاہیئے جن میں ہمارے لئے عرفانِ حقیقت کے سامان مہیا ہیں۔ ورڈسورتھ اپنی رجائیت کی بنا پر فطرت کی تباہ کاریوں میں بھی زندگی کی بشارت پاتا ہے۔

ورڈسورتھ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کے نظریات شعری کا جائزہ بھی ضروری ہے انگریزی ادب میں ورڈسورتھ نہ صرف رومانی شاعری کا خالق ہے بلکہ رومانی تنقید میں بھی اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ شاعری اس کے نزدیک قوی اور موثر جذبات کے بے ساختہ بہاؤ کا دوسرا نام ہے۔ اگر شاعر انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے میں ناکام ہے تو شاعری کا حق نہیں ادا ہوتا ہے شاعر بھی انسانوں کی طرح ایک انسان ہے جو دوسرے انسانوں سے خطاب کرتا ہے۔ لیکن وہ اعلیٰ بصیرت کا بھی مالک ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے جامع الصفات روح کا مالک Comprehensive Soul کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ شاعر اپنے احساسات اور تاثرات کی حسین دنیا میں اپنے لئے امن اور سکون کا ذریعہ تلاش کرتا ہے اور ابلاغ کے ذریعہ دوسروں کی مسرتوں کا بھی سامان کرتا ہے۔ اسی لئے ورڈسورتھ نے شاعری کو "تنہائی اور سکون میں یاد کئے ہوئے جذبات کا اظہار" کہا ہے جس میں شاعر کی شخصیت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ ورڈسورتھ رومانی نظریۂ شعر کا سب سے بڑا داعی ہے۔

کولرج (۱۷۷۲ء سے ۱۸۳۴ء)

ورڈسورتھ کے رفیقوں میں کولرج کی شخصیت سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ اس کے انفرادی فکر و احساس کی بنا پر اس کو "خلاق ذہن" Seminal Mind کہا گیا ہے

اگرچہ ورڈسورتھ کے پہلے مجموعۂ کلام میں کولرج کی شاعرانہ خصوصیات بخوبی نمایاں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کولرج کی اصلی صلاحیتوں کا اندازہ کرنا ہمارے لئے مشکل ہے اس لئے کہ افیون کی عادت نے اس کی شخصیت کو اچھی طرح بالغ اور بالیدہ نہ ہونے دیا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ کولرج اور ورڈسورتھ دونوں انگریزی شاعری کے ایک اہم موڑ پر ایک دوسرے کی رفاقت کے بعد دو مختلف راستے اختیار کر لیتے ہیں۔ ورڈسورتھ تو "جھیلوں کے اضلاع" میں ذہنی و قلبی سکون حاصل کرنے میں کامیاب رہا لیکن کولرج کو کبھی اطمینان قلب نہیں نصیب ہو سکا۔ اس حرماں نصیبی کے نقوش اس کی شاعری میں ہم کو ہر جگہ محسوس ہوتے ہیں۔ ابتدائی دور میں کولرج نے اٹھارھویں صدی کے آخری دور کے شاعروں کی تقلید کی۔ اس کے یہاں بھی اسلوب میں یہی کاوش جھلکتی ہے جو گرے Gray کی خصوصیت تھی مگر بہت جلد ورڈسورتھ کی صحبت اور جرمن رومانیت کے مطالعہ نے اس کے اندر یہ میلان پیدا کر دیا کہ وہ انفرادیت کے حقوق کو قائم رکھتے ہوئے سماجی شعور اور عام انسانیت کی دھن اپنی شاعری میں سموئے۔ یہ صالح میلان بھی گوناگوں اسباب کی بنا پر بہت جلد دب کر رہ گیا اور کولرج مافوق الفطرت کے دھندلکوں میں محو ہو گیا۔

مافوق الفطرت کا اثر انسانی تاریخ میں کم اہم نہیں رہا ہے۔ یونانی اور ہندوستانی دیوی دیوتاؤں سے لے کر جنوں اور دیوؤں کے افسانوں میں یہی عوامل کارفرما ہے۔ تہذیبِ انسانی کے ابتدائی دور میں خرافاتی توہمات کی بڑی اہمیت رہی لیکن سائنس کی ترقی سے تمام مافوق الفطری دلچسپیاں رفتہ رفتہ مفقود ہونے لگیں۔ معاشرتی زندگی میں ان تبدیلیوں کے باوجود ادیبوں اور شاعروں نے مافوق الفطرت عناصر کو رموز و علامات بنا کر ان سے بہت سے اہم کام لئے ہیں۔ آج بھی انسان کے دل میں نامعلوم کا خوف اور اس کی طرف سے وسوسہ باقی ہے۔ ادب میں مافوق الفطرت سے مراد یہ ہے کہ دیو، جنات اور بھوت پریت غرضکہ ایک فوق البشر عالم کی زندگی میں انسانی زندگی کے حقائق اور رموز تلاش کئے جائیں یا انسانی نفسیات پر ان کے غیر شعوری اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ رومانی شاعروں سے پہلے شکسپیر اور اسپنسر نے مافوق الفطرت کا استعمال کیا تھا لیکن کولرج کا طریقہ سب سے نرالا تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی فکر و تخیل سے کام لے کر مافوق الفطرت کے نئے رُخ دریافت

کئے اور اس سے اپنی شاعری میں نئی روح پیدا کی۔ اس لحاظ سے اس کی تین نظمیں "معمر جہازی" Ancient Mariner "کرستابل" Christable اور "قبلا خاں" Kubla Khan بڑی شہرت رکھتی ہیں۔

"معمر جہازی" ایک معرکۃ الآرا نظم ہے جس میں شاعر نے زندگی کے جلالی رخ کو پیش کرکے ہمارے اندر حیرت اور ہیبت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سمندری چڑیا Albatross کے مار دینے کے بعد جہازراں کے دل ودماغ پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اور اپنے گناہ کے کناروں میں اسے جو کچھ جھیلنا پڑتا ہے اس کی شاعرانہ ترجمانی کولرج سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔ شاعر نے سمندر کی خاموش فضا کو اس المیہ کا پس منظر بناکر حیرتناک کامیابی حاصل کی ہے۔ چاروں طرف سناٹے کا عالم اور پھر پانی سے گھرے ہونے کے باوجود پانی کی قلت، صبح وشام کا حسن اور ما فوق الفطرت مناظر، پڑھنے والوں کے اوپر عجیب کیفیت طاری کر دیتے ہیں۔

"کرستابل" اپنی رومانی کیفیت، تمثیلی فنکاری اور خواب وخیال کے باعث منفرد ہے۔ کولرج ہمیں عہد وسطیٰ کے قدیم قلعوں کی سیر کراتا ہے جس سے ماضی اور بالخصوص جاگیردارانہ نظام کی رومانی جھلکیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ نظم دراصل خیر وشر اور تاریکی و روشنی کے تصادم کا تخئیلی خاکہ ہے جس میں "جیرلڈن" شر کی علامت ہے مگر "کرستابل" کا کردار معصومیت اور پاکدامنی کے روایتی تصور کا پیکر ہے۔ شاعر نے ہیروئن کو اس کے ماحول سے اتنا ہم آہنگ بنا دیا ہے کہ اس کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں۔

"قبلا خاں" دراصل ایک خواب پریشاں کا سفری پیکری ہے جس میں شاعر عہد وسطیٰ کے مشہور تاتاری سلطان قبلا خاں اور اس کے دار الخلافہ کا ذکر کرتے ہوئے پراسرار اور طلسماتی غاروں کی سیر کرانے لگتا ہے جہاں چاندنی راتوں میں محروم ومحزون عورتیں اپنے بے وفا عاشقوں کا رونا روتی ہیں۔ نظم میں کہیں سے کوئی تسلسل نہیں ہے لیکن اس سے نظم کی اثر آفرینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کولرج نے ہماری جبلی قوتوں کا سہارا لے کر جبروتی قوت، محبت اور موسیقی کے لطیف ونازک اشاروں کو بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔

کولرج بھی ورڈسورتھ کی طرح نیچر کا بڑا دلدادہ تھا۔ ابتدائی کلام میں مناظر فطرت کے ساتھ اس کی بڑھی ہوئی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے لیکن ان مناظر سے اس کا لگاؤ محض سطحی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فطرت اپنی ہیئتوں اور کیفیتوں میں اب تک وہیں ہے جہاں وہ ابتدائے آفرینش میں تھی۔ یہ ہم ہیں جو اس کے اندر نت نئے رنگ بھرتے ہیں اور اس کو نئی نئی صورتیں دیتے ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے مخصوص رنگ میں فطرت کو دیکھتا ہے تو اُسے سمندر اور بحری زندگی کی تمام تر کارفرمائیاں، اندھیری راتوں میں ہُو کا عالم، چاندنی کی رومانی کیفیت "قبلاخاں" کی زیاں اور غار اور ابی سینیا کے پہاڑ اور کوہستانی حسینہ بھی حسین اور دلآویز محسوس ہوتے ہیں۔

بحیثیت شاعر کے کولرج کی شہرت چند مخصوص نظموں کی بدولت ہے لیکن اس مختصر سرمایہ کے باوجود وہ انگریزی شاعروں میں خاص اہمیت کا مالک ہے

رومانی شاعروں کی دوسری نسل :-

ورڈسورتھ، کولرج اور سدے Southey کے بعد رومانی شاعروں کی دوسری نسل کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان شعراء کے یہاں مختلف اثرات کارفرما ہیں مگر ان سب کے یہاں "شدتِ احساس" مشترک عنصر ہے۔ بائرن، شیلی اور کیٹس انقلاب فرانس کے بعد پیدا ہوئے اور ان ہنگامہ خیزیوں سے ناآشنا اور غیر متاثر رہے جن سے پہلی نسل کے رومانی شعراء پہلے متاثر ہوئے اور پھر بیزار ہوگئے۔ بغاوت کا جوش اگرچہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا لیکن انقلابی جذبات سے فضا اب بھی معمور تھی چنانچہ دوسری نسل کے تمام شاعروں نے سرزمین اطالیہ کو اپنا روحانی وطن بنایا اور عام انسانی آزادی کے علمبردار رہے۔ ان کے یہاں احساسات کی شاعری میں ایک خاص شدت پیدا ہوگئی۔ جو بائرن کی اخلاقی مزاج پیدا کرنے والی کلبیت، شیلی کی جمہوری تصوریت اور انسان دوستی اور کیٹس کی حُسن آفرینیوں میں ظاہر ہوئی۔ دوسری نسل کے شاعروں میں ایک بات اور قابلِ غور ہے۔ ان کے یہاں انفرادی لے اس قدر واضح تھی کہ وہ عوام سے دور ہوگئے اور عرصہ تک ان سے کوئی قرب نہیں محسوس کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام شعراء، ورڈسورتھ کے برخلاف عوام کی زندگی سے کچھ بے تعلق نظر آتے ہیں۔

بائرن (۱۷۸۸ء سے ۱۸۲۴ء) :-

انگریزی رومانی شاعروں میں جو مقبولیت بائرن کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کو نہ حاصل ہوسکی۔ یورپین رومانیت پر اس کے گہرے اثرات پڑے اور اس نے ایک حد تک بین الاقوامی رومانیت کی نمائندگی بھی کی۔ اس کے کلام میں ورڈسورتھ کے برخلاف داخلیت ذہنی اور اخلاقی انتشار کی حد تک پہونچ گئی جس سے ایک قسم کی ذہنی علالت اور خود شکستگی کا احساس ملتا ہے، اس میں سقیم ذہن اور مریض روح کا پروردہ ہے جس کی بنا پر اسے خود آزاری میں خوشی اور غم میں حسن نظر آتا ہے۔

یہ کہنا غالباً صحیح نہ ہوگا کہ بائرن کی زندگی ایک طرح سے نمائشی زندگی تھی جس میں اس نے سماج کے خلاف اپنی شخصیت کو دنیا کے سامنے لانے اور لوگوں کو اپنے خیالات سے چونکانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ اس کی قسمت کا نقشہ ہی ایسا بنا تھا جس میں حقیقی مسرت اور سکون کی گنجائش نہیں تھی۔ فطری غم پسندی اور ماحول سے بیزاری کے احساس نے اس کے اندر ایک قسم کا مریضانہ میلان پیدا کر دیا تھا جس سے اس کا سارا کلام متاثر ہے۔ بائرن کی زندگی میں جو تناقص تھا وہ مختلف عوامل کا نتیجہ تھا لیکن ان مختلف اور متضاد عناصر سے اس کی شخصیت کو جتنا بھی نقصان پہونچا ہے، ان سے اس کے فن میں خاص انفرادیت پیدا ہوگئی۔

اپنے ابتدائی کلام میں بائرن اٹھارھویں صدی کی جدید کلاسیکیت اور پوپ کی شاعری سے متاثر تھا۔ چنانچہ جب نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے اس کی شاعری پر لعن طعن کی تو اس نے پوپ کے نمونہ پر اپنے حریفوں اور ورڈسورتھ کے دبستان پر بھرپور وار کئے۔ مگر بائرن کی اصلی شہرت اس وقت ہونے لگی جب اس نے جنوبی یورپ کے ممالک کی سیاحت کے بعد "چائلڈ ہیرالڈ" Childe Harold کے دو حصے شائع کئے۔ اس نظم کی مقبولیت اس کی رومانی فضا اور دلکش مناظر کے باعث ہے۔ اس کے بعد اس نے منظوم قصے مثلاً The Bride Of Abydos (1813) The Giaour (1813) Corsair 1814 اور Lara (1814 تصنیف کئے۔ ان نظموں کی بدولت اسکاٹ Scott کے ساتھ بائرن کی دھاک بھی لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گئی۔ ان تمام نظموں میں ہمیں ہیرو

رومانی حزنیت کا پتہ چلتا ہے جو بائرن کے ساتھ مخصوص ہے "چائلڈ ہیرالڈ" کے پہلے دو حصّے دراصل احیا کی آرزو کا احساس لئے ہوئے ہیں جس میں شاعر اپنے سیاح سورما Knight کے ذریعے اپنے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ وہی داخلی میلانات ہیں جنھیں اس صدی کی بیماری Mal Du Sicle سے موسوم کیا گیا ہے۔

جس زمانہ میں بائرن اپنے منظوم قصّے لکھ رہا تھا اسی زمانہ میں اس نے کئی دلکش غنائیہ نظمیں بھی تصنیف کیں جو اگرچہ شیلی اور اسکاٹ کی غنائیہ نظموں سے مختلف ہیں مگر شاعر کے فکر و احساس کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ She Walks In Beauty اور Oh! Snatched Away In Beauty's Bloom ۔۔۔ بہت مقبول ہوئیں اور اس کا ایک شعر تو ضرب المثل ہو گیا جس میں اس نے کہا تھا کہ محبت مردوں کی زندگی کا ایک جزو ہے مگر عورتوں کی ساری زندگی ہے:

Love is of man's life a thing apart Its woman's whole existence.

۱۸۱۶ء میں یورپ کی سیاحت کے دوران میں بائرن نے "چائلڈ ہیرالڈ" کو پایۂ تکمیل کو پہونچایا یہاں فطرت کی رنگینیوں کو انسانی جدوجہد کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔ چوتھے حصہ میں اٹلی اس کے فنکار ـــــ ڈانٹے، پٹرارک، بوکیچیو، میکاولی ـــــ اور اس کے بڑے شہروں کا ذکر ہے، قدرتی مناظر اور شخصیات کے خاکوں میں کہیں کہیں شاعر نے اعتراف گناہ اور اپنی روح کے انتشار کا بھی اظہار کیا ہے Don Juan (1819-24) دراصل سنجیدہ اور دلکش، بیانیہ اور ڈرامائی، فلسفیانہ اور طنزیہ انداز بیان سے مرکب ہے۔ یورپین ممالک کی سیاحت کا ذکر بیک وقت رومانی اور طنزیہ اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ انگلستان اور اس کی معاشرتی حالت پر بائرن کے تازیانے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔

بائرن کی شاعری اس کی غنائیت، حسن پرستی، فطرت نگاری اور رومانی اُداسی کے باعث معاصرین سے ممتاز ہے ان خصوصیات کے ساتھ ہی اسکے یہاں حریت فکر کا بھی شدید جذبہ پایا جاتا ہے جس سے وہ ورڈسورتھ کی مخالفت کے باوجود اسکے نزدیک ہو جاتا ہے۔ ورڈسورتھ تو آخری زمانہ میں رجعت پسند ہو گیا تھا لیکن بائرن آخری دم

تک آزادی کا علمبردار رہا۔ اٹلی اور یونان کی سرزمین سے اسے جو والہانہ لگاؤ تھا وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس کا انتقال بھی یونان کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں ہی ہوا۔ بائرن کی شاعری کے متعلق ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ باوجود اپنی تصور پسندی اور رومانیت کے نضا کی خلاؤں میں نہیں پھرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کیٹس اور شیلی سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ اس پر فراریت اور تصوف کا الزام کبھی نہیں لگایا جاسکتا۔ کیٹس ماضی کا دلدادہ تھا۔ شیلی مستقبل کے راگ گاتا رہا مگر بائرن ہمیشہ "حال" کا شاعر رہا۔ وہ رومانی تحریک کے حریت پسند علمبرداروں میں سے تھا، اور اس کی شاعری بھی مجموعی طور پر اسی تحریک کی زندہ علامت ہے۔

شیلی (سنہ ۱۷۹۲ء سے سنہ ۱۸۲۲ء)

رومانی شاعروں میں شیلی کا مرتبہ کسی طرح بھی ورڈسورتھ اور بائرن سے کم نہیں ہے۔ وہ نہ صرف اپنے دور کے سیاسی اور معاشرتی روایات اور میلانات کا تیز شعور رکھتا تھا بلکہ اس کے اندر جبر و تشدد کے خلاف جذبۂ بغاوت بھی کارفرما تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں جمالیاتی کیفیتوں کے پردے میں عصری زندگی کے نقوش و علامات بھی واضح طور پر ملتے ہیں۔

شیلی کو تصوریت پسند رومانی شاعر کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ حال سے بیزار ہوکر اس حسین مستقبل کا خواب دیکھتا ہے جہاں افلاطون کے جمہوریہ اور ٹامس مور کے یوٹوپیا کی سرحدیں ملتی ہیں۔ چونکہ شیلی فطرتاً اپنے پیشروؤں سے زیادہ حساس واقع ہوا تھا۔ اس لئے اس کے کلام میں واقعی اور امکانی کی درمیانی خلیج کے احساس نے ایک مستقل محزونیت پیدا کردی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے قیام کے دوران میں جب اس نے "دہریت کی ضرورت" پر اپنا مقالہ لکھا تو ارباب یونیورسٹی نے اسے وہاں سے نکال دیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی نامساعد حالات کا ایک سلسلہ بن گئی جس میں گھریلو خوشی سے محرومی اور اس کی پہلی بیوی ہیریٹ Harriet کی خودکشی کو بھی کم دخل نہیں ہے۔ انھیں دنوں وہ انگریز فلسفی گاڈون Godwin کے زیر اثر آگیا تھا جس کی کتاب سیاسی عدل "Political Justice" نے اس کو بہت متاثر کیا۔ ان محرکات کی بدولت اس نے آفاقی اخوت کے تصور کی تخلیق کی جو اس کی شاعری کی روح ہے۔

شیلی کی پہلی کامیاب نظم Queen Mab سنہ ۱۸۱۳ء میں لکھی گئی جس میں

اس نے فرسودہ روایات اور سماجی و سیاسی اقدار کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس زمانہ میں شاعر کا خیال تھا کہ انسان خود شر پسند نہیں ہوتا بلکہ سماج کی تمام برائیاں سیاسی اور مذہبی عوامل کی پروردہ ہیں۔ مذہبی پیشوا ہوں یا شہنشائیت کے علمبردار سب کے سب "انسانی کلیوں کو کھلنے سے پہلے تاراج کر دیتے ہیں" ۱۸۱۸ء میں لکھی ہوئی نظم The Revolt Of Islam میں شاعر نے اپنے زمانہ کے مردم آزار سیاسی اور اخلاقی نظام کی سخت مخالفت کی ہے۔ تجربات اور تاریخ کے مطالعہ سے اس کو اس بات کا احساس ہوا کہ انسان کے اندر خود بھی شر کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور اس کا علاج "محبت" ہے۔ ان سیاسی نظموں کے علاوہ Alastor اور Adonais بھی کامیاب تخلیقات ہیں۔ "السٹور" شاعر کا پہلا مربوط کارنامہ ہے جس کا ذیلی عنوان "روح تنہائی" ہے۔ فکری شدت اور جذباتی محویت کو ایک خاص میلان کے تحت رموز و علامات کا ایسا خوبصورت جامہ پہنانا ایک بڑے فنکار کا ہی کام تھا۔ "السٹور" شیلی ہی کی طرح ایک نوجوان شاعر کی روداد ہے جو نہ اپنے کو اچھی طرح سمجھ سکا اور نہ دوسروں کو۔ یہ نوجوان شاعر بڑے معصوم اور لطیف احساسات کا مالک ہے۔ اس کا تخیل ایک رومانی پیکر پیدا کرتا ہے جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا ہے۔ کبھی کبھی خواب یا نیم خواب کی حالت میں یہ عورت اس کے پاس آجاتی ہے اور اس سے جسمانی اور روحانی دونوں لذتیں حاصل کرتا ہے لیکن عالم بیداری میں وہ نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ پھر اس کی تلاش میں چل پڑتا ہے۔ یہ تلاش مسلسل عین شباب میں اس کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوتی ہے۔ Adonais جواں مرگ رومانی شاعر کیٹس کا مرثیہ ہے جس میں شیلی کی محزونیت نے بلیغ رمزیہ انداز اختیار کر لیا ہے۔ یہاں اس نے بھری دنیا میں اپنے کو یکہ و تنہا محسوس کیا ہے اور خود کو "مٹتے ہوئے طوفان کا آخری بادل" تصور کیا ہے۔

شیلی کی شاعری کے سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ اپنی تمام غم پسندی کے باوجود وہ آرنلڈ اور ہاؤس مین کی طرح یاس پرست نہیں ہوتا۔ اس کا غم غالب کا غم ہے، فانی کا نہیں اس کے یہاں ہم کو ذاتی غم بھی کائناتی غم معلوم ہوتا ہے۔ شیلی ذاتی طور پر محزون ہی لیکن عام انسانیت کے لئے اس کا پیغام رجائی ہے۔ اس نے "شاعری کی حمایت میں" اپنے مقالہ میں

شعراء کی مصلحانہ اور پیغمبرانہ خصوصیت کا ذکر کیا ہے اور اس کا بیشتر کلام بھی اسی جذبہ کا ترجمان ہے۔ انسانیت کی کامل آزادی کا خواب اس کے غنائی ڈرامہ "پرامیتھیس بے زنجیر" Prometheus Unbound میں زیادہ واضح ہے۔ ہیرو جو انسانیت کا حامی ہے جابر خداوندی قوتوں کے ہاتھوں پا بہ زنجیر ہے اور تمام مصائب کے باوجود اپنے آئیڈیل سے دست بردار نہیں ہوتا۔ آخر کار اسے فتح نصیب ہوتی ہے اور وہ تمام انسانیت کو آزادی کی بشارت دیتا ہے۔ شیلی کی یہی بنیادی رجائیت اس کی نظم "خطاب بہ باد مغرب" Ode To The West Wind میں نمایاں ہے۔ جہاں باد مغرب کی تباہ کاریاں بالآخر موسم بہار کی خوش آیند شادابیوں کا مژدہ سناتی ہیں۔ موت اور زندگی، غم اور خوشی، تخریب اور تعمیر کے بنیادی تصورات کے ساتھ شیلی کی اشراقیت Pletonism نے بھی اس کی شاعری پر خاص اثر ڈالا ہے۔

شیلی کے کلام میں فکر و فلسفہ کے علاوہ شاعرانہ حسن بھی بدرجہ اتم ملتا ہے۔ اس کے نغمات کی دلکشی اور دلپذیری کی بنا پر اسے "مغنیٔ فرنگ" کہنا شاید مبالغہ نہ ہو۔ جذبات کی شدت اور احساسات کی صداقت سے اس کی نظمیں اپنی تمام رمزیت کے باوجود فطری معلوم ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیلی خود ایک ستار ہے جس سے بے ساختہ میٹھے سر نکلتے رہتے ہیں۔ اس کی بہترین تخلیقات وہ ہیں جہاں وہ فطرت کا ہمراز ہو کر انسان کی محرومیوں کے نغمے سناتا ہے اور پھر مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے۔ موجودہ معاشرتی اور اخلاقی نظام کے جبر و تشدد سے انسانیت کو چھڑانا اور سچی آزادی اور محبت سے اس کو آشنا کرنا شیلی کی شاعری کا اصلی اور دائمی مقصد ہے۔ اگرچہ کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تھا مگر وہ اپنے طور پر فکری و عملی جد و جہد سے الف سعادت Millenium کو اپنے زمانے میں کھینچ لانا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں وہ خود "ماورائی" ہو گیا۔ چنانچہ میتھو آرنلڈ کو شیلی کے یہاں ورڈسورتھ کی اخلاقی روحانیت اور بائرن کے مردانہ پن کا فقدان محسوس ہوا — "شیلی خلا کی وسعتوں میں ایک حسین مگر بے اثر فرشتہ کی طرح اپنا پر پھڑپھڑاتا ہے"۔ — یہ خیال ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ اس کے یہاں ورڈسورتھ کی اخلاقیت، کولرج کی رمزیت،

بائرن کی خود سرانہ انفرادیت اور کیٹس کی حسن پسندی نہیں ملتی لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ وہ اپنی جگہ ایک ممتاز اور منفرد شاعر ہے۔ اس کی معصوم رومانیت، فکری رجائیت اور شاعرانہ حسن کاری اسے تمام رومانی شاعروں میں زندہ جاوید کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ابتدا میں اس کا حلقہ، اثر ذہین افراد تک محدود تھا۔ لیکن ٹنی سن اور براؤننگ کے بعد شیلی پرستوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ یورپ میں فرانسیسی رمز نگاروں Symbolists نے اس کے کلام کا غائر مطالعہ کیا اور اسے نازک اور لطیف احساسات کا واحد ترجمان مانا۔

کیٹس (سنہ ۱۷۹۵ء سے سنہ ۱۸۲۱ء) :-

رومانی شعراء کی دوسری نسل میں کیٹس اپنی جواں مرگی اور ذاتی زندگی کی محرومیوں کے باوجود اپنے ذوقِ جمال اور صلاحیت شعری کے اعتبار سے ایک خاص مقام پر نظر آتا ہے۔ باقاعدہ تعلیم سے بہرہ یاب نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی جبلّی قوتوں کے زور سے حسن اور حقیقت دونوں کا عرفان حاصل کر لیا اور یونانی اساطیر اور قدیم فنون میں استعداد کے ذریعہ اپنی شاعری میں رنگ بھرتا رہا۔ انگریزی شاعروں میں کیٹس نے اسپنسر، چیپمین Chapman اور ملٹن سے خاص طور پر سیکھا مگر معاصرین میں وہ ورڈسورتھ کا قائل تھا اور ہنٹ کا مقلد۔ اس کے نزدیک شاعری کا مواد حیات و کائنات کے مطالعہ میں حسن و خیر کے ساتھ قبح و شر سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں محض ذہنی پرداز نہیں بلکہ بیانیہ اور ڈرامائی شاعری کے عناصر بھی گھلے ملے ہیں۔ کیٹس کی شاعری کے متعلق ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ وہ بنیادی طور پر احتساسی Sensuous ذہن و شعور کا مالک تھا اس لئے اس کی شاعری مجرد تصورات سے بہت بڑی حد تک خالی نظر آتی ہے وہ کسی نظریہ کو بغیر اس کی خصوصیات اور پیکر نگاری کے نہیں پیش کرتا۔ اس بنا پر اس کے فن میں فکر و تامل کی بجائے مشاہدہ اور مطالعہ کا زیادہ دخل ہے۔

کیٹس کی شاعری میں جذبہ و احساس کی شدت بھی ہے اور فراوانی بھی مگر اس کی احتساسیت Sensuousness شیلی کی ماورائیت Transcendentalism پر اضافہ ہے۔ اس نے زمین اور اس کی مادّی حقیقتوں اور جسمانی کیفیتوں سے کبھی تجاہل نہیں

برتا اور اس کے یہاں ہر قسم کے احساسات صورت، رنگ اور آہنگ کے روپ میں نمایاں ہیں
اپنی اسی "ارضیت" کی بنا پر کیٹس ذہنی طور پر شیلی اور بائرن کا ہمنوا ہونے کے باوجود ان سے
الگ ہے۔ بائرن اپنی تمام بائرنیت کے مسیحیت کے اثر سے بے نیاز نہیں رہ سکا۔ شیلی
اپنے کفر و الحاد کے ساتھ ایک ماورائی قوت پر ایمان رکھتا تھا لیکن کیٹس کا مذہب حسن تھا۔
اس کا خیال ہے کہ عام انسان کی طرح سچے شاعر کو دھرتی اور اسکی خوبصورتی کا راگ گانا چاہیئے:

"The Poetry Of Earth Is Never Dead"

[زمین کی شعریت لازوال ہے]

کیٹس کا یہ تصور حسن برابر ارتقا کی منزلوں سے گزرتا رہا۔ چنانچہ ابتدائی کلام میں جہاں
ہلکے قدموں، نیلی آنکھوں اور سنوارے ہوئے بالوں کے ساتھ "ساعد سیمیں" اور
"مقیاس الشباب" کا ذکر ملتا ہے وہاں رفتہ رفتہ مجاز و حقیقت کے عرفان سے شاعر
حسن کو حقیقت اور حقیقت کو حسن بھی تسلیم کرنے لگتا ہے۔

"Beauty Is Truth, Truth Beauty"

اور حسن کو "ابدی مسرت" کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اپنی مشہور نظم Hypenn میں
تو وہ حسن کو "قوت" ماننے لگتا ہے۔ اسی نظم میں کیٹس حسن اور غم کے رشتۂ ازلی کا ذکر کرتا
ہے یہاں تک کہ مذہب حسن آخر کار "مذہب غم" ہو جاتا ہے۔ درحقیقت حسن ہی وہ
محور ہے جس کے گرد کیٹس کی ساری شاعری گھومتی ہے۔ اس نے خود بھی کہا تھا کہ "تخیل
جسے حسین تصور کرلے وہ یقینی طور پر حقیقت ہے چاہے اس کا وجود ہو یا نہ ہو"

کیٹس کی حسن پرستی اور احساسیت اس کی منظر نگاری اور واقعہ نگاری میں بخوبی
ملتی ہے لیکن اس کی فطرت نگاری دوسرے رومانی شاعروں سے مختلف ہے۔ بیشتر رومانی
شعرا فطرت میں حسن، مسرت اور آہنگ کی تلاش کرتے تھے۔ ورڈسورتھ اور شیلی دونوں
فطرت کو انسان کی روح سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں لیکن کیٹس ان دونوں شاعروں کے مقابلہ
میں فطرت سے زیادہ براہ راست واسطہ رکھتا ہے۔ اس کے یہاں کھیتوں کی ہریالی،
پھولوں کی شادابی، آفتاب کی گرمی اور چاند کی نرم کرنوں سے لے کر تمام فطرت کے نگارخانے

کی مصوری ملتی ہے کیٹس کے نزدیک فطرت اور فن دونوں ہمارے لئے مسرتوں کا سرچشمہ ہیں۔ فنکار اپنے فن کی دلکشی اور دلپذیری کے لئے فطرت کا رنگ چراتا ہے اور اسے اپنے تخیل کے ذریعہ نئے سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اس لئے وہ بیک وقت انسان اور کائنات کا ترجمان ہے اور دونوں کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

نقادوں نے کیٹس کی شاعری میں ایک قسم کی جمالیاتی تناقص Aesthetic Schism کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کیٹس کے یہاں فراریت کا میلان اسی قدر اجاگر ہے جس قدر زندگی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ۔ چنانچہ وہ اگر کچھ نظموں میں زندگی کے ہنگاموں سے فرار چاہتا ہے اور فطری موسیقی یا احیائے ماضی کے تصور سے حال کی تلخیوں کو بھلانا چاہتا ہے تو دوسری طرف Sleep & Poetry جیسی نظموں میں وہ تخیل کی بھول بھلیوں سے نکل کر انسانی مساعی اور ان کے غم اور مسرت کے راگ گاتا ہے اور Endymion اور Hyperion میں ہمیں شاعر کے پیغمبرانہ منصب کا احساس دلاتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ کیٹس کے یہاں جمال و جلال کی کیفیتیں ساتھ ساتھ ملتی ہیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ اپنی تمام جمال پرستی کے باوجود ورڈسورتھ اور شیلی جیسے گرم جوش انسان دوستوں کا ہمعصر بھی تھا اور معتقد بھی۔

کیٹس کی طویل نظموں میں Endymion اور Hyperion کے علاوہ چند منظوم رومانی داستانیں بھی ہیں۔ "انڈیمین" ایک رمزیہ نظم ہے جس میں ہیرو کو محبت اور حسن کا صحیح تصور اس وقت ہو سکا جب وہ عام انسانی ہمدردی سے خود کو پوری طرح ہم آہنگ کر سکا۔ Hyperion ملٹن کی تقلید میں ایک رزمیہ کوشش ہے۔ کیٹس جنت میں جنگ کے مناظر کی عکاسی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے بہت جلد اس کا احساس ہوا کہ اس قسم کی کشمکش کو بیان کرنے کے لئے ہومر اور ورجل کا اسلوب بیان اسی قدر ناقص ہے جس قدر ملٹن کا اسلوب مصنوعی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے تمام شاعروں کو ملٹن سے خبردار کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو چیز ملٹن کے لئے عین حیات ہے وہ دوسروں کے لئے موت کا پیغام دے سکتی ہے۔

Isabella ایک رومانی داستان ہے جس میں شیکسپیر کا اثر بیحد نمایاں ہے۔ یہاں بغیر

کسی فلسفہ یا شاعرانہ پیغام کے کیٹس ایک المیہ کہانی سناتا ہے جس میں زندگی کا حسن وعرفان بھی ہے اور موت وحیات جاوداں کی تلاش بھی The Eve Of St Agnes ایک دلچسپ داستان ہے جس میں رات کے سناٹے میں عاشق ایک دائی کی مدد سے اپنی محبوبہ کے کمرہ میں گھس آتا ہے جبکہ وہ خود تصور محبوب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عبادت کے خلوص اور جذبات کی شدت سے زبان بند ہے لیکن عاشق ومعشوق دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ خاندانی عناد اب تک ان کی راہ میں حائل تھا لیکن وہ آخرکار ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور عاشق اپنی شہزادی کو قلعہ سے لے اڑتا ہے۔ اس نظم کی بیانیہ قوت، رومانی تخیل اور احساسی کیفیتوں کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے۔ انھیں نظموں کی شعریت سے متاثر ہوکر سینٹسبری Saintsbury جیسے نقاد نے کہا تھا کہ کیٹس نے ٹنی سن کو جنم دیا اور ٹنی سن نے بعد کے تمام دوسرے شاعروں کو پیدا کیا۔

۱۸۱۹ء کے بعد کا دور کیٹس کی شاعرانہ زندگی کا عہد شباب ہے جس میں اس نے اپنی پانچ مشہور خطابیہ نظمیں Odes لکھیں جو رومانی شاعری کی غیرفانی تخلیقات مانی گئی ہیں۔ Ode To Autumn فنی لحاظ سے بہترین نظم قرار پائی ہے۔ یہاں شاعر نے موسم کے ساتھ انسان کی کاروباری زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے Ode to the Grecian Urn میں کیٹس کی یونان پرستی Hellinism بخوبی واضح ہے یہاں اس نے فن کو انسانی زندگی سے بلندتر بتایا ہے اور حسن اور فن کے باہمی رشتہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ Ode To A Nightingale نہ صرف کیٹس بلکہ تمام رومانی شاعری میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں اس کی تمام فنی خصوصیات سمٹ آئی ہیں اور اس کی شاعری معراج کمال کو پہونچی معلوم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شاعر مسکرات میں اپنے دکھ درد بھلانے کی کوشش کرتا ہے لیکن زندگی کی محرومیوں اور غمناکیوں کا احساس کسی طرح ہلکا نہیں ہونے پاتا۔ آخرکار وہ بلبل کے ترانوں میں خود کو محو کر لینا چاہتا ہے۔ نجات کی دوسری صورت ممکن نہیں۔

ابتدا میں کیٹس کی شاعری پر کلاسیکی مزاج کے نقادوں نے سخت تنقید کی کیونکہ اس کے

یہاں جذبہ اور احساس میں اعتدال کی کمی تھی اور اس کا تخیل اکثر توازن کھو بیٹھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کی شاعری کی رمزیت بلیغ تر ہوتی گئی اور حسن کا احساس انسانی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا گیا۔

نیم رومانی شعرا :۔

کولرج اور شیلی کے معاصرین کی دوسری صف میں چند شعرا ایسے بھی ہیں جن کے یہاں اگرچہ تخیل اور فکر و فن کی اعلیٰ کارفرمائیاں نہیں لیکن ان کا تاریخی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے ان کے یہاں نہ صرف یہ کہ کلاسیکیت کا رنگ نمایاں ہے بلکہ ان کی شاعری سے بعد کی نسلوں نے رومانی تحریک سے انحراف میں بھی مدد لی۔ کلاسیکی عناصر کے ساتھ ان کی شاعری میں اعتدال کے نئے معیار کی تلاش بھی نمایاں ہے جو زندگی اور فن کے درمیان مفاہمت پیدا کر سکے۔

(۱) سیموئل راجرس (۱۷۶۳ء سے ۱۸۵۵ء) :۔

نیم رومانی شاعروں میں راجرس کا شمار احیائے ماضی کے سلسلہ میں ہوتا ہے لیکن اس یہاں روایت کی گہری چھاپ کے ساتھ ایک قسم کی گھلاوٹ اور مٹھاس بھی ہے درحقیقت وہ اس مدرسہ شاعری کا نمائندہ ہے جس میں قدما کی تقلید کے ساتھ ادب میں جدت آفرینی کو بھی راہ ملتی ہے "یاد کی خوشیاں" The Pleasures Of Memory خالص واعظانہ انداز میں لکھی گئی ہے اس لئے اس میں سوائے مجرد خیالات کے تخلیقی شاعری کی پرچھائیاں کم ملتی ہیں البتہ اس کی نظم "اطالیہ" جس میں اگرچہ کلاسیکی شاعری اور بائرن کا تقلیدی رنگ جھلکتا ہے اپنی مخصوص نوعیت سے منفرد ہے کہیں کہیں کردار اور واقعات کافی اثر انگیز معلوم ہوتے ہیں یہاں راجرس کی خورد نگاری بھی قابل لحاظ ہے۔

۲ طامس مور (۱۷۷۹ء سے ۱۸۵۲ء) :۔

مور کی شہرت رومانی دور میں اسکاٹ اور بائرن سے کم نہیں تھی مگر جیوں جیوں زمانہ گزرتا گیا اس کی قدر گھٹتی گئی اور اس کا اثر بھی کم ہوتا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ نئے ادبی مذاق اور اس کے تقاضوں کی رُو سے اس کی شاعری کچھ فرسودہ معلوم ہوتی ہے لیکن آج بھی خاص شاعرانہ مزاج

رکھنے والوں کے لئے اس کی دلکشی باقی ہے جس کا مدار اس کے جدت اسلوب اور الفاظ کے آہنگ پر ہے۔

مور دراصل ایک خاص طبقہ کا شاعر ہے جس سے اس کے یہاں تصنع اور تکلف لازمی طور پر نمایاں ہے لیکن ان خامیوں کے باوجود اس کے "آئرستانی نغموں" Irish Melodies میں ایک قسم کی تازگی اور رمزیت پائی جاتی ہے۔ ان نظموں میں آئرلینڈ کا تخیل اور روح دونوں سموئے گئے ہیں اور پس منظر کی دلفریبی قومی زندگی کی محرومیوں سے ہم آہنگ ہو گئی ہے۔ "لالہ رخ" Lalla Rookh مور کی شاہکار نظم ہے جس سے شاعروں کی ایک پوری نسل متاثر ہوئی اور جو آج بھی اپنی مخصوص کیفیتوں کے باعث منفرد ہے۔ نظم کی تخلیق اور مشرقی فضا پیدا کرنے میں بیک فورڈ۔ بائرن، اور سدے کے اثرات واضح ہیں۔ "لالہ رخ" ایک رومانی سلسلہ ہے جسمیں تخیل کی پرواز اور جمالیاتی رنگ کے اظہار کا شاعر کو پورا موقع ملا ہے۔ پوری نظم اگرچہ رومانی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن اکثر مقامات پر زندگی اور زندہ دلی کی وہ کیفیتیں ملتی ہیں جو تخلیقی مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔

(۳) لے ہنٹ ۱۷۸۴ء سے ۱۸۵۹ء

رومانی دور کے شاعروں کی دوسری صف میں ہنٹ بڑی موثر شخصیت کا مالک ہے۔ وہ مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتا رہا لیکن کسی خاص رنگ کو نہ پا سکا۔ اس کی انقلابیت نے اعتدال پسندی کی آغوش میں پرورش پائی اسی لئے وہ اپنی نصابیت کے باوجود ایک وسیع المشرب تصوریت کا حامل رہا۔ اس کے سیاسی، سماجی اور مذہبی خیالات اس کی انسان دوستی کی دلیل ہیں جن کے ذریعہ وہ سماج اور معاشرۃ میں اعتدال پیدا کرنا چاہتا تھا۔

ہنٹ کی رومانیت بھی سطحی ہے۔ جوانی میں اس کے یہاں ایک قسم کی بے قراری اور روح کی ایک بے چینی ضرور تھی مگر بہت جلد اس نے اخلاقی صحت اور اعتدال حاصل کر لیا۔ اس کی منظر نگاری میں وہ کیفیت اور دلآویزی نہیں جو ورڈسورتھ اور دوسرے رومانی شاعروں کا خاصہ ہے لیکن انگلستان کے دیہاتی مناظر کی عکاسی میں اسے خاص ملکہ حاصل ہے۔ ہنٹ اپنی زندگی اور شاعری میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ نہیں بھولتا کہ وہ دین مسیحی کا پیرو ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ اس کی فطرت نگاری کبھی فطرت پرستی کی حد تک نہیں پہونچتی۔ "رمنی کی کہانی" Story of Rimini اس کی مشہور تصنیف مانی گئی ہے۔

(۴) لینڈر (۱۷۷۵ء سے ۱۸۶۴ء) :-

اپنے ہمعصر ادیب ہزلٹ Hazlitt کی طرح لینڈر بھی اپنے زمانہ کی ہنگامہ آرائیوں سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ اس نے بڑی عمر پائی اور مائل بہ زوال کلاسیکیت اور پُرشباب رومانیت سے گزرتا ہوا وکٹوریہ کے عہد تک زندہ رہا۔ اگرچہ اس نے سیاسی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا ہے لیکن وہ رومانی شعرا کی دوسری نسل سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے یہاں بھی انسانیت سے وہی ہمدردی موجود ہے جو شیلی اور کیٹس کی شاعری کا خاصہ ہے۔

لینڈر کو کلاسیکی کہہ دینا آسان ہے لیکن اس کے یہاں رومانیت کی رگ بھی بہت زندہ ہے اور بڑی قوت کے ساتھ کام کرتی محسوس ہوتی ہے۔ جب وہ تخیل کی آزاد پرواز کو کلاسیکی ضابطوں سے روکنا چاہتا ہے اس وقت بھی اس کے یہاں احساس اور جذبہ کی شدت نمایاں رہتی ہے۔ لینڈر کی نظر ماضی سے زیادہ مستقبل کی طرف لگی ہوئی تھی لیکن اسے خود اس کا احساس نہیں تھا۔ اس کے یہاں مختلف عناصر کچھ اس طرح گھلے ملے تھے جن سے آئندہ براؤننگ اور آرنلڈ نے اپنی شاعری میں استفادہ کیا۔ کلاسیکیت کے اثر سے اگرچہ لینڈر کسی خاص نصب العین کا مقلد نہیں ہو سکا لیکن اس نے قدما کے فن کو از سر نو زندہ کرنے میں بڑی کوشش کی۔ مختصر یہ ہے کہ لینڈر کی کلاسیکیت کتابی نہیں بلکہ فطری ہے۔

لینڈر کی ابتدائی کوششوں میں پوپ کی چند نظموں کی منظوم تشریح اور ان پر تبصرہ قابل ذکر ہے لیکن اس کی اصلی شہرت Gebir کی بدولت ہوئی جو ورڈسورتھ کے مجموعۂ کلام کے ساتھ ۱۷۹۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم بھی پوپ اور دوسرے کلاسیکی شاعروں کی طرح رزمیہ اسلوب میں منظوم تاریخ ہے لیکن اس کی ڈرامائی کیفیت قابل لحاظ ہے۔ اس نظم کے بعد لینڈر نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی جس میں غنائیہ، ڈرامے اور چھوٹی نظمیں شامل ہیں۔

لینڈر کی اصلی شہرت اس کے "خیالی مکالمات" Imaginary Conversations

کی بنا پر ہے جو ۱۸۲۴ء سے ۱۸۲۹ء کے درمیان یونانی اور لاطینی ادیبوں کی طرز میں لکھے گئے۔ یہ دراصل ڈیڑھ سو کے قریب مکالموں پر مشتمل عجیب و غریب کارنامہ ہے جس میں شاعر کے فلسفیانہ، مذہبی، تاریخی، معاشرتی اور سیاسی خیالات بغیر کسی ضابطہ اور ترتیب کے پیش کئے گئے ہیں۔ انگریزی ادب میں ان مکالموں کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ عہد وکٹوریہ کے مشہور شاعر براؤننگ Browning کو اپنے منظوم خود کلامیوں کے لئے یہیں سے تحریک ہوئی۔

رومانی نثر:-

رومانی تحریک سے جہاں انگریزی شاعری نے فکر و فن میں رفعتیں حاصل کیں وہاں انگریزی نثر نے بھی کچھ کم ترقی نہیں کی۔ ادیبوں اور شاعروں کی انفرادیت جس طرح اس دور میں ابھر سکی وہ شاید کسی دوسرے زمانہ میں ممکن نہ تھا۔ لیمب، ہزلٹ اور ڈی کوئنسی جیسے صاحب طرز نثر نگاروں نے اگر ایک طرف ادب میں اپنے لئے اہم مقام پیدا کیا تو دوسری طرف انگریزی نثر میں ایسے نمونے بھی پیش کئے جو ذاتی زندگی کی تفسیر بھی ہیں اور انسان دوست ادب کی تکمیل بھی۔ جذبہ و احساس کی فراوانی، خیالات کی بلندی اور نثر میں شاعری کی جو مثالیں ان ادیبوں کے یہاں ملتی ہیں ان کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

چارلس لیمب (۱۷۷۵ء سے ۱۸۳۴ء)

رومانی انشاپردازوں میں لیمب ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ اس کے معاصرین میں نہ تو کسی سے اس کو کوئی چشمک ہوئی اور نہ کسی نے اس سے انکار کیا۔ نقادوں نے بجا طور پر اسے "انشاپردازوں کا شاہزادہ" کہا ہے۔ درحقیقت لیمب کا فن اسی اجمال کی تفصیل ہے بیکن اور براؤن سے لے کر رسکن اور پیٹر اور آسکر وائلڈ تک انگریزی نثر میں ہم نت نئی تاثیر پاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے نثر کو سحر حلال بنا دیا ہے لیکن لیمب کا انداز بیان اور تاثیر زبان سے منفرد ہے۔ اس کے یہاں ایک قسم کا شاعرانہ حزن اور پرگداز بصیرت ملتی ہے۔ جو بیک وقت اس کے نظریۂ حیات اور شخصی زندگی کا نتیجہ ہے۔

لیمب کا فن انشائیہ کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے" ایلیا کے مضامین" Essays Of Elia

میں لکھنے والے کی شخصیت ہم کو ہر جگہ روشن نظر آتی ہے۔ لیمب بلیغ فلسفیانہ یا سیاسی معاملات میں الجھنے کے بجائے ذاتی تجربوں، یادوں، نجی پسند و ناپسند سے ہی اپنے فن کا تانا بانا تیار کرتا ہے۔ اس کے مضامین سے اس کی ملازمت، اس کے ادبی مشاغل اور اس کے اعزا اور اقارب، غرضکہ اس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر خاطر خواہ مواد فراہم کیا جاسکتا ہے۔ لیمب نے کبھی ازدواجی زندگی نہیں بسر کی لیکن اس کی ساری زندگی ایثار اور خلوص کی بہترین مثال ہے۔ اپنی بہن میری کی دیوانگی سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ ماں کی موت کے بعد بھی وہ برگشتہ خاطر نہ ہوا اور اپنی تمام زندگی بہن کے لئے وقف کر دی۔

لیمب کا شمار داخلی انشاپردازوں میں کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نامساعد حالات نے اسے نئے ادب کے تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ کر دیا۔ ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود اس کا مطمح نظر کبھی قنوطی نہیں ہوسکا۔ وہ اپنے متعلق باتیں کرتے ہوئے بھی کبھی انانیت کا شکار نہیں ہوتا اور نہ اس کے یہاں کسی نفسیاتی بیماری کا ہی شائبہ نظر آتا ہے۔ تمام اصناف ادب میں انشائیہ ہی لیمب کا بہترین ذریعۂ اظہار ہے۔ وہ کسی خاص مدرسہ کا مقلد نہیں بلکہ اپنے مخصوص طرز کا موجد اور خاتم ہے۔ اس کے یہاں نہ اخلاق پر طویل تبصرے ہیں اور نہ نفسیاتی تجزیے۔ وہ شروع سے آخر تک ایک فنکار ہے جس کا مقصد اپنے پڑھنے والوں کے لئے مسرت کا سامان مہیا کرنا اور ان کے اندر زندگی کی بصیرت پیدا کرنا ہے۔

لیمب کے مضامین میں مزاح کا ایسا لطیف عنصر ملتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کے مزاح میں دردمندی اور دلسوزی بھی داخل ہے جس کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے مضامین پڑھ کر ہم اپنے اندر ایک گدگدی محسوس کرتے ہیں اور مسکرا بھی دیتے ہیں لیکن اس مسکراہٹ کی تہ میں اشک آلودگی بھی ہوتی ہے۔ اس کا مزاح دراصل اس کی بدنصیبیوں پر فتح ہے۔ "خواب زادے" Dream Children جیسے مضمون میں جہاں لیمب نے فرضی بچوں سے ازدواجی زندگی کا افسانوی خاکہ تیار کیا ہے۔ ہاں اس کی بے پناہ قوت تخیل نے اس میں حسین رنگ بھی بھرے ہیں۔ پڑھنے والوں کو اس التباس کا فوراً علم ہو جاتا ہے جب لیمب اپنی کرسی سے ان سایوں کو فضا کی وسعتوں میں غائب ہوتے دیکھتا رہ جاتا ہے۔

لیمب اگرچہ "فن برائے فن" کا مجتہد نہیں مگر اس کے انداز بیان میں انشائیہ کا ایک نیا اسلوب ملتا ہے۔ اس کے یہاں جو سلیقہ اور دلپذیری پائی جاتی ہے وہ دراصل اس کی زندگی اور اس کے نظریۂ فن کا مشترک عنصر ہے۔

ولیم ہزلٹ (۱۷۷۸ء سے ۱۸۳۰ء) :-

لیمب کے حلقۂ احباب میں ہزلٹ ایک مخصوص اور ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ داخلی طور پر وہ نہ صرف تمام دنیا سے باغیانہ رجحان رکھتا تھا بلکہ اپنی بڑھی ہوئی ذہانت کے زور میں تمام مروجہ مفروضات اور مسلمہ اقدار سے ناآسودہ اور بدظن بھی تھا لیکن اس کے باوجود وہ کبھی بے اعتدالی کا شکار نہیں ہوتا۔ ہزلٹ کا نظریہ بنیادی طور پر ناقدانہ ہے۔ اس کے یہاں مذہبی مخالفت کا میلان بھی ہے جو فرانسیسی بغاوت اور عقلی فلسفہ کے آغوش میں پرورش پاتا رہا۔ مگر اس عقلیت کے ساتھ ہی ہزلٹ کا ذہن رومانیت کے بہترین عناصر سے بھی مانوس ہے سوائے خشک فلسفیانہ مباحث اور جدید کلاسیکی مدرسہ کی نصابیت سے چڑھ ہے۔ اس لئے ہم اس کے یہاں داخلی زندگی کا عرفان اور ایک کائناتی بصیرت پاتے ہیں۔

دراصل ہزلٹ کا شمار بحیثیت ایک ناقد حیات کے کرنا زیادہ مناسب ہے اس لئے کہ اس کے یہاں ایک قسم کی دروں بینی اور توانائی ملتی ہے جو فن اور ادب سے اس کے پرخلوص لگاؤ کی دلیل ہے۔ اس کی معرکۃ الآرا تصنیف **Liber Amoris** ان کتابوں میں سے ہے جو رومانیت کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ یہاں ہمیں جذباتی التباس کا عکس بھی ملتا ہے اور بیدار حقیقت نگاری بھی لیکن اس مختصر رومان میں دردناک جذباتیت بھی غالب آگئی ہے۔ یہاں ہم ہزلٹ کو ایک واعظ سے زیادہ ایک مفکر اور صاحب نظر پاتے ہیں۔ اس کا یہ نقطۂ نظر خود ایک جواں مرد اور باہمت فنکار کے روح کی پیداوار ہے۔

ہزلٹ کی تاثریت فرانسیسی نقاد سنت بو **St. Beauve** سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے کہ اس کے یہاں بھی نفاست اور نزاکت سے زیادہ فطری توانائی موجود ہے وہ روح کی گہرائیوں میں اس طرح اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے زمانہ حال کے ماہرین نفسیات اپنے مطالعوں میں کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ ہزلٹ کے یہاں کچھ کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ تمام

فنکاروں کو یکساں رواداری اور فراخ دلی سے نہیں دیکھتا مگر مجموعی طور پر اس کے خیالات میں جامعیت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے۔ اس نے نشاۃ الثانیہ کے ادب اور شکسپیئر کی تنقید کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ کسی دور میں بھی یادگار رہے گا۔ وہ دور بحالی کے بدنام طربیہ نگاروں کے علاوہ پوپ کے جدید کلاسیکی مدرسہ کو بھی ماضی کی موثر قوتوں میں شمار کرتا ہے۔ اس طرح وہ روایت کے آئینہ میں مستقبل کو تمام خدوخال کے ساتھ آراستہ دیکھتا ہے۔

بحیثیت ایک انشاپرداز کے بھی ہزلٹ کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کے مضامین کی جدت اور تازگی آج بھی انگریزی ادب کا سرمایہ ہے "سفر" On Going A Journey "مداری" Indian Juggler اور "علماء کی جہالت پر" On The Ignorance of The Learned سے اس کی قدر متعین کی جاسکتی ہے۔

"ڈی کونسی" ۱۷۸۵ء سے ۱۸۵۹ء :-

ڈی کونسی کی ابتدائی زندگی بڑی پرکیف گزری۔ اسکول سے بھاگ کر وہ مہینوں لندن میں رہا مگر آخرکار رومانی شاعروں کی پہلی نسل سے قریب ہوتا گیا۔ شاید کولرج کے اثر سے اس نے افیون کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کی ناہمواریاں اس کے ذہنی انتشار کا پتہ دیتی ہیں مگر اس کے باوجود اس کے یہاں ایک واضح تصور حیات ملتا ہے جو رومانیت کی دین ہے۔

ڈی کونسی کی ادبی شخصیت ایک دبی ہوئی رومانیت کی مظہر ہے جو شاید نفسیاتی ثنویت کا نتیجہ ہے۔ اس کی تصنیفوں میں "بھنگڑی کا اقبال" Cofessions of An Opium-Eater اور "رومانی شاعروں کی یادداشتیں" بہت مشہور ہیں۔ Confessions یوں تو مصنف کی نجی زندگی کے حالات واسباب اور ذہنی واردات کا مجموعہ ہے لیکن اس میں زندگی، ادب اور فلسفہ کے بہت سے پیچیدہ مسائل بھی حل کئے گئے ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے تاثرات وخیالات کو شعر کا جامہ نہیں پہنا سکا لیکن ان کو ڈرامائی اور تخیلی انداز عطا کرنے میں اسے بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ یہ امر واقعی قابل غور ہے کہ اگرچہ ڈی کونسی، ورڈسورتھ وغیرہ سے نزدیک تھا لیکن اس کے یہاں دوسری نسل کے شاعروں کا کرب واضطراب ہے۔ "رومانی شاعروں کی یادداشتیں" ایک صاحب نظر کی ڈائری معلوم ہوتی ہے جس میں مصنف نے پہلی نسل کے رومانی شاعروں پر ہمدردی اور دوستی کے

جذبہ کے ساتھ رائیں دی ہیں۔ یہاں صداقت کا جذبہ بھی ہے اور مبہم سا اختلاف بھی۔ مگر اس کے باوجود یہ تصنیف خالص رومانی اور نفسیاتی انداز میں ایک کامیاب کوشش کہی جاسکتی ہے۔

رومانی ناول

سر والٹر اسکاٹ (۱۷۷۱ء سے ۱۸۳۲ء)

اسکاٹ کی شاعری رومانی شعراء کی پہلی نسل سے متعلق ہے لیکن ناول میں وہ رومانیوں کی دوسری نسل کا ہمعصر ہے۔ اس دور کی شاعری نے ڈرامہ اور دوسرے اصناف کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس کمی کی اسکاٹ کے ناولوں سے پوری ہوئی۔ ان ناولوں کی مقبولیت اور شہرت آج بھی مسلّم ہے لیکن جدید نقادوں کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔ مشہور ناول نگار فارسٹر Forster نے اسکاٹ کے متعلق کہا ہے کہ "وہ سطحی ذہن رکھتا تھا۔ اسے تخلیق سے کوئی خاص واسطہ نہیں تھا اس لئے کہ اس کے یہاں نہ تو فنکارانہ جارحیت ہے اور نہ جذبہ کی شدت" فارسٹر نے جدید دبستان کا ایک نقطہ نظر پیش کیا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ انگریزی رومانی ادیبوں میں بائرن کے بعد اگر کسی کو سارے یورپ میں قبول کیا گیا تو وہ اسکاٹ ہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکاٹ نے خالص فطری انداز میں لکھنا شروع کیا اور اپنے ناولوں میں اسکاٹ لینڈ کی تاریخ کو تخئیلی طور پر پیش کرتا رہا۔ اگرچہ وہ خود صحیح معنوں میں مورخ نہیں کہا جاسکتا لیکن اس نے تاریخ نگاری کی نئی سمتیں متعین کیں۔ ہارڈی کی طرح وہ بھی علاقائی ناولوں کا خالق ہے اور اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فرانسیسی ناول نگار بالزاک Belzac نے اپنے "طربیہ انسانی" کے لئے اسکاٹ ہی کو نمونہ بنایا۔

اسکاٹ اپنے ناولوں میں اسکاٹ لینڈ کے ماضی کو افسانوی حقیقت بنا کر پیش کرتا ہے اور اگرچہ وہ اس زمانہ کی فضا پیدا کرنے میں ممتاز طور پر کامیاب ہے لیکن اس کے یہاں اس فنی شعور کی کمی ہے جو جین آسٹن کے یہاں موجود ہے۔ ناول میں جدید ذہن حیات و کائنات کے رموز و مسائل پر جیسی سلجھی ہوئی اور بصیرت افروز تنقید چاہتا ہے۔ اس کا اسکاٹ کے یہاں کہیں پتہ نہیں۔ وہ تاریخی جزئیات میں پڑ کر اکثر فن کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کے قصوں میں ایک خاص احتسابی

کیفیت ملتی ہے مگر وہ جدید ذہن کو آسودہ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے اسکاٹ کا فن ناول نگاری سے زیادہ داستان سرائی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اسکاٹ کا اسلوب ایک حد تک کاوش اور آورد کا احساس دلاتا ہے لیکن اس کی چند خوبیاں ایسی ہیں جو جدید ناول کے حصہ میں نہیں آسکیں۔ اس کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت ترتیب اجزا کی سادگی ہے۔ اسکاٹ ہمیں ماضی میں لے جاتا ہے۔ اور قوت تخیل سے ایسے کرداروں کو پیش کرتا ہے جو ہمارے سامنے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے ناول روایتی انداز میں زندگی کی بہترین ترجمانی ہے جس میں مصنف کی فطری صلاحیتوں کے علاوہ رومانی تحریک کا بھی بڑا حصہ ہے۔

اسکاٹ کے ناول موضوع کے لحاظ سے کئی حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ عام طور پر فنکار جب اپنی عصری زندگی سے ہٹ کر ماضی کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے قدم اڑکھڑانے لگتے ہیں۔ اسلئے کہ اسے ماضی کی تشریح حال کی زبان میں کرنی پڑتی ہے۔ اسکاٹ اپنے لئے جو تاریخی عہد منتخب کرتا ہے وہ ماضی قریب یعنی انگلستان میں مذہبی اصلاح Reformation سے لیکر اٹھارھویں صدی کی خانہ جنگی تک محدود ہے۔ وہ اپنے موضوعات کا انتخاب ان مذہبی اور سیاسی کشمکشوں کی روشنی میں کرتا ہے جن سے پچھلے دو سو سالوں میں اسکاٹ لینڈ کی اخلاقی زندگی پر اثر پڑا تھا۔ اسی لئے ہمیں اسکاٹ کے یہاں اس زمانہ کی بازگشت ملتی ہے جن پر رومانیت کا گہرا عکس بھی ہے انگلستان اور یورپ سے متعلق ناولوں مثلاً Ivanhoe اور Quentin Durward میں مصنف نے تخیلی طور پر تاریخی نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ مشہور روسی ناول نگار طالستائے Tolstoy کی طرح وہ بھی ایک بڑے کینوس پر اپنے تخیل سے رنگ بھرتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکاٹ اپنی تمام رومانیت کے باوجود کوئی رزمیہ لکھ رہا ہے اور اس کے مختلف ناول اس رزمیہ کے باب ہیں Rob Roy اور Heart of Midlothian کے مطالعہ سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بالزاک اور طالستائے نے اس سے کس قدر استفادہ کیا ہوگا اسکاٹ جنسی یا رومانی محبت کی ترجمانی میں اتنا کامیاب نہیں ہوتا جتنا کلاسیکی ذہن کی نمائندگی میں۔ غالباً اسی میلان کے باعث وہ بھی فیلڈنگ اور جین آسٹن کی طرح زندگی میں اثباتی نقطہ نظر کا قائل ہے اور اسے قبول بھی کرتا ہے۔

اسکاٹ کی جملہ خصوصیات میں اس کی کردار نگاری سب سے زیادہ اہم ہے شیکسپیئر اور ڈکنس کے درمیان اگر کسی نے ایسے متنوع اور رنگا رنگ کرداروں کی تخلیق کی ہے تو وہ اسکاٹ ہی ہے۔ اس کے یہاں کردار نگاری کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ ان کرداروں میں پورے پیکر بھی ہیں اور انگشتی تصویریں Thumb-Nail Sketches بھی۔ جب وہ تجزیہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو کرداروں کے داخلی محرکات بھی کسی حد تک ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اسکاٹ جدید معنوں میں نفسیاتی تجزیہ کا ماہر نہیں - وہ روح اور تحت الشعور میں اترنے کے بجائے خارجی ماحول میں کرداروں کے حرکات وسکنات کو پیش کرتا ہے۔ اس کے سب سے دلچسپ کردار وہی لوگ ہیں جن سے کبھی چاسر نے اپنا نگار خانہ سجایا تھا۔ اسکاٹ لینڈ کی چند اہم ہستیوں کے باوجود اس کے ناولوں میں کسانوں، دوکانداروں، نوکروں، خادماؤں اور ایسے ہی لوگوں کی اکثریت ہے جن سے ان ناولوں نے زندگی پائی ہے۔ چاسر کی طرح اسکاٹ بھی عوامی زندگی کا ترجمان ہے اور زندگی کا حدی خواں بھی اس کے تمام ناولوں میں یہی رنگ نمایاں ہے جس سے وہ منفرد ہیں۔

اسکاٹ کے ناول رومانی تحریک کی اس خاصیت کے آئینہ دار ہیں جو احیائے ماضی سے متعلق ہے اور جن میں زندگی کی تفسیر سے زیادہ تخیل پائی جاتی ہے۔ ان ناولوں میں ڈرامائی عناصر کے ساتھ رومانیت کے چند رجحانات کی بھی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کی تصنیف Bride of Lamermoor اس لحاظ سے بہت کامیاب تخلیق ہے۔ رومانیت یا کم سے کم خارجی رومانیت کو زندگی سے قریب کر دینے میں اسکاٹ کا بڑا حصہ ہے۔ اس نے رومانیت کو اوسط حیثیت دی اور اسے عام لوگوں سے بہت قریب رکھا۔ اسکاٹ کی تصانیف میں وہی ناول شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو اسکاٹ لینڈ کی زندگی اور اس کی گزشتہ تاریخ سے متاثر ہو کر لکھے گئے۔
Rob Roy کے علاوہ Old Morality اور The Heart of Midlothian اس قسم کی کامیاب کوششیں ہیں۔

اگرچہ اسکاٹ کا اثر انگریزی ناول پر کچھ زیادہ نہیں رہا لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ اس سے یورپ کے ناول نگار بہت بڑی حد تک متاثر ہوتے رہے۔ بالزاک کی "طربیۂ انسانی" اسٹنڈہل کی "سرخ وسیاہ" اور طالستائے کی "جنگ اور صلح" میں اسکاٹ کے فن کا گہرا پرتو ہے۔

باب ششم

"عہد وکٹوریہ"

سنہ ۱۸۳۲ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک

مزاج اور میلانات کے اعتبار سے ٹنی سن کی شاعری وکٹوریہ کے دور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ٹنی سن کا دور اور ملکہ وکٹوریہ کا دور تاریخی لحاظ سے ایک ہے۔ وکٹوریہ سنہ ۱۸۳۷ء میں تخت پر بیٹھی اور سنہ ۱۹۰۰ء تک زندہ رہی لیکن اس کی حکومت کے پچاس سالہ جُبلی سنہ ۱۸۸۷ء تک اس دور کے تمام امتیازی میلات اور خصوصیات بروئے کار آ کر اپنے مقدر کی تکمیل کر کے ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے عہد وکٹوریہ کے ادب کا مدیں دو عدد اصل یہی پچاس سال ہیں جن کے دوران میں انگریزی ادب نے ترقی کی کئی منزلیں طے کیں۔

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی انگریزی ادب میں ایک سنگ میل ہے جہاں پہونچکر رومانی قوتیں تھک سی گئیں اور ان میں آگے بڑھنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔ عہد وکٹوریہ میں پڑھنے والوں کے مزاج اور میلانات رومانی دور کی پبلک سے کافی مختلف تھے اسی لئے انکے نزدیک ورڈسورتھ، بائرن اور شیلی کی شاعری اپنی خواب ناکی اور تخیل کے ساتھ غلو کے باعث اپنی اہمیت کھوتی جارہی تھی۔ اس طرح وکٹوریہ کے زمانہ میں ایک طرح کی نفسیاتی تحریک زور پکڑتی گئی جس کے مقاصد رومانیت سے مختلف تھے۔ جذبات نگاری، ماورائیت اور

روحانی تصوریت کے مبہم رومانی موضوعات روزمرہ زندگی کی تلخ حقیقت پسندی کے لیے جگہ چھوڑنے لگے یہاں تک کہ ادب میں پھر حقیقت نگاری نے نیا روپ اختیار کیا۔ اس دور کی پیچیدگیوں اور مختلف محرکات کے باعث اس کا تفصیلی جائزہ آسان نہیں لیکن چند عناصر اور خصوصیات بہت واضح اور نمایاں ہیں۔ یہ اثرات سماج اور سیاسیات میں جمہوری ترقی اور سائنس کی روز افزوں ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

فرانس میں انقلاب کے بعد رجعتی ردعمل یورپ میں اپنی سکت کھو چکا تھا لیکن انگلستان میں سیاسی الجھن باقی تھی۔ اگرچہ ۱۸۳۲ء کی اصلاحات نے خواص کے طبقہ سے اختیارات چھین کر عوام کے ہاتھوں میں دے دیے تھے مگر اس سے ایک طبقہ نا آسودہ تھا اور اسکی اختلافی تحریکیں عرصہ تک جاری رہیں۔ ان کشمکشوں کے باوجود انگریز عوام سیاسی استحکام چاہتے تھے تاکہ فرانس کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہو جانے پر ملک کی تمام ترقوتیں سیاسی اور معاشی اصلاح و ترقی کے لئے وقف ہو گئیں۔ رومانی دور میں تخئیلی "تصور آزادی" اور فرد کی اہمیت کے ساتھ اخلاقی اور مذہبی عقائد کو دھکے لگے تھے لیکن اب رفتہ رفتہ اخلاقی قدروں کی حمایت بھی شروع ہوئی جس میں خود ملکہ کی شخصیت کو بھی دخل ہے۔ جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ عام تعلیم کی توسیع اور ترقی سے عوام میں سیاسی حقوق کا نیا احساس پیدا ہونے لگا۔ سماج میں ان بنیادی تبدیلیوں کا عکس عصری ادب پر لازمی طور پر پڑا۔ چنانچہ عہد وکٹوریہ کا ادب معاشرتی میلانات و مطالبات اور ان کی عملی تکمیل کا ایک خوش آہنگ نمونہ ہے۔ اس ادب میں ماورائیت کی جگہ عام انسانی لے سنائی دیتی ہے اور اس دور کے ادیب اور شاعر پھر سے مرد عورتوں کے تعلقات اور سیاسی و سماجی مسائل سے دلچسپی لیتے ہیں۔

جمہوریت کی ترقی کے ساتھ ساتھ عہد وکٹوریہ میں سائنس نے بھی بڑی ترقی کی جو پہلے کی صدیوں میں شاید ممکن نہ تھی۔ نئی ایجادوں سے صنعت و حرفت کے نئے راستے کھلنے لگے اور تجارت میں برطانیہ عظمیٰ دنیا کی سب سے زیادہ متمول طاقت سمجھا جانے لگا۔ اس صنعتی اور تجارتی رجحان نے ملک میں عملی خیالات اور اثباتی نظریہ اور افادی طریقۂ کار کی اہمیت کا احساس عام کیا۔ سولھویں صدی سے سائنس پر اعلیٰ طبقہ کا اقتدار تھا لیکن اب اسے عوام کا بھی حصہ سمجھا

جانے لگا۔ سائنس کے ساتھ فکر کے میدان میں بھی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ڈاروِن، واکیس اور ہربرٹ اسپنر کے خیالات و افکار نے عہد وکٹوریہ کے انگلستان میں فطرت، انسان اور سماج کے متعلق تمام مروجہ اقدار کو الٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ فکر اور تخیل میں یہ تبدیلیاں جن سے پرانی قدروں کی جگہ نئی قدریں راہ پانے لگی تھیں، دراصل ہمہ جہتی مادی ترقی اور عام تعلیم کی توسیع کا نتیجہ تھیں۔ ایک حد تک یہ سارا دور ہی تنقید اور تفتیش کا دور ہی کہا جاسکتا ہے جس کی خاص علامت مذہبی تشکیک اور روحانی بحران ہے۔ اس دور میں اخلاقی اور مذہبی کشمکش کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں کچھ ایسے شکوک اور تذبذب پیدا ہو گئے تھے جن کی بنیاد صداقت فکر اور خلوص نیت پر تھی اور جن کو دور کرنے کے لئے مفاہمت کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ اس لحاظ سے نقادوں نے عہد وکٹوریہ کو "مفاہمت کا دور" Age of Compromise بھی کہا ہے۔

سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے باوجود اس دور کے ادب میں جو نمایاں تبدیلیاں ہورہی تھیں ان کا عام اظہار خالص نفسیاتی نہیں ہے۔ رومانیت کے زیر اثر کلاسیکی ادب سے جو ظاہری بیزاری پیدا ہو گئی تھی اس کی جگہ اب از سر نو قدما کی تخلیقات کا جائزہ لینے اور ان کے صحتمند اثرات کو نئی زندگی میں جذب کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہونے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے وسط تک انگریز ذہن نشاۃ الثانیہ کی تازگی، جدید کلاسیکل عہد کی نصاب پسندی اور رومانی تحریک کی پرجوش جذباتیت کو اپنانے کے لئے بیتاب نظر آتا ہے اور یہ تمام محرکات و اثرات اس دور کے ادب کو ایک نیا انفرادی رنگ دینے میں کامیاب ہیں۔

عہد وکٹوریہ کی بنیادی خصوصیات کا ہم کو اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک ہم تصویر کا دوسرا رخ بھی سامنے نہ رکھیں۔ سائنس، مادیت اور صنعتی انقلاب نے اگرچہ عہد وکٹوریہ کے نظام زندگی میں نئے تغیرات پیدا کر دئے تھے لیکن ان کی مخالفت بھی کچھ کم نہ ہوئی۔ ان موثر قوتوں کے خلاف رجعت پرستوں کا ایک گروہ حزب مخالف کی صورت میں نمودار ہوا اور اس تحریک کے زیر اثر جدید میلانات کی تنقید اور روحانی اور مذہبی اقدار کی حمایت شروع ہوئی جس سے رومانیت کے زندہ عناصر کو دوبارہ تقویت ملی۔ پہلے دور کی رومانیت اور عہد وکٹوریہ کی رومانیت میں فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں پہلے رومانیت ماضی کے ساتھ تخیلی شغف رکھتی تھی وہاں

اب اس کو موجودہ مادّی تہذیب کی مخالفت کے لئے ایک کارگر آلہ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ٹنی سن۔ براؤننگ اور آرنلڈ جیسے شعراء رومانیوں سے بہت متاثر تھے مگر سب سے زبردست انقلابی اقدام "پری رفلائٹ" Pre-Raphaelite شاعروں کا منشور تھا جس نے عہد وکٹوریہ کے نظام، خود آسودگی اور مذہبیت پر گہری ضرب لگائی۔ شاعروں کا یہ گروہ "فن برائے فن" کا قائل تھا جس کا پہلا محرک رومانی شاعر کیٹس رہا۔ اس مدرسۂ شاعری کا غالب رجحان رومانیت کی طرف تھا چنانچہ راؔزیٹی، مارس اور سوئنبرن بدلے حالات میں رومانی شعراء کی آواز بازگشت ہیں۔

عہد وکٹوریہ نے چند بنیادی خامیوں کے باوجود علم وادب کے میدان میں بہت عظیم اور جید شخصیتیں پیدا کیں۔ شاعری میں ٹنی سن، براؤننگ اور آرنلڈ، نثر میں کارلائل میکالے، رسکن اور پیٹر اور ناول میں ڈکنس، تھیکرے اور جارج ایلیٹ انگریزی کے بہت توانا ارکان تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہیں کہ دور ایلزبتھ کے بعد وکٹوریہ کا دور انگریزی ادب کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا۔

عہدِ وکٹوریہ کی شاعری

رومانی دور کے اوائل اور انیسویں صدی کے اواخر کے درمیان انگریزی شاعری مختلف محرکات اور اثرات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس شاعری میں تنوع، وسعت مفاہمت اور مذہبیت بھی ہے اور سائنس اور فلسفہ کے نئے میلانات ومطالبات کے ساتھ ہم آہنگی اور اختلاف بھی۔ یہاں ٹنی سن جیسا قدامت پرست شاعر بھی موجود ہے اور براؤننگ جیسا رجائیت پسند اور آرنلڈ جیسا متشکک اور حزنیہ شاعر بھی۔ ایک گروہ اگر اپنے دور کے ذہنی اور تنقیدی رجحانات کا حامی ہے تو دوسرا گروہ تصور پسندانہ ردعمل کا قائل۔ مگر اس تضاد کے باوجود عہد وکٹوریہ کے شاعری کی ممتاز ترین خصوصیت اثباتی اقدار کی تائید اور حمایت ہے۔

نقادوں نے اس دور کے شاعروں کو تین جماعتوں میں تقسیم کیا ہے:۔

(۱) دور اوّلین کے شعراء (اثباتی شعراء):۔ ٹنی سن اور براؤننگ

(۲) دوسرے دور کے شعراء (مشکک اور محزون شعراء) :-
آرتھر کلف، آرنلڈ، فٹز جیرالڈ، جیمیس طامسن

(۳) تیسرے دور کے شعراء (جمال پرست شعراء) :-
راز ٹی، مارس، سوئنبرن

ان شاعروں کے علاوہ چند ایسے شعراء بھی ہیں (پیٹ مور اور کرسٹنا راز ٹی) جنھوں نے اپنے زمانہ کے سنگین اور پریشان کن مسائل سے جدید مذہبی میلانات میں فرار کا راستہ اختیار کیا۔

دور اولیں کے شعراء :-

ٹنی سن ۱۸۰۹ء سے ۱۸۹۲ء

عہد وکٹوریہ کے شاعروں میں ٹنی سن بلاشبہ سب سے نمایندہ شاعر ہے کیونکہ اس کے یہاں نہ صرف ایک صحتمند روایتی رنگ موجود ہے بلکہ روح عصر کی بھی کارفرمائیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اٹھارھویں صدی کی کلاسیکی شاعری اور انیسویں صدی کی رومانیت کے درمیان ایک خوشگوار توازن قائم کیا ہے مگر اس کی تخلیقی زندگی میں رومانیت کے ارتعاشات زیادہ واضح طور پر محسوس کیے جاتے ہیں۔ ٹنی سن نے شاعرانہ ادراک رومانی شاعروں سے حاصل کیا اور اس کے یہاں جذبات کی شدت بھی رومانیت ہی کا ترکہ ہے لیکن یہ شدت ہیئت کی نفاست کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ اس کے یہاں باوجود فنی تکلفات اور تصنعات کے ایک قسم کی صداقت آمیز توانائی ملتی ہے جو اسے رومانی شاعری سے ممتاز کرتی ہے۔

ٹنی سن نے سب سے پہلے ۱۸۲۷ء میں اپنے بھائی کے ساتھ نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں اسکاٹ، مور اور بائرن کا اثر واضح تھا لیکن عوام کی ناقدری نے اس کو افسردہ کردیا۔ اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں وہ پھر منظر عام پر آیا اور اس دفعہ اس کو واقعی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اب تک ٹنی سن نے شیلی، کیٹس اور کولرج کی تقلید میں پیکر نگاری اور لفظی و صوتی آہنگ پر خاص توجہ صرف کی تھی لیکن اس کے یہاں نہ تو موضوع ہی واضح تھا اور نہ انداز فکر ہی مگر ۱۸۴۲ء کے مجموعہ میں اس کی انفرادیت ابھرتی نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر اپنے خاص انداز میں شاعری کو

آفاقی رنگ دینے کیلئے بیتاب نظر آتا ہے اور اپنے موضوعات کا انتخاب حال و ماضی، قرون وسطیٰ اور کلاسیکی واساطیری ماخذوں سے کرتا ہے۔ ان میں چند یونانی داستانیں بھی ہیں اور آرتھر کے رومان بھی مگر ان نظموں کے پیغام میں کوئی ندرت یا انفرادی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ ان نظموں میں ٹنی سن خاص کیفیتوں کی ترجمانی میں بہت کامیاب ہے اس لئے کہ اسے فطرت نگاری کے ساتھ اپنے دور کے نفسیاتی میلان کے جائزہ کا بھی موقع ملتا ہے The Lady Of Shalott کا پس منظر نیلا آسمان، پکتے ہوئے جو کے کھیت، خراماں انداز دریا، ایک حسین جزیرہ اور اس کا قلعہ نما محل ہے۔ فطرت کے اس دلآویز پس منظر میں شاعر نے مجبور و محصور خاتون کے جذبات کی ترجمانی نہایت حسن اور سلیقہ سے کیا ہے۔ نظم غیر مقفیٰ میں Oenone اور Ulysses جیسی نظمیں شامل ہیں جو ڈرامائی خود کلامی کی ابتدائی نمونے ہیں The Lotus Eaters اور The Place Of Art وغیرہ نظمیں اپنے طرز پر پیکر نگاری اور نفسیاتی مطالعہ کی کامیاب کوششیں ہیں۔ اگرچہ ان نظموں میں اخلاقی مطمح نظر واضح نہیں ہے لیکن یہاں ٹنی سن ضبط و اعتدال اور خود شناسی کی تلقین کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

مشہور امریکی ادیب اور شاعر ایمرسن Emorson نے نصف صدی کے قریب ٹنی سن کی شاعری پر "رنگ و بو" کی افراط اور "موضوع" کے ابہام کی بناپر تنقید کی تھی لیکن وہ بھی ٹنی سن کی نظم "شہزادی" The Princess سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نظم کا موضوع عورتوں کی تعلیم ہے لیکن جس پس منظر میں شاعر نے ان مباحث کو اٹھایا ہے وہاں سنجیدہ مزاح غالب ہے۔ یہاں عورتیں اپنی تعلیم کے معاملہ پر بحث کرتی ہیں اور مرد غائبانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں ٹنی سن کا کلاسیکی اور روایتی انداز اور اس کی شاعری کی غنائیہ کیفیت بخوبی محسوس ہوتی ہے۔ "شہزادی" کے بعد In Memoriam ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی جو ٹنی سن کے ملک الشعرائی کے پہلے سال کا شاہکار ہے۔ یہ مرثیہ شاعر نے اپنے دوست "ہیلم" کی موت پر قلمبند کیا لیکن اس کے خاکہ میں اس نے اپنے زمانہ کے مسائل و مباحث، عقیدہ اور بے اعتقادی امید و ناامیدی کی کشمکش کو بھی پیش کیا ہے۔ ٹنی سن نہ تو نیومین کی طرح سنت پیٹر St. Peter کی نصیحتوں سے سکون حاصل کر سکا تھا اور نہ گلیڈ اسٹون کی طرح مقدس کتابوں کی دنیا میں پناہ

لے سکتا تھا۔ حیات و موت کے تصور سے اس کی نگاہ کائنات اور انسانی مقدر پر بھی پڑتی ہے اور اسکے ذاتی شکوک عصری خلفشار سے دوچار ہوتے ہیں۔ انھیں اسباب کی بنا پر یہ نظم عہد وکٹوریہ کے ذہنی اور روحانی انتشار کا آئینہ دار بھی ہے اور شاعر کے فلسفیانہ مطمع نظر کا غماز بھی۔ نظم میں باوجود تمام مرثیت کے ایک رجائی لہر ہے جو شاعر کے ذاتی تصور حیات اور نظریہ محبت کا نتیجہ ہے۔

"ماڈ" Maude ۱۸۵۵ء میں لکھی گئی۔ یہ دراصل ایک ہی شخص کی خود کلامیوں کا ایک سلسلہ ہے جسے ٹنی سن نے "یک طرفہ ڈرامہ" Mono - Drama کہا تھا۔ ماڈ شاعر کی پسندیدہ نظموں میں سے ہے اس لئے کہ اس میں ہیرو کی بیشتر خصوصیات خود شاعر کے کردار کا آئینہ ہیں۔ یہاں مریضانہ نفسیات کا غنائی انداز میں مطالعہ کیا گیا ہے اور اس سے معاصرین بہت متاثر ہوئے تھے۔ Idylls Of The King خالص عہد وکٹوریہ کی پیداوار ہے۔ جو بالاقساط ۱۸۵۹ء اور ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک شائع ہوئی۔ ان نظموں میں مختلف داستانوں کو ملا کر ایک ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے جسمیں ٹنی سن کی بیانیہ شاعری اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ اس زمانہ میں شاعر پری رفلائٹ تحریک سے بھی متاثر تھا اس لئے جزئیات اور مشاہدہ میں ہم آہنگی کے ساتھ ان نظموں میں رومانی رزمیت کی کیفیت ملتی ہے۔ نظموں کا یہ سلسلہ اگرچہ وکٹوریہ کے زمانہ میں بہت مقبول ہوا لیکن اس خیالی رزمیہ کی تصنع آمیز اخلاقیت کی بنا پر جدید نقاد ٹنی سن کی گرفت کرتے رہتے ہیں۔

ٹنی سن کے ابتدائی اور وسطی دور کے کلام میں اگر رنگین بیانی، غنائیت اور رومانی کیفیت ملتی ہے تو آخری دور کے کلام میں سادگی اور بے تکلفی نمایاں ہے۔ ۱۸۷۵ء کے بعد لکھی ہوئی نظموں میں اگرچہ وہ دلپذیری نہیں جو اس کی ابتدائی نظموں میں محسوس ہوتی ہے لیکن ان کا انداز نسبتاً زیادہ فطری ہے۔ شاعر پھر کلاسیکی اور خالص انگریزی موضوعات پر نظمیں لکھتا ہے۔ جن کی حیثیت ابتدائی نظموں سے مختلف ہے Lockslay Hall Sixty Years After میں اس نے اپنے زمانہ کی روحانی ابتری کا نوحہ کیا ہے اور Revenge کے علاوہ To Virgil اور Parnassus جیسی نظموں میں عصری ادبیت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔

انگریزی شاعری میں ٹنی سن کا مقام متعین کرنا قدرے دشوار ہے۔ اس کی شاعری خصوصی

طور پر اپنے دور کی زندگی اور اس کے مفروضات اور مسلّمات کی تفصیل ہے اور اس میں روحانی خلفشار، مذہبی تشکیک، اور روایتی وابستگی کے ساتھ مفاہمت کا لہجہ نمایاں ہے۔ اس کے نظریۂ عشق و محبت اور سیاسی و مذہبی خیالات اسے مخصوص طور پر عہدِ وکٹوریہ کا نمائندہ شاعر بناتے ہیں۔ ٹنی سن کے زمانہ میں رومانی شعراء کے جنسی خیالات اور عیاشانہ آزادی پر سخت پابندیاں عائد کی جارہی تھیں اور دوسری طرف خانقاہی زندگی سے احتراز کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ خانگی زندگی کی ہمواری اور آسودگی کو روحانی اور اخلاقی اقدار کا معیار سمجھا جانے لگا۔

ٹنی سن نے بھی رومانی جنسی بے راہ روی اور خانقاہی زندگی کے درمیان مفاہمت کی اور گھر کی چہار دیواری کے اندر فردوسِ گمشدہ کو پایا۔ اس کے یہاں جسمانی جذبات اور نفسانی خواہشات سے زیادہ روحانی اور اخلاقی اقدار پر زور دیا گیا ہے۔ وہ مرد عورتوں کے تعلقات ازدواجی محبت کے علاوہ کسی اور طرح سے سوچ ہی نہیں سکتا تھا اسی لئے اس کی شاعری کا ایک حصّہ عورتوں اور مردوں کے باہمی رشتوں کی روایتی تصورات پر مشتمل ہے۔

سیاسی اعتبار سے ٹنی سن قدامت پرست تھا۔ اس کے یہاں جمہوری نظام سے بیزاری کا جذبہ اس حد تک موجود ہے کہ وہ بادشاہ یا ملکہ کے بغیر کسی ملک میں امن و فلاح کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ امر واقعی حیرت انگیز ہے کہ ٹنی سن باوجود اس کے کہ اس حقیقت کا رازداں ہے کہ "نیا نظام پرانے نظام کو بدلتا رہتا ہے" آخر وقت تک پرانے روایات اور اقدار کو سینے سے لگائے رکھا۔ وہ ملک میں امن و آشتی کے لئے تنظیم، وفاداری اور اجتماعی شعور کی تلقین کرتا ہے:

"That Soler Freedim Out Of Which There Springs
Our Loyal Passion For Our Femperate Kings"

داخلی سیاست میں وہ اعلیٰ درمیانی طبقہ کا نمائندہ ہے اور شہنشاہیت کا مبلغ۔ لیکن خارجی سیاست میں وہ انگریزی استعماریت کا خواہشمند ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں اس نے اپنی نظم "لکھنؤ" میں پوری طرح ہندوستانی تحریک کی مذمت کی ہے اور انگریزی حکومت کو ہندوستانیوں کے لئے رحمت بتایا ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی ٹنی سن نے مفاہمت کی کوشش کی۔ سائنس اور جدید فلسفہ اور مذہب و عقیدہ کی کشمکش سے وہ بخوبی واقف تھا۔ اس تشکیک کا اظہار اسکی چند

اس لحاظ سے نمائندہ In Memoriam نظموں میں بڑی دردمندی کے ساتھ ملتا ہے
تخلیق ہے۔ شاعر اپنی بنیادی رجائیت کی بدولت ڈارون Darwin اور اسپنسر
Spencer کی دہریت سے دہشت زدہ نہیں ہوتا اور روحانی اور اخلاقی اقدار کی
فتح و کامرانی پر کامل یقین رکھتا ہے۔

"One Far - Off Divine Event
To Which The Whole Creation Moves"

ٹنی سن کی اس مفاہمت اور خود آسودگی کے خلاف اس زمانہ میں ہی رد عمل شروع ہو گیا تھا۔ لٹن اسٹریچی نے جدید نقادوں میں سب سے پہلے اس کی سطحیت کا پردہ فاش کیا اور آج تک ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو عہد وکٹوریہ کی شاعری کی تمام کمزوریاں ٹنی سن کے کلام میں پاتے ہیں مگر اس کے باوجود ٹنی سن انگریزی شاعروں کے صف اول میں نظر آتا ہے۔ اس کے کلام کا غنائی انداز اور صوتی آہنگ کے علاوہ اس کی فطرت نگاری اور نفسیاتی ترجمانی اس کی عظمت کی دلیل ہیں۔

براؤننگ ۱۸۱۲ء سے ۱۸۸۹ء

عہد وکٹوریہ کے ممتاز شاعروں میں براؤننگ اپنا منفرد مقام رکھتا ہے اسکی شاعری اپنے عہد کے اس خاص رجحان کی ترجمانی ہے جس میں نفسیاتی تجزیہ اور اخلاقی تنقید کو بڑا دخل ہے براؤننگ مذہبی عقائد اور زندگی کا مطالعہ عقل اور استدلال کی روشنی میں کرتا ہے اس لحاظ سے اگرچہ اس کی نظموں میں دور بدور لہجہ کا فرق بھی نمایاں ہوتا گیا ہے لیکن ان میں ایک طرح کی اصولی وحدت پائی جاتی ہے۔ براؤننگ کا کلاسیکی اور انگریزی شاعروں کا مطالعہ نہ صرف وسیع تھا بلکہ کافی گہرا بھی تھا۔ اٹلی اور جرمنی کے متعدد مشاہیر کے علاوہ وہ رومانی شاعر شیلی کا بڑا مداح تھا لیکن ابتدائی دور کے بعد اس کے تخیل اور احساس میں ایک نئی ثبات پیدا ہو گئی اس لئے وہ شیلی کی دہریت سے آزاد ہو کر مذہبی محرکات سے اثر قبول کرنے لگا۔

براؤننگ کی بہترین نظمیں ۱۸۴۰ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان لکھی گئیں۔ ایلزابتھ سے اس کی پہلی ملاقات ۱۸۴۵ء میں ہوئی تھی اور پھر دونوں میں ۱۸۶۱ء تک قرب رہا لیکن موت کے بعد بھی براؤننگ کی شاعری پر ایلزابتھ کا خاصہ اثر رہا۔ اپنی عمر کے بیسویں سال میں جب وہ شیلی کی

خواب ناکی سے زیادہ متاثر تھا اس نے یکے بعد دیگرے تین نظمیں Pauline ، Paracelsus اور Sordello لکھیں ۔ ان نظموں میں انسانی توانائیوں اور ان کی رعنائیوں کے نمونے تخلیق کئے گئے ہیں اور ان میں علم ، بصیرت اور احساس کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ " پالین " میں شاعر اپنی روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیتا ہے اور " پیراسلس " بھی ایک ہی فرد کے داخلی ڈرامہ کا ترجمان ہے " سارڈلو " میں جدت تخیل اور نفسیاتی مطالعہ کے باعث براؤننگ کچھ الجھتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن یہیں پہونچ کر اسے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوا تھا ۔ اس نظم کے انتساب میں براؤننگ نے کہا تھا کہ میرا اصل مقصد روح کی ارتقا کا مطالعہ ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع قابل توجہ نہیں "۔

براؤننگ کی شعوری پختگی کے دور کی نظمیں ہی اس کا اصل اکتساب ہے ۔ ان میں محض جدت تخیل یا شدید قسم کی داخلیت نہیں بلکہ حیات و کائنات سے متعلق شاعر کا سنجیدہ اور متوازن مطمح نظر ملتا ہے ۔ براؤننگ کے منظوم ڈرامے اپنی داخلی کیفیات کی بنا پر اسٹیج کے لائق نہیں لیکن ان میں ڈرامائی کیفیت اور فنی معروضیت ضرور ملتی ہے ۔ ان سب ڈراموں میں Pippe Passes سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ " ڈرامائی غنائیوں " اور " ڈرامائی رومانوں " میں بھی یہی کیفیت نمایاں ہے ۔ آخری مجموعے " مرد عورتیں " اور " ڈرامائی کردار " ہیں جن کے ساتھ براؤننگ کی ڈرامائی خود کلامیوں کا سلسلہ ختم ہوگیا ۔ ان چار مجموعوں کے مطالعہ سے ہم شاعر کے فن اور اسالیب کے علاوہ اس کے خیالات اور نظریات کا بھی اندازہ کرسکتے ہیں ۔

" ڈرامائی خود کلامی ' Dramatic Monologue براؤننگ کے یہاں سب سے اہم شعری صنف ہے گر ہیئت کے اعتبار سے اس کی نظمیں ڈرامہ کی شرائط کو پورا نہیں کرتیں کیونکہ ان میں اشاروں یا خطوط کے ذریعہ دوسروں سے خطاب کیا جاتا ہے اور شاعر کی حیثیت مکتوب اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک " خبر رساں " کی رہ جاتی ہے ۔ اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ صنف اپنی نوعیت کی جس قدر اہم ہے اسی قدر مشکل بھی ہے ۔ اس میں کرداروں کے داخلی کیفیات اور ذہنی واردات کے مطالعہ سے لے کر شعور اور تحت الشعور اور نفسیاتی تجزیہ کو بھی یکساں دخل ہے ۔ چنانچہ اکثر اوقات مصنف اپنے کرداروں کی داخلی تاریخ مرتب کرنے میں فنی اصول سے بھی بے نیاز

ہو جاتا ہے۔ براؤننگ اپنی ڈرامائی نظموں میں افراد کی داخلی زندگی اور ان کے محرکات کی روشنی
میں حیات و کائنات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے لیکن اکثر اس کی کوششیں خشک قسم کا تجزیہ ہو کر
رہ جاتی ہیں۔ اخلاقی اور نفسیاتی عوامل اور ان کے اثرات پر ضرورت سے زیادہ زور پڑھنے
والے کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیتا ہے۔

براؤننگ کی شاعری موضوع اور اسلوب کی "انفرادیت" کی بنا پر عوام کی شاعری
نہیں ہو سکتی تھی اسی لئے اسے اپنے ہمعصر ٹینی سن کے مقابلہ میں کم شہرت حاصل ہوئی۔ براؤننگ
زندگی کے سماجی یا اجتماعی مسائل سے دلچسپی نہیں لیتا تھا اور اس کے برخلاف وہ افراد کے
کردار اور ان کے مقدر کے مسئلہ کو زیادہ اہم سمجھتا تھا۔ ہنگامی اور عارضی مسائل سے بے نیازی
کے باعث اگرچہ اسے شہرت عام نہیں حاصل ہو سکی لیکن آفاقیت کا بہترین اظہار اس کی عشقیہ
نظموں میں ہوا ہے جہاں وہ جذبۂ محبت کا تجزیہ بڑی شدت احساس اور تعمق فکر کے ساتھ
کرتا ہے۔ براؤننگ کے نزدیک محبت تمام انسانی اعمال کا محرک ہے۔ یہاں تک کہ محبت کے
بغیر علم اور فلسفہ بھی خشک تاریخ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کے یہاں ازدواجی زندگی
کی محبت پر بھی نظمیں ہیں اور ناکام محبت پر بھی لیکن ہر جگہ عاشق کا وقار اور اس کی متانت کا
لحاظ رکھا گیا ہے۔ براؤننگ ازدواجی محبت کو انسانی تکمیل کی آخری منزل تصور کرتا ہے۔
اس لحاظ سے اس کی نظمیں The Last Ride Together (Too Late
Prospice اور By the Fire-Side بہت مشہور ہیں۔

براؤننگ کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت اس کی رجائیت ہے۔ وہ اپنے
دور کے تمام تشکیکی میلانات اور مذہبی بے اعتقادی کے باوجود محبت کا راگ گاتا رہا اور بہت
خلوص کے ساتھ امید کی شمعیں روشن کئے رہا۔ وہ نہ تو ٹینی سن کی طرح خود آسودگی کا شکار رہا،
اور نہ میتھو آرنلڈ کی طرح قنوطیت کا پیکر۔ ذاتی زندگی میں کامیاب محبت اور مذہبی اعتقاد کی بنا
پر وہ کبھی محزونیت یا کلبیت کا شکار نہ ہوا۔ براؤننگ کے نزدیک دنیا "دارالخراب" ہونے
کی بجائے ایک حسین بستی ہے کیونکہ اس کا خالق مہربان اور کریم ہے اور اس نے اپنی بہترین مخلوق
کے لئے اس کی تخلیق کی ہے۔ زندگی میں اگرچہ نشیب و فراز اور مصائب و آلام سے نجات ممکن نہیں

لیکن براؤننگ ہمیشہ روحانی اور عملی جہاد کی تلقین کرتا ہے جس سے زندگی کی تحسین و تہذیب ممکن ہے۔

انیسویں صدی کے شاعروں میں براؤننگ کا مقام متعین کرنا آسان نہیں ہے۔ اپنی تمام شاعرانہ عظمتوں کے باوجود اس کا عالمانہ اسلوب بیان اور اس کی مشکل پسندی ہر کس و ناکس کے لئے نہیں۔ دراصل براؤننگ خیالات و افکار کی رو میں فن و اسلوب سے اکثر بے اعتنائی برتنے لگتا ہے جس سے اس کے یہاں ایک طرح کی غربت کا احساس ہوتا ہے مگر ان خامیوں کے باوجود براؤننگ کے شاعرانہ اکتسابات سے انکار ناممکن ہے۔ وہ ٹنی سن کی طرح "جزائری وطنیت" کا شاعر نہیں بلکہ اس کے کلام میں انسانیت کی روح ملتی ہے۔ براؤننگ اپنی انسان دوستی کے علاوہ عشق و محبت کی کامرانیوں اور رجائی نغموں کی وجہ سے انگلستان سے زیادہ دوسرے ملکوں کا بھی شاعر ہے۔ علامہ اقبال جیسا مفکر شاعر بھی گوئٹے اور اور ایمرسن کے ساتھ براؤننگ کا معترف ہے۔

تشکیکی ردِ عمل کے شعراء :-

عہد وکٹوریہ کی شاعری میں اگر ایک طرف ٹنی سن اور براؤننگ جیسے شاعر ہیں جو اپنے زمانہ کی مادیت اور دہریت پر اپنے عقائد کی پختگی اور رجائیت سے فتح پانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف کلف Clough، میتھو آرنلڈ اور فٹز جیرالڈ جیسے شاعر بھی موجود ہیں جن کے یہاں ایک بلیغ پر تامل اداسی اور تشکیکی میلان ملتا ہے۔ یہ تمام شعرا عصری زندگی کے تناقص اور عقیدہ اور سائنس کے تصادم سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی لئے ان کے یہاں مفاہمت سے زیادہ بغاوت، اور بیچارگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری میں یہ تشکیکی عنصر انیسویں صدی کے نصف آخر میں شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگا یہاں تک کہ ہارڈی اور ہاؤس مین جیسے شاعروں کے ہاں یہ مستقل عنوان بن گیا۔ دور عناصر پرستی Paganism کی شاعری احساسات کی شاعری تھی، ازمنہ وسطیٰ کی مسیحی شاعری بھی دل و دماغ کی شاعری رہی لیکن نشاۃ الثانیہ کے بعد کی شاعری میں فکر و تامل کا عنصر احساس اور تخیل پر حاوی ہوتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر میں میتھو آرنلڈ جیسے شاعروں کے یہاں شاعری "تنقید حیات" ہو گئی۔

ان شاعروں کو "تشکیکی ردِ عمل کا شاعر" Poets of Sceptical Reaction کہا گیا ہے اس لئے کہ یہ شعرا پری رفلائٹ شاعروں کے برخلاف نیومن کے آکسفورڈ تحریک سے منفی اثرات لے کر دوسری جانب بڑھ گئے اور ان کے یہاں زندگی مستقل اضمحلال اور یاس کی تصویر بنکر رہگئی۔

(۱) آرتھر کلف : ۱۸۱۹ء سے ۱۸۵۶ء

آرنلڈ کے معاصرین میں کلف کی شاعرانہ عظمت اس کے پرخلوص جذبۂ اظہار اور صداقت خیال کی بنا پر ہے۔ ابتدا میں وہ آکسفورڈ تحریک اور نیومین کے متبعین میں تھا لیکن بہت جلد اسکا راستہ بدل سا گیا۔ اس کے یہاں زمانہ کے تناقضات نے ایک کرب و اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی جسکا اظہار اس کے کلام میں نہایت سچائی کے ساتھ ہوا ہے۔

کلف کی تصانیف ایک حد تک خیالات کے تاریخی ارتقا کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ اسکی نسل نے مذہبی شکوک کے بھرپور اثرات قبول کئے اور کلیسا میں خیال اور مشرب کی نئی وسعتیں پیدا کرنا چاہیں جس کا عکس اس کی شاعری میں ملتا ہے۔ اگر اس کے یہاں امید کی جھلک نظر آتی ہے تو وہ شاعر کی اس وسیع المشربی کی بدولت ہے جس میں عزم اور عقیدہ نے ایک داخلی قوت پیدا کر دی ہے۔ کلف کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ذہنی سکون سے آشنا ہو سکا لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس نے اس "سکون" کی تلاش ہمیشہ جاری رکھی، اسی لئے اس کے یہاں فلسفۂ عمل کی آواز بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔

کلف کی طویل نظمیں کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہیں۔ اس کا طویل شعری کارنامہ A Mours De Voyage ایک منظوم داستان ہے جسے ہم کوئی منفرد شاعرانہ اکتساب نہیں کہہ سکتے۔ کلف کی اصلی شہرت Dipsychus کی بدولت ہوئی جو ۱۸۵۰ء میں منظر عام پر آئی۔ یہاں عصری معاملات و مسائل کے ساتھ تخیل کی کارفرمائیاں بھی نمایاں ہیں۔ انگلستان میں کلف کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے یہاں تشکیکی میلان کی وہ شدت اور عقلیت اور وجدان کے درمیان وہ کشمکش ملتی ہے جو گوئٹے کی "فاوسٹ" Faust کی یاد دلائے۔

کلف کا آخری قابلِ ذکر کارنامہ The Bothie of Tober-Ne Vuolish ہے جو باوجود فنی تکلفات کے شاعر کی قوتِ اختراع کی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں ایک قسم کی

تازگی اور روحانی سادگی ملتی ہے جو اسکاٹ لینڈ کے پس منظر میں کلاسیکی گیتوں کی فضا پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ یہاں فطرت اور اس کے مناظر کی دلکشی شاعر کے جذبات کو متحرک کرتی ہیں۔

(۲) میتھو آرنلڈ : ۱۸۲۲ء سے ۱۸۸۸ء

عہد وکٹوریہ کے شاعروں میں اگرچہ ٹینی سن اور براؤننگ نے کلاسیکی موضوعات سے استفادہ کیا تھا لیکن میتھو آرنلڈ صحیح معنوں میں کلاسیکی مزاج کا مالک تھا۔ اس کے یہاں کلاسیکی بصیرت اور قدما بالخصوص یونانی فن اور ادب کا واضح تصور ملتا ہے۔ اسلوب کی بلیغ سادگی۔ آرنلڈ کی پرتامل شخصیت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہے کہ ہم اسے بجا طور پر جدید عقلی شاعری کا نمایندہ کہہ سکتے ہیں۔ آرنلڈ کے یہاں بائرن اور شیلی کی پرواز تخیل کی جگہ ایک خاص منبط و اعتدال کا احساس ہوتا ہے جو رومانی شاعروں سے ردعمل کا نتیجہ ہے۔

آرنلڈ اگرچہ خود ایک مفکر اور صاحب اسلوب شاعر تھا لیکن اس نے اپنی شاعری کی بنیاد روایتی اسالیب پر رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف اس کے یہاں ہومر Homer اور سافوکلیز Sophocles کا پرتو ملتا ہے تو دوسری طرف ورڈسورتھ کی اخلاقیت اور اوبرمان Ober mann کی سنجیدگی اور پرتامل اداسی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ آرنلڈ تخلیق سے زیادہ تنقید کی قابلیت رکھتا تھا جس کی بنا پر وہ ان کلاسیکی نظریات کی طرف راغب ہوا جن میں ہیئت سے زیادہ مواد اور صنعت گری سے زیادہ معنویت پر زور دیا گیا ہے آرنلڈ اگرچہ انگریزی کے صف اول کے شاعروں میں نہیں شامل کیا جا سکتا مگر فلسفیانہ شاعری کی تاریخ میں اس کا ایک مقام ہے۔

آرنلڈ کی شاعرانہ تخلیقات میں بیشتر حصہ ان نظموں کا ہے جن میں خیالات کی شائستگی تو ضرور ملتی ہے مگر جذبہ اور احساس کی وہ گرمی نہیں جس سے اعلیٰ شاعری ممتاز ہوتی ہے۔ اسی طرح اسکی اخلاقی نظمیں محض منظوم بحثیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آرنلڈ کی شاعری میں عصری زندگی سے عملی بے تعلقی بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے۔ ماضی سے یہ لگاؤ دراصل اس رومانیت کی آواز بازگشت ہے جو پری رفلائٹ شاعروں کے کلام میں زیادہ واضح ہے۔ اس لحاظ سے چند رزمیہ

اور اساطیری نظمیں بالخصوص The Strayed Reveller,
Empedocles on Etna اور Sobrab & Rustam قابل غور ہیں۔

آرنلڈ کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت اس کی پرتامل اداسی ہے جو درحقیقت اس کے انداز فکر کا لازمی نتیجہ اور انیسویں صدی کے اواخر کی ذہنی کشمکش اور کرب و اضطراب کا عکس ہے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آرنلڈ تمام انگریزی شاعروں میں اپنی اسی خاصیت کی بنا پر ممتاز ہے۔ بلنگ گریے، شیلی اور ٹنی سن جیسے شاعروں نے اپنے غم کا اظہار اپنے مرثیوں اور نوحوں میں کیا ہے۔ لیکن آرنلڈ کے یہاں ہم کو مرثیت کی دھن ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ اس لحاظ سے نقادوں کا یہ کہنا کہ اس کی فطری اداسی کا سب سے زیادہ موزوں ذریعۂ اظہار مرثیہ ہے، تقریباً صحیح ہے۔ آرنلڈ کی شاعری عصری زندگی میں تلاشِ سکون کا المیہ ہے جس میں مذہبی اقدار کی بے اعتباری اور روحانی اور عقلی روایتوں کی ناکامی نے مل کر ایک عجیب غمگینی پیدا کر دی تھی۔ عہد وکٹوریہ میں مادیت اور دہریت کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نہ صرف مذاہب اور عقاید کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا بلکہ عوام بھی تشکیک اور تذبذب میں مبتلا تھے۔ اب تک حکما اور زعمائے دین مختلف تاویلوں کے ذریعہ فکر اور عقیدہ کی خلیج کو بھرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں سائنس اور فلسفہ نے ایسی روشنی پھیلائی کہ مذہب عہد پارینہ کی داستان ہو کر رہ گیا۔ رحیم و کریم خدا کی خدائی میں شر کا وجود ایک عقدۂ لاینحل تھا۔ گوئٹے کا قول کہ "شر سے ہی خیر کی نمو ہے" اور کارلائل کا دعویٰ کہ "شر کو بالآخر شکست ملتی ہے"۔ آرنلڈ اور اس کے معاصرین کے لئے ناقابل قبول تھے۔

آرنلڈ کی دو نظمیں "مسیرینس" Mycerinus اور "ایمپیڈاکلیز" Empedocles ...... تذبذب اور انتشار کے اس دور کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ پہلی نظم میں ولی عہد شاہزادہ کو اس بات سے بیحد دکھ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پاکیزہ زندگی کے باوجود زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا برخلاف اس کے اس کے باپ نے اپنی بدکاریوں اور عیاشیوں کے باوجود طویل عمر پائی۔ انسانی اقدار اور خدائی جبر کے درمیان یہ تناقض کسی طرح قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا۔ دوسری نظم میں ہیرو کا داخلی انتشار شدت کے ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ وہ دور جدید کا نمایندہ ہے جو مذہب سے بیزار ہو کر زندگی سے مفاہمت نہیں کر سکتا اسی لئے آخرکار وہ "اٹینا" کوہ آتش فشاں

کے دہانہ میں کود پڑتا ہے۔

اپنے دور کے دوسرے تشکیکی اور محزون شاعروں کی طرح آرنلڈ بھی آکسفورڈ تحریک کے ردعمل کا شاعر تھا لیکن جہاں ٹنی سن اور براؤننگ تشکیک کی وادی سے باہر نکل آئے آرنلڈ آخروقت تک اسی میں بھٹکتا رہا۔ اگرچہ وہ فرانس کی بغاوت سے براہ راست متاثر نہیں ہو سکا تھا لیکن اس سیاسی انقلاب کی تباہ کاریوں کا بخوبی جائزہ لے سکتا تھا۔ اس انقلاب نے قدیم نظام کو درہم برہم کر دیا تھا اور بقول شاعر کے عقاید اور اقدار کی جگہ "ماضی کے کندے زندگی کے پرشور سمندر میں ہچکولے کھا رہے تھے۔" وہ دو دنیاؤں کے درمیان کھڑا تھا جس میں ایک مرچکی تھی اور دوسری اتنی بے سکت تھی کہ پیدا نہیں ہو پا رہی تھی۔ گوئٹے اور اوبرمان جیسے لوگ جب یورپ کے "مریض جاں طلب" کی مسیحائی سے قاصر رہے تو کوئی اور اس کی کیا تدبیر کر سکتا تھا؟

The Scholar Gipsy آرنلڈ کی ان شاہکار نظموں سے ہے جن کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں۔ یہ نظم جدید انسان کی روح پر عقل کے غلبہ کا مرثیہ ہے۔ جدید انسان کی ذہنی پراگندگی اور روحانی انتشار کا اس سے بہتر خاکہ اگر کہیں ممکن ہے تو ایلیٹ کے "خرابہ" The Wasteland میں ہی ہے۔ یہی خیال ایک دوسری نظم A Summer Night میں ایک بلیغ پیکر نگاری کے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہے جس میں ایک "زردرو" انسان نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے مگر طوفان کی تباہ کاریاں بڑھتی جاتی ہیں اور آخر کار وہ خود اسکی نذر ہو جاتا ہے Dover Beach اور Thyrsis جیسی نظموں میں بھی یہی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ حزن و یاس کے ان گھنگھور بادلوں میں کہیں سے بھی روشنی یا امید کی جھلک نہیں نظر آتی۔ انسانوں سے بیزار ہو کر آرنلڈ فطرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن وہاں بھی کسی قسم کی ہمدردی کا احساس نہیں ملتا۔ جنگل، پہاڑ، ندیاں اور وادیاں اور دوسرے قدرتی مناظر اسکی شاعری میں سوز و گداز کے لئے ایک مخصوص پس منظر مہیا کرتے ہیں مگر ان میں وہ روحانی کیفیت اور سرشاری نہیں ملتی جو ورڈسورتھ جیسے شاعروں نے فطرت میں پائی تھی۔

آرنلڈ کی شاعری مجموعی طور پر جدید شاعری کے لئے مشعل راہ بنی۔ اس کے یہاں موضوع کی صداقت کے ساتھ اسلوب بیان کی دل نشینی اور قوت اختراع کا تنوع قابل لحاظ ہے۔

بحیثیت ایک کلاسیکی شاعر کے اس نے ہمیشہ قدماء کی تقلید کی تلقین کی جہاں ہم مسرت اور بصیرت حاصل کرسکتے ہیں لیکن آرنلڈ کی کلاسیکیت اٹھارھویں صدی کی نصابی اور میکانکی کلاسیکیت سے مختلف ہے۔ اس کی شاعری میں سلاست اور زور و اثر بھی ہے اور پیکر نگاری کی متنوع خوش سلیقگی بھی۔ وہ بلاشبہ جدید فکری شاعری کا پہلا نمایندہ ہے۔

(۳) ایڈورڈ فٹز جرالڈ : ۱۸۰۹ء سے ۱۸۸۳ء

فٹز جرالڈ اگرچہ طبعاً سست آدمی واقع ہوا تھا لیکن ادب سے اسکا شغف اور اس کی تنقیدی بصیرت اس کے مزاج کی پیدائشی خصوصیت تھی جسے اس کے معاصرین سے لے کر آج تک سبھی تسلیم کرتے آئے ہیں۔ وہ تنہائی پسند اور خوابوں کی دنیا کا شاعر ہے جس کے کلام میں غم پسندی اور عیش کوشی دونوں ایک مرکب میلان کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ آرنلڈ کی طرح فٹز جرالڈ کی شاعری میں بھی قنوطیت اور عقلیت کے عناصر باہم ملے جلے ہیں جس سے ایک نئے عنوان کی رومانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ایران کے مشہور شاعر عمر خیام کی طرف اس کی کشش کا راز بھی یہی غم پسندی اور نشاطیت ہے۔ عمر خیام کی رباعیوں کے منظوم ترجموں نے فٹز جرالڈ کو انگریزی شاعری میں غیر فانی بنادیا۔ ان رباعیوں سے ہمیں شاعر کی محزونیت اور عیش کوشی کا احساس ہوتا ہے۔ مشرق اور مشرقی موضوعات سے دلچسپی انگریزی ادب میں نشاۃ الثانیہ کے زمانہ سے موجود ہے لیکن "رباعیات خیام" کے ان ترجموں نے مشرقی طرز فکر اور طرز معاشرت سے مغرب کو آشنا اور مانوس کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ فٹز جرالڈ نے اپنے ترجموں میں اپنے فکر و تامل سے رنگ بھی بھرا ہے جس سے وہ مغربی مزاج سے زیادہ قریب ہوگئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ترجمہ ہونے کے یہ اکتسابات انگریزی ادب میں تخلیقی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۴) جیمس طامسن : ۱۸۳۴ء سے ۱۸۸۲ء

تشکیکی شاعروں کی اداسی اور غمگینی کی لہر عہد وکٹوریہ کے آخری دور کے شاعروں میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس زمانہ میں اگر ایک طرف مادیت اور ارتقا کے علمبردار اپنے عام نظریوں کی اشاعت کر رہے تھے تو دوسری طرف ہربرٹ اسپنسر جیسے مفکر عہد وکٹوریہ کی مادیت اور خود آسودگی کا جواز پیش کر رہے تھے۔ اس فکری مفاہمت کے باوجود انیسویں صدی

کے اواخر میں ایسے شعرا اور ادیب پیدا ہوئے جن کے یہاں ایک واضح ردعمل نظر آتا ہے جو سائنسی جبریت اور عام انسانی اقدار کے تناقص کا صریح نتیجہ ہے۔ جیمس طامسن اس سلسلہ کے شاعروں میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیمس طامسن اپنے معاصرین میں اپنی توانائی اور فکری جرات مندی کے باعث ممتاز تھا۔ لیکن اس کا اپنا تذبذب اور انتشار اس پر اس طرح غالب رہا کہ اس کی شاعری کی دوسری دھنیں مدھم پڑ گئیں۔ طامسن کی زندگی اس کے لئے مشتعل آزمائشوں کا سلسلہ تھی۔ بچپن میں ماں کی موت، باپ کی مصیبتیں، نوعمری میں محبت اور محبوبہ کا انتقال اور خود اس کی خرابیٔ صحت نے اسے نڈھال سا کر دیا جس کا اثر لازمی طور پر اس کی شاعری پر پڑا۔ اگرچہ اس کے یہاں دوسری ذہنی کیفیتیں بھی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس کی شاعری کا سب سے اہم موضوع زندگی کی غمناکی اور غم کا عرفان ہی ہے۔ طامسن کی ابتدائی نظموں میں یہ رجحان دوسرے عناصر کے ساتھ ملا جلا محسوس ہوتا ہے لیکن ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان لکھی ہوئی نظموں The City of Dreadful Nights میں زیادہ شدت کے ساتھ اجاگر ہے۔ یہ درحقیقت ڈراونے خوابوں کی دنیا کی تصویر ہے جہاں کے باشندے تمام ناامیدیوں کے باوجود جیئے جانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اس بستی سے ہو کر خودکشی کی ندی بہتی ہے جس کے اوپر خوفناک تاریکی کا سایہ ہے اور جس پر آسمان کا سائبان تک نہیں۔ اس بستی کی گلیوں میں بھوت پریت زندہ لوگوں کے ساتھ رہتے بستے اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور وہاں کے مندروں میں انسانی بربادی کے بھجن گائے جاتے ہیں۔ اس بستی کے تمام باشندے خوف و اضطراب سے بدحال ہیں لیکن سوائے سرگوشیوں کے آپس میں بات چیت نہیں کرتے۔

طامسن کے نزدیک کائنات کے پردہ میں "خلا" کے سوا کچھ بھی نہیں ——— نہ خدا ہے، نہ کوئی مقصد حیات ہے اور نہ مستقبل ہی ہے۔ شیلی نے کہا تھا کہ "جہنم لندن سے ملتا جلتا ایک شہر ہے"۔ طامسن کا "خوفناک شہر" بھی اس کے نزدیک لندن کا ہی چربہ ہے جہاں لوگ التباسی زندگی گزارتے ہیں۔ طامسن کی نظم اگرچہ صالح ذہن کی پیداوار نہیں لیکن اس کی دردانگیز صداقت اور خیالات و افکار کی شدت ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

پری رفلائٹ شعرا :-

پری رفلائٹ تحریک

پری رفلائٹ تحریک کو بجا طور پر انگریزی شاعری کا دوسرا نشاۃ الثانیہ کہا گیا۔ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۴ء کے درمیان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومانی شعرا ـــــــ کیٹس، شیلی اور بائرن کی موت کے بعد انگریزی شاعری کی محفل ویران سی ہوگئی۔ کہنے کو ورڈسورتھ ابھی زندہ تھا لیکن وہ اپنی بہترین تخلیقات اس سے پہلے پیش کر چکا تھا۔ ٹنی سن کی شاعری پر اس کے زمانہ کے میلانات کا ایسا غلبہ تھا کہ رومانی تخلیقات کے لئے کم گنجائش تھی۔ رومانیت کے اس زوال کے زمانہ میں ایسے شاعروں کی ایک نئی نسل ابھر رہی تھی جس پر آکسفورڈ تحریک اور اطالوی رومانیت اور جمال پرستی کا بہت اثر تھا۔ پری رفلائٹ تحریک کا تعلق شاعری سے زیادہ مصوری سے تھا لیکن ماقبل رافیل مصوروں نے جس سادگی اور تفصیل نگاری سے اپنے فن میں کام لیا تھا اسی کو رازٹی Rossetti اور اس کے ساتھیوں نے شاعری میں برتنے کی کوشش کی۔

تاریخی طور پر انگلستان میں پری رفلائٹ تحریک کا بانی رسکن تھا جس نے انگریزی مصوری میں نئے عناصر شامل کرنے کی تبلیغ کی۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک انگریزی مصوری بلیک Blake اور اس کے مقلدین سے برطرف ہو کر اس فن کے نئے عنوانات سے آشنا نہ ہو سکی تھی جو رومانی تحریک کے ذریعے ممکن تھی۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل غور ہے کہ اٹلی میں نشاۃ الثانیہ سے ہی فنون لطیفہ کی دنیا میں اہم انقلابات رونما ہوتے رہے۔ مگر انگلستان ابھی تک روایتی راستہ پر چل رہا تھا۔ رسکن کی تحریک اور بالخصوص اس کی تصنیف "جدید مصور" Modern Printers نے مصوری کے لئے وہی کام کیا جو ورڈسورتھ کے "مقدمہ" نے شاعری کے لئے کیا۔ اسی کا نتیجہ "پری رفلائٹ برادری" Pre—Raphaelite Brotherhood تھی جو ۱۸۴۸ء میں وجود میں آئی جس میں رازٹی Rossetti، ہنٹ Hunt اور Millais پیش پیش تھے۔ اس برادری کی محرک انگریزی فنون کی "نفرت انگیز اور قابل ملامت" حالت تھی جس میں سوائے تقلید اور روایت پرستی کے کوئی تازگی نہیں رہ گئی تھی برادری کے سامنے اٹلی کے ان نامور فنکاروں کا نمونہ تھا جنھوں نے مذہبی جذبہ اور فنی انہماک سے کام لے کر ناقابل فراموش شاہکار پیدا کئے تھے۔ چنانچہ ان کا منشور بھی اسی قدر انقلابی تھا جیسا ورڈسورتھ کا

"مقدمہ" "مصور ہو یا شاعر، فنکار کے ذاتی تاثرات کی تعریف اور ان کا اظہار لازمی ہے ....
فنکاروں کا مطالعۂ فطرت بالکل واضح اور براہ راست ہونا چاہیئے اور تمام مظاہر قدرت سے ہم آہنگ بھی" جب شاعری پر اس منشور کا اطلاق کیا گیا تو پنسل اور برش کی جگہ قلم نے لے لی اور تفصیلی خورد نگاری اور حقیقت آفرینی شاعروں کا نصابِ فن ٹھہرا۔

پری رفلائٹ تحریک کے اثر سے انگریزی شاعری میں مذہبی وجدانیت اور جذباتی ارتسامیت سے نئے تجربے ہونے لگے چنانچہ پری رفلائٹ شاعروں کے یہاں مصوری، شاعری اور مذہب کے درمیان کوئی خاص حد فاصل نہیں ہے۔ راز ٹی، پارس اور سوئنبرن کے یہاں عہد وکٹوریہ کی کثیف مادیت کے خلاف جذبہ بھی ہے اور مذہبی محرکات کا عکس بھی۔ یہ مذہبیت "پیٹمور" patmore کی شاعری میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے ساتھ ہاپکنس Hopkins مسز مینل Mrs. Meynnll اور کرسٹینا رازٹی Christina Rossetti نے وہ رنگ اختیار کیا جسے ہم سترھویں صدی کی مذہبی اور فلسفیانہ شاعری اور ڈن Donne اور ہربرٹ Herbert کی آواز بازگشت کہہ سکتے ہیں۔

پری رفلائٹ شاعروں نے عہد وکٹوریہ کے سیاسی اور سماجی مسائل کو نظر انداز کر کے بڑی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔ ان کے یہاں جذباتیت Sentimentalism یا خود آسودگی کا غلبہ نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی نہیں بلکہ تخئیلی ترجمانی ہے۔ اس تحریک سے رومانیت کا بھی احیا رہا لیکن اس کے مبلغ اپنے دور کے فلسفہ اور سیاست سے بہت حد تک بے نیاز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوئنبرن کی اطالویت اور پارس کی اشتراکیت کے باوجود اس شاعری میں وہ جوش پیدا نہ ہو سکا جس سے بائرن اور شیلی کا کلام ممتاز ہے۔ فرانسیسی فنکاروں مثلاً گوتیر Gautier اور بودلیئر Baudelaire کا اس شاعری پر گہرا اثر ہے جس سے پری رفلائٹ شاعری "فن برائے فن" کا مرادف ہو کر رہ گئی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں رومانیت بہت حد تک "فرانسیسی بغاوت" کی پیداوار تھی لیکن صدی کے اواخر کی رومانیت صنعتی انقلاب اور روز افزوں مادیت کا نتیجہ تھی جس سے اس میں فراریت کا عنصر غالب ہوتا گیا۔ چنانچہ پری رفلائٹ شاعروں

نے اپنے فن کو زمانے کے مسائل اور مطالبات سے چشم پوشی کر کے افسانوں کی دنیا کی چیز بنا دی اس سے یہ مراد نہیں کہ پری رفلائٹ تحریک سے انگریزی شاعری میں نئے عناصر کا اضافہ نہیں ہوا۔ راز ٹی نے اٹلی سے نئے اثرات قبول کئے جو ایلزابتھ کے دور کے بعد براؤننگ کے سوا کسی دوسرے انگریزی شاعر نے نہیں کیا تھا۔ سوئنبرن نے یونان اور فرانس کے فن پاروں سے استفادہ کیا اور مارس نے کلاسیکی روایات واسالیب کے علاوہ آئس لینڈ کے قدیم رزمیہ افسانوں میں نئی روح پھونکی یہ عناصر اپنی جگہ قابل قدر سہی لیکن شاعری میں اس تحریک نے "جذبہ" کو "خیال" پر ترجیح دے کر رومانی شاعری کو اس کے انسانی صفات سے محروم کر دیا۔ اسی لئے پری رفلائٹ شاعروں میں نہ تو کوئی شاعر ورڈسورتھ کے پایہ کا فطرت نگار ہو سکا اور نہ شیلی اور بائرن کی طرح انسان دوست۔

راز ٹی : ۱۸۲۸ء سے ۱۸۸۲ء

راز ٹی نہ صرف پری رفلائٹ تحریک کا بانی اور سرگروہ ہے بلکہ تمام جدید جمالیاتی میلانات کا پیشرو بھی ہے۔ اس نے فن کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے اور "فن برائے فن" کے نظریہ کو مستحکم بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ راز ٹی نے اپنی شاعری کی بنیاد افادیت سے ہٹا کر جمالیاتی اور فنی نہج پر رکھی اسی لئے اگر اس کے یہاں براؤننگ اور آرنلڈ کی فکر پسندی کے خلاف ردعمل محسوس ہوتا ہے تو دوسری طرف مذہبی اور احساسی کیفیتوں کا خوشگوار امتزاج بھی ملتا ہے۔

ابتدائی دور میں راز ٹی انگریزی کے علاوہ اطالوی، جرمنی اور فرانسیسی شاعری سے بھی بہت متاثر تھا چنانچہ اس کے ابتدائی کلام میں رومانی داستانوں کے علاوہ مافوق الفطرت موضوعات بھی ملتے ہیں لیکن یہ شاعر کا اصل میدان نہیں تھا۔ رومانی شاعر کیٹس کا اثر اس پر گہرا رہا اس لئے راز ٹی نے احساسیت Sensuousness اور پیکر نگاری میں اپنا الگ مسلک اختیار کیا۔ اس عہد کے کلام میں My Sister's Sleep نہایت اہم شعری اکتساب ہے۔ اس نظم میں تفصیلات کو صحت اور فطرت سے ہم آہنگی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے ابتدائی نظموں میں سب سے زیادہ شہرت The Blessed Damozel کو نصیب ہوئی جو پری رفلائٹ شاعری میں شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ اس نظم میں ایک محبوبہ جو جنت میں پہونچ چکی ہے اپنے بالا خانہ سے اپنے عاشق کا بیتابی سے انتظار کر رہی ہے اور وہیں سے

اس کے حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی ہے یہاں امریکی شاعر اور افسانہ نگار پو Poe کے اثرات صاف نمایاں ہیں لیکن احتساسی اور وجدانی رنگ آمیزیاں رازٹی کی اپنی خصوصیات ہیں۔ اس دور کے کلام میں ہم رازٹی کو اپنے زمانے کی عام فکری و فنی فضا سے مختلف پاتے ہیں اور اخلاقی و روحانی مسائل سے بھی الگ۔ وہ اپنے دور کے سیاسی اور معاشرتی انقلاب سے بہت حد تک بے تعلق رہا اسی لئے اس کی رومانیت اس انسان دوستی سے عاری ہے جو رومانی دور کے فنکاروں کا خاصہ تھا۔ The Burden Of Ninevah میں وہ آرٹ گیلری کی زیارت کے بعد لندن کی کثیف مادیت اور افادیت پر نوحہ خوانی کرتا ہے۔ یہی فراریت اسے قدیم شاعری اور بالخصوص لوک گاتھاؤں کی طرف لے جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی چند نظمیں بالخصوص Sister Helen پرسی، اسکاٹ اور گوئٹے کے علاوہ اس کے ذاتی مطالعہ کی پیداوار ہیں۔

رازٹی کی شاعری کا دوسرا دور ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ہے جب اس نے The House Of Life کے عنوان سے سانیٹ کا سلسلہ پیش کیا۔ یہاں جدید رمزیت Symbolism کے ساتھ ہی ازمنہ وسطیٰ اور نشاۃ الثانیہ کے نقوش بھی واضح ہیں۔ جذباتی کشش اور وجدانی فکر کا امتزاج ان نظموں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہاں ہمیں محبت کی ابتدا، سپردگی کی مسرت اور ازدواجی زندگی کی سعادتیں ملتی ہیں جو انگریزی شاعری میں براؤننگ کی عشقیہ شاعری پر اضافہ ہیں۔ ان نظموں کی محرک مس سڈل Miss Siddel اور لیڈی مارس Lady Morris تھیں جن کے شعری عکس عارفانہ اور والہانہ انداز میں ملتے ہیں۔

اپنی شاعری کے آخری دور میں رازٹی پھر قدیم افسانوی موضوعات کی طرف متوجہ ہوا اور ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان Troy Town ، The White Ship اور King's Tragedy جیسی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں جنسی شعور کی آزادی عریانی کی حد تک پہونچ گئی ہے جس کی بنا پر نقادوں نے اس قسم کی شاعری کو The Fleshly School Of Poerty کی پیداوار کہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ رازٹی فکری اور فنی طور پر حسن معنی سے زیادہ حسن صورت کا قائل رہا۔ اسی لئے اس کی شاعری میں رنگ و

آواز کی ہم آہنگی تو ملتی ہے لیکن صالح انسانی جذبات اور حیات و کائنات کا عرفان نہیں ملتا
ان کمزوریوں کے باوجود راز ٹی جدید شاعری اور بالخصوص جمالیاتی تحریک کے بانیوں میں شمار
کیا جاسکتا ہے۔ اس کے فن میں ایک طرح کی صداقت ملتی ہے جو عہد وکٹوریہ کی خود آسودگی
کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔ نقادوں نے اس کے اسلوب بیان اور ازدواجی محبت کی تمام تر
کیفیات کی عکاسی اور احساسیت کی دل کھول کر داد دی ہے۔

ولیم مارس ۱۸۳۴ء سے ۱۸۹۶ء

ایک مصنف، فنکار اور مصلح کی حیثیت سے مارس اپنے معاصرین تو کیا پری رفلائٹ
برادری میں بھی سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں جمالیاتی تحریک کے باوجود خالص
انگریزی اثرات اور محرکات کی بھی کارفرمائیاں ہیں۔ شاعری میں وہ کیٹس سے زیادہ اسپنسر
کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ اس کے یہاں بھی ایک قسم کی مردانگی اور فنی نفاست ملتی ہے۔

۱۸۵۱ء میں آکسفورڈ سے مذہبی تعلیم میں ناکامی کی وجہ سے مارس مصوری کی طرف
مائل ہوا۔ اس سے پہلے اس نے فن تعمیر میں بھی دلچسپی لی تھی۔ ان فنون میں دلچسپی سے اسے بہت
جلد اس کا احساس ہوگیا کہ اعلیٰ ترین فنی اکتسابات اپنے کام میں انہماک اور سچی خوشی سے ہی ممکن ہیں۔
جو سرمایہ دارانہ نظام میں ناممکن ہیں۔ اس عقیدہ نے اسے اشتراکی بنا دیا اور اس کا اثر اس تمام
شاعری پر رہا۔

ابتدائی دور میں مارس تصوریت کی تحریک کے احیاء میں شریک رہا اور رومانی ادب کا
دلدادہ۔ اس نے کارلائل اور رسکن کا مطالعہ کیا۔ ٹینی سن اس کا محبوب شاعر تھا اور راز ٹی کے یہاں
بھی اسے ایک نئی کیفیت محسوس ہوئی **The Defence Of Guiasvere**
میں اگرچہ موضوع عہد وسطیٰ سے متعلق ہے۔ لیکن اسلوب بیان میں خالص پری رفلائٹ رنگ
نمایاں ہے۔ مارس نے عہد وسطیٰ اور اس کے افسانوی اور رومانی خوابوں کو بے درد حقیقت پسندی
کے ساتھ پیش کیا۔ اس کے غازی عہد وکٹوریہ کے شرفا نہیں بلکہ پیشہ ور جنگ باز ہیں جو انتقام،
محبت، دولت یا محض نام و نمود کے لئے لڑائی کرتے ہیں۔ اس نظم کے ساتھ اگر مارس کا تجرباتی دور
ختم ہوتا ہے تو **Earthly Paradise** اور **Jason** سے نئے دور کا

آغاز بھی ہوتا ہے۔ ان نظموں میں اعتدال اور توازن کے ساتھ غنائیت اور وسعتِ خیال وہ خصوصیات ہیں جو ہمیں چاسر اور اسپنسر کی یاد دلاتے ہیں۔ جدید تہذیب کی مادیت سے بیزار ہو کر مارس نے عہدِ وسطیٰ کی زندگی میں پناہ لی جہاں اسے ایک قسم کی جدت اور تازگی محسوس ہوئی۔ ان نظموں میں موضوعات کی رنگا رنگی کے باوجود رومانی عنصر اور غمگین خوابناکی مشترک ہیں۔ "فردوسِ ارضی" Earthly Paradise مارس کا شاہکار ہے جس میں شمالی ممالک کے سیاح کسی ایسے ملک میں اتر پڑتے ہیں جہاں یونانی نسل کے لوگ آباد ہیں۔ میزبان اور مہمان ایک دوسرے کی ضیافتِ طبع کے لئے یونانی اور عہدِ وسطیٰ کی کہانیاں سناتے ہیں۔ ان چوبیس کہانیوں میں بارہ کلاسیکی ہیں اور بقیہ بارہ عہدِ وسطیٰ سے متعلق ہیں۔ ان کہانیوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان میں وہ دلپذیری، تنوع، مزاح اور دلکشی نہیں ملتی جو چاسر کے منظوم داستانوں کا خاصہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی فنی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ داستانیں عہدِ وکٹوریہ کی کثیف مادیت کا ردِ عمل ہیں اور یہاں ہمیں ذہنی فراریت اور خواب و خیال کی حسن آفرینیوں میں پناہ اور سکون ملتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ مارس کی تاثراتی سحرکاری چاسر کے بس کی بات نہ تھی۔

مارس کی طبیعت میں انحطاطی رجحانات کے ساتھ خالص مردانہ جذبات بھی موجود ہیں۔ چنانچہ المانی اور اسکنڈی نیوی اساطیر سے اس کی دلچسپی اس کی بین دلیل ہے۔ اس شمالی ادب میں اسے ایک طرح کی تیز و تند جذباتیت، وحشیانہ سادگی اور غیر مہذب تخیل کا غلبہ نظر آیا۔ مارس نے نہ صرف آئس لینڈ کی سیاحت کی بلکہ وہاں کے قدرتی مناظر سے بھی اس نے اثر قبول کیا۔ اس سلسلہ میں اس کی مشہور تصنیف The Story Of Sigurd The Volsung باوجود تقلیدی رنگ کے اہم اکتساب ہے۔ مارس نے موضوع کی مناسبت سے ایسا اسلوب بیان اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے نظم میں صداقت اور فطری بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں ماضی کے رومانی تصور سے ایک لامحدود وسعت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ عہدِ وکٹوریہ کی خود آسودگی اور مادیت کے خلاف مارس نے عہدِ وسطیٰ کی معصوم رومانیت اور حسن پرستی کو ترجیح دی۔ A Dream Of John Ball اور News From Nowhere میں اس نے اپنے اشتراکی نظریہ کی وضاحت کی ہے۔

اور اس نظام کی خوش آیند برکتوں کا مژدہ سنایا ہے۔ ان نثری افسانوں کے علاوہ Poems By The Way میں بھی یہی میلان غالب ہے۔ مارس محض ایک شاعر اور فنکار ہی نہیں بلکہ مختلف حیثیتوں سے اپنے معاصرین میں ممتاز ہے اور اپنے خلوص اور تخلیئت کی بدولت سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

"سوئنبرن" ۱۸۳۷ء سے ۱۹۰۹ء

عہد وکٹوریہ میں جس طرح آرنلڈ سے جدید کلاسیکیت کا احیاء ہوا اسی طرح سوئنبرن کی شاعری سے اس جدید رومانیت کی تکمیل ہوئی جس میں یونانی اور کلاسیکی جمال پرستی کے بہترین عناصر کارفرما ہیں اور جس کی بنیاد پری رفلائٹ برادری کے ہاتھوں پڑی۔ سوئنبرن کا مقام انیسویں صدی کے اواخر کے شاعروں میں اہم ہے۔ اس کے یہاں عہد وکٹوریہ کی شاعری کے صالح عناصر کے ساتھ رومانیوں کا پرجوش تخیل اور پرشباب باغیانہ میلان بھی ملتا ہے۔ اس کی نظموں میں بائرن، شیلی، کیٹس اور لینڈر کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے اور رومانی آزادی کا جذبہ اور مذہبی کٹرپن کے خلاف بغاوت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سوئنبرن شخصی آزادی اور "فن برائے فن" کا مجتہد بھی ہے۔ اس کی رومانیت اور جمال پرستی میں انگریزی شاعروں کے علاوہ فرانسیسی مشاہیر بالخصوص وکٹر ہیوگو Victor Hugo اور بودلیئر Baudelaire کا بھی حصہ ہے چنانچہ اسکی غنائی نظموں میں باشعور سقیم کیفیت اور محزونیت، تاثراتی انداز بیان اور رمزیت انھیں شاعروں کی دین ہے۔

سوئنبرن کے ابتدائی ڈرامے The Queen Mother اور Rosomond کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئے لیکن Atlanta In Calydon اور اس کے شعری مجموعہ Poems & Ballads سے شاعر کو بڑی شہرت ملی۔ Atlanta In Calydon یونانی المیہ کے نمونہ پر لکھی گئی ہے۔ اور اپنی بلیغ موسیقیت حزنیہ لے اور غیر متوازن رومانیت کے باعث ممتاز ہے سوئنبرن نے کورس کے ذریعہ انسانی زندگی اور حیات و کائنات کے جن رموز کا انکشاف کیلیے ان میں

وہی ویژن ہے جو بائرن اور شیلی کا خاصہ تھا۔ اس ڈرامہ کے ساتھ سوئنبرن کا شعری مجموعہ انگلستان کے عوام کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ ان نظموں میں رومانیت اور احساسی کیفیت عریانی کی حد تک پہونچ گئی ہے لیکن سوئنبرن نے اپنی وکالت یوں کی کہ یہ نظمیں خالص "ڈرامائی" ہیں اس لئے یہ خیالات، اس کے اپنے نہیں ہو سکتے مگر اس دلیل کے باوجود یہاں اس کی جنسی خواہشوں کا غیر متوازن اظہار کسی صورت میں قابل قبول نہ ہو سکا۔

پروفیسر گریرسن نے سوئنبرن کی شاعری کی دو اہم خصوصیات بتائی ہیں ——— احتساسی جذبہ اور بطل پرستی Hero Worship اس کے پہلے مجموعہ میں لینڈر کا مرثیہ ہے اور اطالوی قوم پرست میزنی Mazzini سے عقیدت بھی نمایاں ہے۔ اسی طرح Songs Before Sunrise اطالوی جمہوریت کے اس حسین خواب کی یادگار ہے جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ یہ مجموعہ سوئنبرن کے جذبۂ حریت کا بہترین مرقع ہے لیکن اس کا تصور آزادی مجرد قسم کا ہے جس میں قومی خود اختیاری اور جمہوری اداروں کو خاص جگہ دی گئی ہے۔ اسی لئے اس نے انگلستان کو "آزاد اور غیر آزاد" ——— Free & Not Free کہا ہے۔ یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ انسانی آزادی کا یہ علمبردار اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ورڈسورتھ کی طرح برطانوی استعماریت کا حامی ہو گیا اور اس نے آئرستانی جمہوریت پسندوں اور ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) کے وطن پرستوں کی شدید مخالفت کی۔ اس مجموعہ میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ نظمیں ہیں جن میں شاعر نے اپنے موضوع اور اسلوب کا جواز پیش کیا ہے اور جن میں اٹلی کی آزادی سے زیادہ عام انسانی ترقی کا خاکہ موجود ہے جو مذہبی قدامت پرستی اور سائنسی مادیت کے باوجود صدی کے اواخر میں تشکیل پا رہا تھا۔ ان مجموعوں کے بعد سوئنبرن کی شاعری، اور اس کے افکار میں کسی قسم کے اضافہ کا امکان نہ رہا۔ اگرچہ اس نے ان کے بعد بھی کئی غنائی، ڈرامائی اور بیانیہ نظمیں لکھیں لیکن ان میں وہ زیادہ تر اپنے پچھلے خیالات و تاثرات کو ہی دہراتا رہا۔ اسی طرح اس نے بودلیئر کی موت پر مرثیہ لکھا اور کارلائل اور ٹینیسن کی شان میں قصیدے بھی کہے لیکن ان نظموں سے انگریزی شاعری میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ ہوا۔

سوئنبرن کے کلام میں ڈرامائی اور رومانی کیفیتوں کے علاوہ غنائیت اس طرح رچی بسی ہے کہ اس کی مثال شیلی کے علاوہ کسی اور انگریزی شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ اسکا ذہن فلسفیانہ اور مفکرانہ نہیں تھا لیکن اس کے یہاں فکری عناصر کا فقدان نہیں۔ اسکی ڈرامائی بیانیہ اور غنائی نظموں میں محنت کی مسرت، زندگی کی عظمت، موت کی ہمہ گیری اور عشق و محبت کی آفاقیت ہر جگہ نمایاں ہے۔

عہد وکٹوریہ کی نثر

عہد وکٹوریہ کی عام سیاسی اور اقتصادی زندگی میں افادی اخلاقیت کے اثرات ۱۸۳۰ء سے ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ رومانیت کے زوال کے ساتھ سماجی اور سیاسی استحکام اور معاشی کفالت کے لئے ایسے نظریے کی مقبولیت قدرتی بات تھی۔ اگرچہ اس دور کے معاشرتی نظام کا مرکزی فلسفہ "افادیت" ہے لیکن ادب میں افادیت کے علاوہ بھی اور بہت سے محرکات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ڈارون کے فلسفۂ ارتقا، اسپنسر کی سائنسی عقلیت، آرنلڈ کی کلاسیکیت، کارلائل کی تصوریت اور رسکن کی جمالیات سے دلچسپی اس دور کے نثر کی جامعیت کی ذمہ دار ہے۔

فلسفیانہ نثر

جان اسٹورٹ مل J. S. Mill عہد وکٹوریہ کے عظیم دماغوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ عرصۂ دراز تک ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ رہا اور اس دوران میں اس نے عصری فلسفۂ عقلیت سے بڑا اثر قبول کیا لیکن اس کی زندگی اور اس کی تصانیف کے درمیان کچھ تناقص محسوس ہوتا ہے۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ باوجود تمام عقلیت اور افادیت کے اس کے اندر رومانیت کی ایک رگ بھی کام کر رہی تھی۔

مل حقائق کی تلاش کے لئے عقل کو اولین ذریعہ تصور کرتا تھا لیکن عقلیت کے ساتھ ساتھ اس کے یہاں "احساسیات" کا بھی میلان پایا جاتا ہے۔ مل ابتدا میں بنتھم سے متاثر تھا لیکن بہت جلد اس نے خود اپنا فلسفۂ زندگی مرتب کر لیا۔ وہ روز اول سے ایک ذہنی اضطراب

اور ایک ناقابل اظہار اندرونی ناآسودگی محسوس کر رہا تھا جس کی تسکین عقلیت اور افادیت سے نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسی اندرونی کرب نے اس کو ورڈسورتھ کی شاعری کی طرف متوجہ کیا جس کی متصوفانہ رمزیت سے اس کو بڑی راحت ملی۔ اس طرح اس نے ورڈسورتھ اور کولرج کی ماورائی رومانیت اور بنتھم Bentham کی "افادیت" کے درمیان ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

مل کی تصانیف کا درجہ انگریزی ادب میں بہت بلند ہے۔ اس نے قدیم اور جدید خیالات کے مطالعہ سے ایک نئے مستقبل کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا۔ اس کے یہاں تجزیاتی استدلال سے زیادہ تخئیلی بصیرت کام کرتی نظر آتی ہے اسی لئے اس کے نظریات میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی تعمق کا احساس ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک معلم اخلاق کے مل "افادیت" کے حدود کے اندر رہتا ہے لیکن وہ ان کو نئی معنوی وسعتیں بھی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک روحانی مسرت کا واحد ذریعہ زندگی میں اخلاقی نظام ہے لیکن خلق اللہ کی خدمت اور انسانی تہذیب کی کوشش تمام حسی مسرتوں سے زیادہ قابل قدر ہیں۔ عمرانی فلسفہ میں مل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس کے نزدیک افادی انقلاب کا لازمی نتیجہ جمہوری آزادی ہے جو جذبات و خیالات کے آزادانہ اظہار اور جمہور کے معاشی و معاشرتی اشتراک کا دوسرا نام ہے۔ مل نے اپنے مقالہ "آزادی" On Liberty میں اس مسئلہ پر مدلل بحث کی ہے۔

تاریخ نگاری

انیسویں صدی کے اوائل ہی میں رومانی تحریک کے اثر سے عوام کو قومی مسائل کے ساتھ دلچسپی ہونے لگی تھی جس سے تاریخ نگاری کو ایک نئی تحریک ملی۔ عہد وکٹوریہ میں افادی عقلیت کے نتائج میں ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ تاریخ کا ایک نئے زاویے سے مطالعہ کیا جانے لگا اور مورخین ملک اور قوم کی ترقی اور زوال کے اسباب پر بحث و تمحیص کو ضروری سمجھنے لگے۔ اس مطالعہ کی بنیاد جبر یعنی تاریخی لابدیت کے تصور پر تھی۔ اس تصور سے اس خیال کو کہ افراد اور اقوام دونوں اپنے اعمال کے علاوہ خارجی حالات و اسباب سے بھی متاثر ہوتے ہیں، مزید تقویت ملی۔

عہد وکٹوریہ کے انگریز مورخوں میں میکالے (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۹ء) اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ میکالے کا شمار قدامت پرستوں میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تحریروں میں کہیں کہیں آزاد خیالی کا بھی احساس ہوتا ہے مگر یہ آزاد خیالی اس کے لئے نئی نہیں ہے بلکہ ان نئے اخلاقی اور معاشرتی میلانات کا غیر شعوری اثر لئے ہوئے ہے جو اس دور میں ابھر رہے تھے۔ تاریخ نگاری میں عقلی دلائل سے کام لینا اور ہر لمحہ افادی نقطۂ نظر کو سامنے رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ میکالے اپنے تمام رجعتی میلانات کے باوجود اپنے زمانے کے جدیدیت کے شعور کو نہ دبا سکا۔

میکالے کے یہاں نظم و ضبط کا تصور دوسرے عوامل کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے۔ وہ حقیقت کو نظم و ضبط کے تابع سمجھتا ہے اہذا اس لئے اس کے نزدیک فنکار اور ادیب مورخین سے زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ مورخ کا منصب غائر تفتیش اور بے لاگ تفحص اور تنقید کے ذریعہ ایک لازمی نتیجہ پر پہونچنا ہے۔ میکالے کی بیشتر تخلیقات میں یہ خصوصیت ملتی ہے۔ اس کی تحریروں میں منطقی دلائل کے باوجود انفرادی خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کی بنا پر اکثر حقائق کو غلط طریقہ پر پیش کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ اپنے خطیبانہ اور ڈرامائی انداز بیان سے میکالے مورخ سے زیادہ انشاپرداز ہوتا ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ اس کے ہمعصروں میں کوئی مورخ اس سے بہتر طریقہ پر اپنے مواد کو تاریخی وسعت نہیں دے سکا اور نہ کوئی اس کی مقبولیت کو ہی پہونچ سکا۔

اگرچہ میکالے دستاویزوں اور ماخذوں سے زیادہ اپنی جبلی منطق سے کام لیتا ہے جس سے اس کے بیشتر خاکے تخیُلی رنگ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے ماحول کی عکاسی میں پوری طرح کامیاب ہے۔ اس نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی انگلستان کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں میکالے کے انشائیے بھی اس کی تاریخ نگاری سے کم اہم نہیں۔ ان میں اس کے تخئیل مزاج کی پوری آزادی کے ساتھ ظاہر ہونے کا موقع ملتا ہے، لیکن میکالے کی اصل اہمیت بحیثیت

ایک مورخ کے ہی ہے اور تاریخ نگاری میں وہ اپنے معاصرین بکل Buckle ، فروڈ Froud ، فری مین Freeman اور گرین Green سے ممتاز ہے۔

سائنس | عہد وکٹوریہ میں سائنس کو جو ترقی ہوئی اس میں سائنس دانوں کے تجربے کے ساتھ ڈاروِن ، اسپنسر اور ہکسلے کی تحریروں کو بھی بہت دخل ہے۔

ڈاروِن Darwin اڈنبرا اور کیمبرج میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے ہی علوم فطرت سے کافی دلچسپی رکھتا تھا ۔ اس نے اپنے عمیق مطالعہ اور ذاتی مشاہدوں اور تجربوں سے نظریہ ارتقا Theory of Evolution مرتب کیا جس نے فکر کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ۔ اگرچہ ڈاروِن کی تصانیف براہ راست ادب میں نہیں شمار کی جاسکتیں ۔ لیکن انیسویں صدی فلسفہ اور ادب پر اس کی تحقیقات کا اس قدر گہرا اثر پڑا ہے کہ ہم انھیں نظر انداز نہیں کرسکتے ۔ اس کی تصانیف فکری تاریخ میں بلاشبہ بلندترین مقام رکھتی ہیں ۔

ڈاروِن کے نزدیک حقیقت کوئی ماورائی شے نہیں بلکہ خالص مادی دنیا کے تجربات سے تعلق رکھتی ہے ۔ وہ کم و بیش بیس سال تک حقیقت اور مادہ اور کائنات کے اصل پہ غور کرتا رہا ۔ اس کی کتاب اصل انواع The Origin of Species بنی نوع انسان کے ابتدا ، اس کی رفتار اور اس کی درجہ بدرجہ ترقی کی مسلسل تاریخ ہے ۔ اس نے روایات اور اساطیر سے الگ ہو کر انسان کو ایک حیاتیاتی تاریخ Biological History کی مخلوق ثابت کیا ہے ۔ اس نظریہ کی بنیاد تین ارکان پر ہے " جہد للبقا " Struggle For Existence "انتخاب فطری" Natural Selection اور بقائے اصلح Survival of The Fittest ڈاروِن نے اپنے انقلابی تصورات سے مذہب اور عقیدہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور اگرچہ عوام اور خواص نے اس کی تضحیک بھی کی لیکن اس کی تردید آسان نہیں تھی ۔

ہربرٹ اسپنسر (۱۸۲۰ء سے ۱۹۰۳ء) بہت حد تک ڈارون سے مختلف ہے وہ سائنس داں سے زیادہ فلسفی اور حکیم ہے اور اس کا نظام فکر قریب قریب ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس کی تربیت جدید سائنسی طریقہ پر ہوئی جس سے اس کے اندر مادی موجودات کا پورا پورا شعور ملتا ہے لیکن فلاسفہ کی طرح اسکا طبعی میلان "تجرید" Abstraction اور "تعمیم" Generalization کی طرف ہے۔

اسپنسر طبیعاتی اور سماجی حقائق کا بہت بڑا عالم تھا اور ان کی نظم اور ترتیب کے ساتھ پیش کرنے میں اس کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ اسکی تصانیف کا دائرہ بھی وسیع اور متنوع ہے۔ ۱۸۵۰ء میں Social Statics لکھنے کے بعد اس نے ۱۸۵۵ء میں "نفسیات کے اصول" اور ۱۸۶۲ء میں "ابتدائی اصول" تصنیف کیں۔ ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۷ء کے درمیان "حیاتیات کے اصول" ۱۸۷۶ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیان "عمرانیات کے اصول" اور ۱۸۷۹ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان "اخلاقیات کے اصول" لکھے گئے۔ ان کتابوں کے علاوہ اسپنسر کے مختلف مضامین تعلیم، سائنس اور عمرانیات کے موضوع پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ اس نے فلسفۂ ارتقا کا اطلاق مختلف موضوعات پر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کی تحقیقات ناہموار ہیں۔ اپنی "نفسیات" میں اس نے انسانی تجربات اور مشاہدات کو نظم اور ضابطہ کے تحت لانے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں کے افکار و خیالات کو اپنے نظام فکر میں جذب کر لینے کا ملکہ اسپنسر کے یہاں سب سے زیادہ ہے یہاں تک کہ مستعار افکار اس کے اپنے افکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہکسلے Huxley ایک حد تک اسپنسر کا رفیق کار کہا جاسکتا ہے۔ اس نے بھی علم و حکمت کی اشاعت و توسیع میں اہم خدمات انجام دیے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے یہاں فکری اجتہاد کے ساتھ اسلوب اظہار کی توانائی بھی پائی جاتی ہے۔ ڈارون اپنے انقلابی نظریات کے باوجود اپنے دور کے عملی اور معاشرتی معاملات و مسائل سے الگ تھلگ رہا۔ اسپنسر بھی اپنے مخصوص نظام فکر میں محو رہتا تھا لیکن ہکسلے نے سائنس کو روزمرہ زندگی کا جز قرار دیا۔ اس نے علوم کو عام انسانی سطح پر لاکر بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

ابتدا میں بکستے بھی کم وبیش الحفیس خیالات کا حامی تھا جن کی اشاعت ڈاروِن اور اسپنسر کر رہے تھے لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنا الگ فلسفۂ حیات مرتب کر لیا۔ اسپنسر کی طرح وہ "لامعلوم" کی تاریکیوں میں بھٹکنا چاہتا تھا اور ڈاروِن کے نظریات کا ہی اندھا مقلد تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر تمام دلائل سے روح کو مادّہ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف ہم ایسے ہی دلائل کی بنا پر مادّہ کو بھی روح میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس کے ان خیالات کی بنا پر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بکستے نہ تو اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کی طرح خالص مادہ پرست تھا اور نہ محض روائتی مذہب کا قائل۔ وہ ایک سے زیادہ معنوں میں جدید عقاید کا پیغمبر ہے۔ اس نے اخلاقی مسائل اور سماجی امور پر جو رائیں پیش کی ہیں ان کا مطالعہ فلسفہ اور عمرانیات کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔

ادبی تنقید عہد وکٹوریہ کی نثر میں جہاں فلسفہ، تاریخ اور سائنس پر کافی کام ہوا وہاں ادبی تنقید کا میدان بھی خالی نہیں رہا۔ اس سلسلہ میں رومانی نقادوں بالخصوص ورڈسورتھ اور کولرج کے بعد میتھو آرنلڈ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سے پہلے کسی نقاد نے تنقید کی بنیاد فکری اصول پر نہیں رکھی تھی لیکن چونکہ آرنلڈ خود شاعر تھا اور اپنے اندر بھرپور شعری صلاحیتیں رکھتا تھا اس لئے اس نے جو تنقیدی نظریات اور اصول قائم کئے انمیں اعتماد اور قطعیت کا احساس ہوتا ہے۔

انگریزی ادب کی تاریخ میں آرنلڈ کا مرتبہ ہمیشہ مسلم رہیگا۔ وہ نہ صرف شاعر اور نقاد تھا بلکہ اپنے زمانے کے فکری ثقافت کے پیغمبروں میں بھی شامل کیا جاتا تھا۔ وہ تنقید کو روحانی عمل اور انسانی شخصیت کا لازمی حصہ بتاتا ہے اور انسانی ذہن کو عقائد اور عادات کا تابع سمجھتا ہے لیکن اس مذہبی ادّعائیت Dogmatism کے باوجود اسکا مطمح نظر ذہن کی صفائی اور خلوص پر مبنی ہے۔ آرنلڈ نے ادبی تنقید میں وضاحت کے ساتھ اصول و مبادیات سے بحث کی اور اس کے معیار مقرر کئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ رومانی نقادوں کے بعد آرنلڈ سے اس صالح اور متوازن تنقید کا احیا ہوا جو سڈنی اور ڈرائیڈن کے بعد دوسری طرف جا پڑی تھی۔ بعض اعتبارات سے تو آرنلڈ اپنے پیشروؤں پر بھی سبقت لے جاتا ہے کیونکہ اس سے پہلے کسی نقاد نے اس وضاحت اور تسلسل کے ساتھ تنقیدی اصول کا جائزہ نہیں لیا تھا۔

میتھو آرنلڈ بہت حد تک کلاسیکی مدرسہ کا مہذب اور جدید نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسکی تنقیدوں میں حسن کو عقل کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے، کے یہاں اکثر قدماء کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یونانی اور اطالوی تنقید کے علاوہ فرانسیسی تنقید کی قدروں اور نزاکتوں کا بھی شعور رکھتا ہے جسکی جھلک اسکی تحریروں میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس کلاسیکی تربیت کے باوجود آرنلڈ کی تنقیدی رائیں، اکثر ذاتی میلانات کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس نے ذاتی اور تاریخی تنقید نگاری کو حقیقی اور کلیاتی تنقید نگاری سے بدلنے کی کوشش کی مگر شیلی جیسے شاعر کے ساتھ وہ انصاف نہ کر سکا اس لئے کہ وہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کی بنا پر شیلی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ آرنلڈ کی تنقیدوں میں اپنے زمانہ کی کثیف مادیت کے خلاف ردعمل بھی محسوس ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف ماضی کی سعادتوں کو واپس لانا چاہتا ہے بلکہ اپنے دور کی جہالتوں اور نحوستوں کا بھی اپنے طور پر مقابلہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں روحانی قوت اور قدماء کی تقلید کی تلقین کرتا ہے اور ادب کی افادیت پر زور دیتا ہے۔

آرنلڈ کے یہاں کوئی انقلابی میلان نظر نہیں آتا اس لئے کہ تمام "ترقی پسندی" کے باوجود وہ قدامت پرستی سے بالکل معریٰ نہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے مزاج کو اچھی طرح پہچانتا تھا اسی لئے اسکے ادبی اور ثقافتی تحریروں میں اصلاحی جذبہ کارفرما ہے۔ دور حاضر کا مشہور شاعر اور نقاد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ مدرسہ آرنلڈ ہی کا پروردہ ہے۔

تصوریت اور اس کا اثر عہد وکٹوریہ کے تمام ادبی رجحانات عقلی یا سائنسی تحریکوں اور دوسری طرف تصوریت Idealism کے احیاء کے نتائج ہیں۔ موخرالذکر تحریک، ادبی نقطۂ نگاہ سے اہم ہونے کے باوجود کوئی باقاعدہ جداگانہ تحریک نہیں تھی بلکہ مادیت کے غلبہ کا لازمی ردعمل تھی۔ اس کے جراثیم رومانی دور میں موجود تھے لیکن موثر قوت کی صورت میں یہ انیسوں صدی کے نصف آخر میں نمودار ہوئے۔ چنانچہ ہم کارلائل کے فکری نظام، ڈکنس کی افسانہ نگاری، آکسفورڈ کی مذہبی تحریک اور رسکن کے جمالیاتی اور معاشرتی پیغام میں وہی عنصر پاتے ہیں جو ورڈسورتھ اور شیلی کا ترکہ تھا۔

کارلائل (۱۷۹۵ء تا ۱۸۸۱ء) کا شمار عہد وکٹوریہ کے ممتاز ترین تصوریتوں میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ادب اور فلسفہ کا کوئی طالب علم اس کی اس حیثیت سے انکار

نہیں کر سکتا۔ بچپن سے اسے ایسے حالات سے گزرنا پڑا کہ وہ اپنی داخلی اور اندرونی کائنات کا سہارا لینے کے لئے مجبور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی سائنس، فلسفہ اور ادب کے مطالعہ نے اس کا ایک خاص مزاج بنا دیا تھا جس سے وہ اپنے زمانہ کی سطحی خود آسودگیوں سے متنفر ہوتا گیا۔ حیات و کائنات کے متعلق اس کے نظریات پر جرمن حکماء کے خیالات و افکار اور جرمن تصوریت کی چھاپ ہے۔ وہ بہت حد تک ہرڈر، فختے، شیلنگ اور گوئٹے کے مدرسہ کا پروردہ ہے۔ اس کی کتاب Sartor Resartus (1836) جرمن اثرات کی بہترین نمائندہ ہے۔ کارلائل کی یہ کتاب اپنی نوعیت کا بے مثل کارنامہ ہے۔ اس میں فکر و ادراک کے گوناگوں پہلو واضح ہوتے ہیں۔ ہیرو کی شخصیت مصنف کی اپنی تصویر ہے جس میں اس کی روحانی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ اپنی "ذات" سے مریضانہ اور خود پرستانہ لگاؤ کے باعث ہیرو کو "دائمی نفی" Everlasting No سے لے کر "دائمی اثبات" Everlasting Yea تک کی منزلوں میں تخئیلی طور پر روحانی سکون ملتا ہے۔ کارلائل کو اپنے سماج کے روحانی اضطراب اور داخلی انتشار کی شدت سے احساس تھا اسی لئے وہ دولت، ہوس پرستی اور قیصریت کی بجائے روحانیت، اخلاق اور مذہب کی تلقین کرتا ہے جس سے انسانیت کا نیا جنم ممکن ہے۔

کارلائل کے فلسفۂ حیات میں سب سے دلچسپ چیز اس کی "بطل پرستی" Hero - worship ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادب، مذہب اور سیاست کی باگ ڈور معدودے چند اشخاص کی ملکیت ہے جو فوق الانسان یا انسان کامل Super - man کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر عوام کو بے راہ روی سے بچا سکتے ہیں۔ حضرت محمدؐ جیسے پیغمبران دین اور شکسپیئر جیسے ادیب اور فنکار ہی کارلائل کے بقول انسانیت کے جوہر ہیں اور انھیں کو قیادت کا شرف حاصل ہونا چاہئے۔ باقی بنی نوع انسان کا منصب یہ ہے

کہ وہ ان برگزیدہ شخصیتوں کی پیروی کریں اور معاشرہ میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھیں۔ اپنی تاریخی تصنیفوں میں کارلائل اپنے اس عقیدہ سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس کے نزدیک فرانسیسی انقلاب کی ناکامی محض اس بنا پر ہوئی کہ اسے کوئی صاحب ضمیر قائد نہیں مل سکا۔ جدید معاشرہ میں بھی وہ خیر و شر کی مسلسل قوت آزمائی سے نالاں ہے۔ اور سائنس اور سرمایہ داری کی برکتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جدید سماج کی نجات ان خدا کے بندوں کے ہاتھ میں ہے جو نام نہاد مادی ترقیوں اور مشینی جبریت کے خلاف آواز اٹھائیں اور مذہب اور اخلاق اور رواداری کو راہ دیں۔

جمالیات عہد وکٹوریہ کے مادی اور سائنسی سماج میں حسن و جمال سے بے اعتنائی کی بنا پر بدصورتی اور بے اسلوبی کے خلاف بھی ایک محاذ قائم ہوا جو اخلاقی تصوریت انسانی اقدار اور مذہبی عقائد کی مختلف تحریکوں کا نقطہ ارتکاز تھا۔ صنعتی سماج نے اپنے معیار حسن "کمیت" اور "تعداد" پر رکھا اس لئے اس تہذیب سے حسن کا تصور رفتہ رفتہ مفقود ہونے لگا۔ فطرت کی حسن کاریوں پر انسانی مشینوں اور صنعتوں نے غاصبانہ حملے شروع کر دئے تھے جس کے خلاف رومانی شاعروں اور تاثراتی مدرسہ کے مصوروں نے آواز بلند کی۔ پری رفلائٹ اسکول اور رسکن کی جمالیاتی تحریک کو ہم اسی تاریخی پس منظر میں سمجھ سکتے ہیں لیکن رسکن کے مسلک حسن پر تبصرہ سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جمالیات کے دو مختلف نظریوں پر روشنی ڈالی جائے۔ حسن کا تصور حسی بھی ہو سکتا ہے اور اخلاقی بھی کیٹس کی جمال پسندی اور رفلائٹ شعرا کی حسن پرستی اپنی احساسیت کے باعث جسمانی زیادہ ہے لیکن رسکن کا تصور جمالی اور عارفانہ ہے وہ کیٹس اور رزانٹی سے زیادہ ورڈسورتھ اور بلیک سے اپنے کو نزدیک پاتا ہے۔

رسکن (۱۸۱۹ء۔ ۱۹۰۰ء) کا مذاق ابتدا سے ہی نکھرا ہوا تھا۔ فطرت اور فن کے بہترین شہ پاروں کے مطالعہ سے وہ فن کا پرستار ہو گیا۔ اس کے

جمالیاتی تصورات پر پری رفلائٹ مدرسہ کے اثرات کے ساتھ ٹرنر Turner کی داخلیت اور مسیحیت کا رنگ بھی غالب ہے ۔

رسکن کا ذہن چونکہ ابتدا سے ہی جمالیات کو اخلاق کے آئینہ میں دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا اس لئے وہ جمالیات سے عمرانیات کی طرف لازمی طور پر متوجہ ہوا۔ اس نے جب یہ محسوس کیا کہ تقیل مادی ترقی سے انسان مذہب اور اخلاق کے راستوں سے منحرف ہوتا جا رہا ہے تو وہ ان قوتوں کے خلاف جہاد پر آمادہ ہو گیا۔ سماجی صحت کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ ہماری بھلائی مادی ترقی سے زیادہ انصاف، رواداری اور انسانیت کے اصول پر مبنی حکومت سے ہی ممکن ہے۔ جہاں زندگی اور فن جمالیاتی کیفیات میں رچ بس جائے ۔ یہاں پہونچ کر رسکن بھی کارلائل کا ہمنوا ہو جاتا ہے اور اپنے دور کی مادیت اور پارلیمانی نظام کی نحوستوں کی مذمت کرتا ہے۔ اپنی شاہکار کتاب "Unto This Last" میں رسکن نے دولت کے خاص اقتصادی تصور کا پردہ فاش کیا ہے اور پھر "دولت" کی انسانی اصلیت اور اس کی انسانی قدر سے بحث کی ہے ۔

رسکن کا معاشی نقطہ نظر بہت حد تک مبہم اور جذباتی تھا۔ اس نے خاندان، مذہب اور اخلاق کو آئیڈیل قرار دے کر سماج کو غریبی، بیماری اور دوسری خرابیوں سے بچانے کی کوشش کی لیکن کارلائل کی طرح اس کا پیغام بھی صدا بصحرا رہا۔ اس کے ان اصلاحی افکار کا اتنا فائدہ ضرور رہا کہ بڑے سرمایہ داروں نے اندھا دھند خود غرضی چھوڑ کر پیداوار کے دوسرے اراکین کے حقوق کو بھی تسلیم کیا اور بہت سی حکومتوں نے بھی قوانین کے ذریعہ مزدوروں کے حقوق کی ضمانت لی۔ رسکن کا اثر ٹالسٹائے Tolstoy اور مہاتما گاندھی کی معاشیات پر بھی گہرا پڑا۔ رسکن کے کارنامے آج بھی انسانی تہذیب کے شائستہ اور پر خلوص نمونے ہیں۔ ان کی اہمیت اسلوب نگارش سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی نثر میں جو دلآویزی اور موسیقیت ہے وہ ٹینیڈر اور ڈی کوئنسی کا بھی حصہ ہے۔ اس کے یہاں بیک وقت نغمگی احساس اور آہنگ تاثر کا

احساس ہوتا ہے۔

مذہبیات انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان میں بڑھتی ہوئی مادیت اور الحاد کے خلاف جہاں دوسری تحریکیں رونما ہوئیں وہاں "آکسفورڈ تحریک" بھی اپنے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس تحریک کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی تاکہ مذہب اور اخلاق کی کسوٹی پر سائنس، معاشیات اور فلسفہ کے نئے افکار کو پرکھا جائے اور اہلِ انگلستان کے سامنے مسیحیت کا صحیح تصور پیش کیا جائے۔ اس تحریک کی طرف لازمی طور پر وہی لوگ متوجہ ہوئے جو اب تک تخئیلی ادب، رومانی شاعری اور احیائے ماضی کے خواب میں خود کو تھوڑی دیر کے لئے بھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک بیک وقت مادیت، لامذہبیت اور عقلیت کے خلاف متحدہ محاذ بن کر رہی جس کا مرکز آکسفورڈ قرار پایا۔

نیومین Newman آکسفورڈ تحریک کے مبلغ اور روح رواں کی حیثیت سے تاریخی مقام رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت دراصل اس کی زندگی اور کارناموں کی آئینہ دار ہے۔ وہ باوجود تمام ذہنی اور مذہبی باغیانہ رجحانات کے خالص انگریز رہا۔ اس کے یہاں لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ جو توانائی ملتی ہے وہ اس تربیت کا نتیجہ ہے جو وہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی غیر شعوری طور پر حاصل کر رہا تھا۔ نیومین نے اپنی تحریک کے سلسلہ میں ماضی سے وہی مذہبی توانائی حاصل کی جو رومانیوں نے احیائے ماضی سے پائی تھی۔ دوسرے مذہبی مصلحین نے بھی اس قسم کی کوششیں کی تھیں لیکن نیومین اور پوسی Pusey کی تحریک سب سے زیادہ مہذب اور قابل قبول تھی۔ نیومین نے اپنی تحریک کو ایک قسم کا اخلاقی ڈرامہ بنا دیا تھا جس میں عوام اور خواص بطور تماشائی شامل ہوتے تھے۔ اس نے رومن کیتھولک مذہب کو انگلستان میں از سر نو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اطاعت اور کسر نفسی کو اپنی تحریک میں خاص درجہ دیا۔ عملی تحریک کے علاوہ نیومین نے سنتوں اور مہاتماؤں کی سیرت پر کتابیں بھی لکھیں اور رومانی انداز میں اپنے خیالات وعقائد کو

پیش کیا۔ اس کی معرکۃ الآرا کتاب **Apologea** نفسیاتی اعتبار سے ایک شاہکار ہے۔ جس کی سلاست اور جادو بیانی ہمیں مسحور کئے بغیر نہیں رہتی۔

عہد وکٹوریہ کا ناول

عہد وکٹوریہ میں ناول کو جو عروج اور جو قبول عام حاصل ہوا وہ کسی دوسری ادبی صنف کو نہیں نصیب ہو سکی ہاں اس اعتبار سے اس کا مقابلہ رومانی دور کی شاعری اور دورِ ایلزابتھ کے ڈرامہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ڈکنس، تھیکرے، ٹرولپ، جارج ایلیٹ میریڈیتھ، بٹلر اور ہارڈی جیسے فنکاروں کا ایک ہی دور میں پیدا ہونا کسی قوم کے ادب کے لئے مایۂ ناز ہے۔ کم و بیش ستر سال کے اس طویل عہد کے ناول نگاروں کو دو نسلوں میں تقسیم کرنا کئی لحاظ سے مناسب ہے اس لئے کہ ڈکنس اور تھیکرے کا مطمح نظر بٹلر اور ہارڈی سے بہت حد تک مختلف ہے۔ مقدم الذکر فنکاروں کے یہاں اپنے زمانہ سے ناآسودگی کے باوجود انس والفت کا احساس ہوتا ہے اور پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ فنکار جو کچھ اصلاح یا ترقی چاہتا ہے اس کے امکان پر اعتماد بھی رکھتا ہے اس کے برخلاف موخرالذکر ناول نگاروں کے یہاں بغاوت اور بیزاری کا عنصر غالب معلوم ہوتا ہے۔ ہارڈی اور بٹلر کے ناولوں میں مسلمہ روایات واعتقادات کے خلاف جذبہ ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی جبریت اور قنوطی نقطہ نظر ملتا ہے جس سے ہمارے دل کچھ بے حوصلہ سے ہونے لگتے ہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ عہدِ وکٹوریہ میں پہلی نسل کے ناول نگاروں کے یہاں اپنے یورپین معاصرین کی طرح ماحول کی عکاسی اور سماج پر تنقید ملتی ہے لیکن ان کا لب ولہجہ بالزاک، فلوبیر اور دستووسکی سے بہت حد تک مختلف ہے۔ موخرالذکر ناول نگاروں کے یہاں ایک قسم کی رومانی بیزاری ملتی ہے جسے وہ جمالیاتی حقیقت نگاری کا رنگ دے دیتے ہیں۔ چنانچہ روس میں ناول جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک احتجاج تھا اور اس کے ساتھ ہی اخلاقیات اور سیاسیات کا نقیب بھی۔ عہد وکٹوریہ کے ناول نگاروں نے بھی اپنے سماج کی عکاسی کی ہے مگر ان کی تنقید جارحانہ سے زیادہ حوصلہ انگیز اور امید افزا ہے۔ ڈکنس اور تھیکرے اپنے پڑھنے والوں کے خیالات وجذبات اور سیاسی ومعاشرتی

مسائل پر اسی طرح نظر رکھتے ہیں جس طرح ان کی مادی خود آسودگی اور اخلاقی درشتی پر۔ ان کے یہاں عصری سماج کی برائیوں کی واضح تصویریں ہیں لیکن ان کا مطمح نظر مجموعی طور پر اثباتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ناول نگار فنکار اور سامان تفریح بہم پہونچانے والے کی دو مختلف حیثیتوں سے نہیں دیکھے جاتے تھے بلکہ عوام کے عقاید اور خیالات اور ان کے افکار و احساسات سے یکساں طور پر اثر قبول کر کے قومی فن کی تشکیل کر رہے تھے۔

عہد وکٹوریہ کا ناول اپنے وسیع کینوس Canvas سماجی تنقید، فلسفیانہ تجزیہ، غنائیت اور مزاح کی بنا پر دوسرے ادوار کے ناولوں سے ممتاز ہے۔ یہاں نہ تو اٹھارھویں صدی کی جنسی اور جذباتی بے راہ روی نظر آتی ہے اور نہ بیسویں صدی کی داخلیت اور نفسیاتی محرکات کے ساتھ غلو۔ بلکہ فنکار اور عوام ایک ہی تصویر کے دو رُخ معلوم ہوتے ہیں اور دونوں ایک ہی نوعیت کی خوشی اور غم اور کامیابی اور ناکامی میں برابر کے شریک ہیں۔

(۱) معاشرتی ناول: ڈِکنس اور تھیکرے

ڈکنس (۱۸۱۲ء سے ۱۸۷۰ء):-

ڈکنس نہ صرف انگریزی ناول نگاروں میں سب سے بڑی ہستی ہے بلکہ اپنے بالغ ذہن، مشاہدہ اور شاعرانہ ادراک کے باعث نثر میں شیکسپیئر کا ہمسر قرار دیا جاسکتا ہے وہ فنکار سے زیادہ اداکار، مقرر، خطیب اور ظریف ہے۔ اس کے ناولوں میں یہ ساری خصوصیات بڑے حسن کے ساتھ ہم آہنگ ملتی ہیں لیکن ڈکنس کے یہاں "سماجی شعور" سب سے زیادہ واضح ہے۔ اوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگی کا جو مطالعہ اس نے انھیں کی سطح سے کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ ان سماجی تصویروں میں مصنف کی ابتدائی زندگی کے وہ تاثرات بھی ہیں جن سے اس کے فن کو پرسوز خلوص حاصل ہوسکا ہے۔

اگر ہم ڈکنس کا بحیثیت ایک مفکر کے مطالعہ کریں تو اسے تصوراتی ردعمل کے نمائندوں سے زیادہ نزدیک پاتے ہیں۔ وہ کارلائل اور رسکن سے بہت متاثر ہے۔

اور عقلیت کے خلاف بلیغ اور سنجیدہ جذباتیت کا قائل لیکن یہاں سے آگے تصویر پرستوں
اور ڈکنس کے راستے بدل جاتے ہیں۔ ڈکنس ان لوگوں کے عارفانہ تصورات سے
بہت حد تک بے تعلق ہے اس لئے کہ وہ اپنے زمانہ کی مادی ترقیوں پر ایمان رکھتا ہے
اور اپنے عام پڑھنے والوں کے جذبات کا احترام کرتا ہے۔ اس کے پڑھنے والے وہی
لوگ تھے جن کا خاکہ وہ اپنے ناولوں میں پیش کرتا ہے۔ یہ لوگ قدیم لندن یا جنوبی
انگلستان کے زرعی اضلاع کے باشندے تھے۔ ہمیں ان کی معاشرت میں صنعتی
انقلاب اور مشینری کے اثرات سے زیادہ ماضی کی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ڈکنس
کی تصویریں جدید تہذیب کا چربہ نہیں بلکہ جاگیردارانہ نظام کا عکس لئے ہوئے ہیں اور
انھیں صنعتی انقلاب نے دھندلا نہیں کیا ہے۔

سب سے پہلے ۱۸۳۶ء میں ڈکنس Sketches By Boz کی
بدولت مشہور ہوا جس کے مزاحیہ خاکے آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ اس
سلسلہ کی سب سے اہم کڑی Pick Nick Papers ہے جس میں پہلی
بار وضاحت کے ساتھ ڈکنس کی فنکاری اور ظرافت ہمارے سامنے آتی ہے۔ مختلف
النوع کرداروں کو ایک خاص مزاحیہ انداز میں پیش کرنے میں ڈکنس کو بڑا کمال حاصل
ہے۔ وہ نہ صرف اپنے رجال داستان کے خدوخال نمایاں کرتا ہے بلکہ اپنی قوتِ تخلیق
سے ان میں جان ڈال دیتا ہے۔ پکوک کے کارناموں اور اس کے جرائم اور ہیئت
کذائی دیکھ کر ہم بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔

جس زمانہ میں Pick Nick Papers سلسلہ وار نکل رہا تھا
اسی دوران میں ڈکنس اپنا ناول Oliver Twist بھی مسلسل شائع
کرا رہا تھا۔ یہاں اس کے مزاح اور ظرافت میں پہلی مرتبہ سوز و گداز گھلا ملا
محسوس ہوتا ہے۔ سطحی طور پر یہ ناول غریبوں کی زندگی کا خاکہ ہے لیکن سچی بات یہ ہے
کہ اس میں خیر و شر کے درمیان وہی کشمکش نظر آتی ہے جو ڈکنس کے آخری دور کی تخلیقات
کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کسی نقاد نے بجا طور پر ڈکنس کو "عوامی نقال" کہا تھا اس لئے

کہ وہ اپنے سماج کی ترجمانی تخیل اور محاکات کی بہترین قوتوں کے ساتھ کرتا ہے۔ اس نے زندگی کو دیکھا تھا جس طرح بچے اپنے بزرگوں کو دیکھتے ہیں لیکن اس کا انداز بیان ایک اعلےٰ فنکار کا ہے۔

ڈکنس اپنے بچپن کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا اسی لئے جو نقوش اس کے ذہن نے قبول کئے تھے وہ اس کے بیشتر ناولوں میں ملتے ہیں۔ اپنی ابتدائی زندگی میں اسے مضافات لندن کے کارخانوں میں کام کرنا پڑا تھا جس کا عکس ہمیں اس کے شاہکار ناول David Copper Field میں واضح طور پر ملتا ہے۔ یہاں ہیرو کی زندگی ڈکنس کی اپنی زندگی ہے اور اس کی آزمائشیں اور مصیبتیں بھی بہت حد تک اسی کی ہیں۔ مبالغہ اور ظرافت کے پردہ میں ہم کو ڈکنس کی زندگی کی پرگداز روداد ملتی ہے۔ ابتدائی زمانہ کی ظرافت اور غنائی داستان سرائی کے بعد ڈکنس وسط صدی کے قریب حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوا۔ چنانچہ Dombey & Son، Black House، Great Expectations اور Little Dorit اور Hard Times میں وہ زندگی کے حالات واسباب اور معاملات ومسائل پر بے درد سچائی کے ساتھ تنقید کرتا ہے۔ یہاں وہ اس سارے نظام کے خلاف ہے جس کی پیچیدگی نے انسان اور انسان کے درمیان اجنبیت اور دوری پیدا کر رکھی ہے۔ ان ناولوں میں "زر" Money کو خاص رمزیہ حیثیت حاصل ہے Great Expectations اور Our Mutual Friend اسی مسئلہ زر کا تجزیہ معلوم ہوتے ہیں۔ Bleak House میں ہمیں ہمعصر انگلستان کے محکمۂ انصاف اور عدالت کا چربہ ملتا ہے۔ نومبر کے مہینہ میں فضا کے دھندھ اور عدالتوں کی دھاندلی میں ایک خاص رمزیہ کیفیت ہے۔ ان ناولوں کے مطالعہ سے ہمیں ڈکنس کے قوت مشاہدہ اور حقیقت نگاری کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ انھیں کارناموں کی بدولت سوویٹ روس میں بھی ڈکنس کی شہرت بڑھتی جا رہی ہے۔

ڈکنس بہت زود نویس ناول نگار تھا۔ اسی لئے جا بجا اس کے یہاں فنکارانہ

توازن کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی تخلیقات میں ایک ظاہری گداختگی، مبالغہ آرائی اور سطحی رومانیت بھی ملتی ہے جس سے اس کے فن پر آنچ آتی ہے۔ لیکن ان کمزوریوں کی طرف انہیں لوگوں کا دھیان جا سکتا ہے جو اس کی بالغ نظری، قوت مشاہدہ، کردار نگاری، پرکیف مزاج اور انسان دوستی کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ اگر وہ انگریزی ادب میں سب سے بڑا صناع اور داستان گو تو نثر میں سب سے دلپذیر اور سب سے بڑا شاعر ضرور ہے اور یہ خود اس کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

تھیکرے (۱۸۱۱ء سے ۱۸۶۳ء) :-

ڈکنس کے بعد ناول نگاری کے میدان کا دوسرا شہ سوار تھیکرے ہے وہ اپنے ہمعصر ڈکنس سے وہی نسبت رکھتا ہے جو ٹنی سن اور براؤننگ کے درمیان ہے۔ فن ناول نگاری میں تھیکرے کسی خاص جدت فکر کا پتہ نہیں دیتا کیونکہ اس کی سماجی عکاسی فیلڈنگ اور طالستائے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ تھیکرے کی حقیقت نگاری پر بھی سائنس اور فلسفہ کا کم اثر ہے لیکن اس کے یہاں رومانیت اور جذباتی التباس کے خلاف بغاوت کا میلان پایا جاتا ہے۔

تھیکرے کے یہاں طنز و تمسخر کا میلان سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ فیلڈنگ کی طرح وہ بھی جذباتیت، وقار و منزلت کے جھوٹے پندار اور دوسری انسانی خامیوں پر سخت ضربیں لگاتا ہے۔ ابتدائی کوششوں کے علاوہ یہ میلان Paris Sketch Book اور Irish Sketch Book میں بہت واضح ہے۔ "پنچ" Punch اخبار کے قلمی معاون کی حیثیت سے بھی تھیکرے نے نام نہاد سماجی وقار اور رومانی جذباتیت کے خلاف محاذ قائم کی۔ اس کے پختہ کارناموں میں اس طنزیہ میلان نے طربیہ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ وہ مروجہ اقدار، رسوم و روایات کے خلاف اسی انداز میں طنز کرتا ہے جس طرح سرشار "فسانۂ آزاد" میں۔ The Book of Snobs اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور اہم کتاب ہے۔ لیکن تھیکرے کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ Vanity Fair، Henry Esmond، New comes

اور Pendennis سے ہوتا ہے جہاں حقائق کے مشاہدات اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ شگفتہ اسلوب میں پوری طرح ہمارے سامنے آتا ہے۔

Vanity Fair نہ صرف انیسویں صدی انگلستان بلکہ اس زمانہ کے شاہکار مغربی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں تھیکرے کی تمام تر خصوصیات اس طرح سمٹ کر آ گئی ہیں کہ ہم اس کی سماجی مصوری، کردار نگاری اور داستان گوئی کے قائل ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اس عظیم انسانی داستان میں کسی خاص ہیرو یا ہیروئن کا پتہ نہیں لیکن اس کی مرکزی کردار "بیکی شارپ" Becky Sharp فلوبیر کی "مادام بواری" اور طالستائے کی "انیا کرینینا" سے کم شہرت نہیں رکھتی۔ اس مشہور کردار کے ذریعہ تھیکرے نے نہ صرف انیسویں صدی کے اوائل میں انگلستان کی معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے بلکہ اس کی ترقی اور زوال کے آئینہ میں ہم اوسط گھرانوں کی ذہنیت کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔

فنی اعتبار سے اس ناول میں تھیکرے کے دوسرے ناولوں کی طرح چند نمایاں خامیاں ملتی ہیں۔ یہ ناول بھی ایک مسلسل تنہا کلامی کا نمونہ ہے جس میں فنکار ہر وقت ہمارے اوپر مسلط رہتا ہے اور حالات و واقعات سے باخبر رکھنے کی کوشش میں اپنی مداخلت سے ہم کو آزادانہ لطف اندوزی کے کم مواقع دیتا ہے۔ ان فنی خامیوں سے تھوڑی دیر کے لئے ہم قطع نظر بھی کریں تو پھر تھیکرے کی اخلاقی ملائیت پر نظر پڑتی ہے۔ اس کے کردار بالکل علامتی ہوتے ہیں جن کو اچھائی اور برائی کے خانوں میں آسانی کے ساتھ تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خرابی تھیکرے کے ناولوں کی قسط وار اشاعت کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی جن میں ناول نگار کو اپنے پڑھنے والوں کے مذاق اور ذہنیت کا خیال رکھنا پڑتا تھا لیکن یہاں ہم کو مصنف کی کردار نگاری کا ایک دلچسپ پہلو بھی نظر آتا ہے۔ تھیکرے کی تخلیقی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ایمیلا Amelia اور لیڈی کیسل ووڈ Lady Castlewood کے مطالعہ سے نہیں بلکہ بیکی شارپ Becky Sharp اور بیٹرکس Beatrix سے ہو سکتا ہے۔

کیونکہ اس کے ناولوں میں یہ کردار جس قدر جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں خالص اخلاقی کردار موم کے پتلے نظر آتے ہیں۔ تھیکرے کا مقابلہ جارج ایلیٹ سے کرنے پر ہمیں فوراً اس کا احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ موخرالذکر زیادہ کٹر قسم کی اخلاقی پسند تھی لیکن اس کے یہاں زندگی اور سماج کا زیادہ واضح تصور ملتا ہے Vanity Fair کے بعد Henry Esmond دوسرا کامیاب ناول ہے جسمیں ملکہ این Queen Anne کے دورِ حکومت اور معاشرتی نظام کے مرقعے ملتے ہیں۔

تھیکرے اگرچہ دنیائے افسانہ میں فیلڈنگ، ڈکنس، ہارڈی اور کانریڈ کے پایہ کا فنکار نہیں لیکن اپنے مخصوص انداز، طنز، تمسخر اور زندگی کی حقیقت پسند ترجمانی کے باعث آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اس کی شہرت اپنے معاصرین میں ڈکنس کے علاوہ دوسرے حقیقت پسند ناول نگاروں مثلاً ٹرالپ Trollope اور چارلس ریڈ Charles Reade سے کہیں زیادہ ہے۔

(ب) رومانی ناول : برانٹے بہنیں

عہد وکٹوریہ کے ناول نگاروں میں ڈکنس کو چھوڑ کر برانٹے بہنوں کو لوگ اب بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ عام پڑھنے والوں کا ان کی طرف کشش کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان دونوں بہنوں کے المیہ حالات نے ان کی کہانیوں میں جو سوز و گداز پیدا کر دیا ہے وہ کم ناول نگاروں کے حصہ میں آیا ہے۔ ان کہانیوں میں جذبہ کی شدت بھی ہے اور خواب و خیال کی رنگین پرچھائیاں بھی۔ اسی لئے ان سے ناول کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو لکھنے والیوں کی محدود اور تنہا زندگی کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ انکی زندگی کے یہ عناصر ان کی تخلیقات کی ترکیب میں اہم جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شارلٹ برانٹی (۱۸۱۶ء سے ۱۸۵۵ء) کے افسانے رومانی ادب کے بہترین کارنامے ہیں۔ ان میں نہ صرف پہلی نسل کے رومانی ادیبوں کی شدت اور خلوص موجود ہے بلکہ یہاں مصنف کی جنس اور شخصیت ناول کی فضا سے مکمل طور پر ہم آہنگ بھی ہے۔ اس

کے یہاں جذبہ اور اخلاق کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ ہمیں پری رفلائٹ فنکار یاد آجاتے ہیں۔ خارجی حالات اور خانگی معاملات کے پیش نظر جب شارلٹ نے ناول کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا تو اس کے یہاں لازمی طور پر ایک خاص قسم کی رومانی اور ڈرامائی کیفیت پیدا ہوگئی۔

Jane Eyre شارلٹ برانٹی کا شاہکار ہے جس میں جنسی زندگی کی کشمکش کو مرد کی رعونت اور عورت کے عفو درگذر سے حل کیا گیا ہے۔ قصہ میں روچسٹر Rochester کے دیہاتی قیام گاہ کی تیسری منزل پر اس کی پاگل بیوی عرصہ سے رہتی چلی آئی ہے مگر اس کے وجود کے متعلق نہ کسی ملازم کو خبر ہے اور نہ اس کے ناجائز بچے کی آیہ جین Jane کو ہی۔ سارا گھر بھوتوں کا ڈیرہ معلوم ہوتا ہے اور وہ عورت اکثر و بیشتر اپنی فتور کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔ روچسٹر اگرچہ دھوکہ میں جین سے شادی کرلیتا ہے لیکن وہ وہاں سے بھاگ کر اپنے چچا کے یہاں پناہ لیتی ہے۔ اس دوران میں روچسٹر کی بیوی سارے گھر کو آگ لگا دیتی ہے جس سے وہ خود مرجاتی ہے اور اس کا شوہر اندھا ہوجاتا ہے۔ جین جو اپنے چچازاد بھائی کی ہوس کاریوں سے بچنا چاہتی ہے۔ اپنے اندر ایک غیبی تحریک محسوس کرتی ہے اور بالآخر تھارن فیلڈ پہونچتی ہے۔ وہ نہ صرف روچسٹر کو معاف کردیتی ہے بلکہ اس سے باقاعدہ شادی کرلیتی ہے۔ یہ ناول انتہائی داخلی قسم کی تخلیق ہے۔ اس میں نہ فرادیت ہے اور نہ محض جنسی جذبات کو دبانے کی کوشش بلکہ ایک زندہ کردار کی واقعی سرگذشت ہے۔ جین نہ صرف گوشت پوست کی ایک عورت ہے بلکہ ذہنی صلاحیتوں کی بھی مالک ہے۔ اسے اخلاقی اور روحانی اقدار کے ساتھ اپنی عظمت کا بھی احساس ہے۔ بلاشبہ اس کے پس پردہ شارلٹ کی اپنی زندگی تھی جس کی تلخیاں اور تنہائیاں رومان کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایملی برانٹی (۱۸۱۸ء سے ۱۸۴۸ء) شارلٹ کی چھوٹی بہن تھی۔ وہ اپنی واحد افسانوی تخلیق Wvthering Heights اور چند نظموں کی بدولت آج بھی اپنا مخصوص مقام رکھتی ہے۔ سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد انگریزی ادب میں کسی ایسے فنکار

کا تصور مشکل ہے جو اپنے اندر ایملی کی طرح فکر کی آزادی اور روحانی زندگی کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہو۔ ایملی ایک باشعور فطرت پرست عورت تھی جس کے یہاں فکری اور جذباتی آزادی کا احساس بھی ملتا ہے اور جنسی فرق و امتیاز اور مذہبی سخت گیریوں کے خلاف باغیانہ میلان بھی نمایاں ہے۔ اس کے لازوال شاہکار Wvthering Heights میں فطرت اور انسانی جذبات کی ہم آہنگی فنکاری کا بہترین نمونہ بن گئی ہے۔

ایملی کا مزاج کچھ متصوفانہ تھا جس کی جھلک اس کی نظموں اور اس کے مشہور ناول میں ملتی ہے۔ مصنف کو اپنے ہمعصروں کی طرح حقیقت پسندی اور معاشرتی مسائل کے ساتھ لگاؤ کے بجائے اپنے کرداروں کے روحانی اقدار سے خاص واسطہ ہے۔ Wvthering Heights میں ہیرو Heathcliff اور ہیروئن Catherine دو دریا کی طرح ہیں۔ جن کو مل کر ایک سنگم بنانا چاہیئے تھا لیکن ان کے راستے الگ ہو گئے۔ ہیرو کے لئے یہ ایک خطرناک سانحہ تھا۔ بالآخر دونوں کے مل جانے سے فلاح اور نجات کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ناول اپنی شاعرانہ نثر، ذہنی پختگی اور نفسیاتی کشمکش کی بنا پر آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

(ج) نفسیاتی اور فلسفیانہ ناول: جارج ایلیٹ، میریڈتھ اور ہارڈی

جارج ایلیٹ (۱۸۱۹ء سے ۱۸۸۰ء)

اگر ڈکنس اور تھیکرے روایتی انگریزی ناول کی تکمیل کرتے ہیں تو جارج ایلیٹ (جس کا پورا نام میری این ایونس تھا) سے ایک نئے دور اور ایک نئے فکری میلان کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب طالستائے کی "سواستوپول" اور فلوبیئر کی "مادام بواری" کے علاوہ دستوفسکی اور ترگنیف کی تخلیقیں بھی منظر عام پر آ چکی تھیں اور ان کے اثرات غیر شعوری طور پر انگریزی ناول کی فضا میں پھیل رہے تھے۔ اگر ہم ان یوروپین فنکاروں کا مقابلہ اس زمانہ کے انگریزی ناول نگاروں سے کریں تو اندازہ ہوگا کہ جہاں فرانسیسی اور روسی مصنفین کا مقصد انسانی زندگی اور اس کے سماجی عوامل کو فن کے لباس میں پیش کرنا تھا۔ وہاں جارج ایلیٹ اور ہارڈی کے یہاں سنجیدہ مقصدیت کا احساس کار فرما رہا۔

جارج ایلیٹ نہ صرف خود اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کی مالک تھی بلکہ ہربرٹ اسپنسر اور ہنری لیوس جیسے مفکروں کی صحبت سے بھی فیضیاب ہو چکی تھی۔ اس کا حلقہ احباب بھی ڈکنس اور تھیکرے کے دوستوں کے دائرہ سے نمایاں طور پر مختلف تھا۔ ایک حد تک جارج ایلیٹ کا شمار انقلابی روایت پرستوں میں کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی انقلابیت مذہب اور اخلاق تک محدود ہے۔ انگریزی کلیسا کے اصول و عقاید کے زیر اثر تربیت کے باوجود اس کو عقلیت سے طبعی مناسبت رہی اور وہ رفتہ رفتہ جبریت کی طرف جھکتی گئی۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسان اپنے کارناموں کا خود ذمہ دار ہے۔ جارج ایلیٹ کے اس خیال کو سائنس سے بھی تقویت ملتی ہے کیونکہ یہاں بھی "وراثت کی جبریت" انسانی اعمال کا نتیجہ ٹھہرائی گئی ہے اپنے ناولوں میں افراد کے مقدر کو ان کے اعمال کا نتیجہ ثابت کر کے اس نے انگریزی ناول میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس نے نہ صرف "پلاٹ" کے بجائے "کردار" کی اہمیت پر زور دیا بلکہ کیفیات ذہنی اور واردات قلبیہ کی عکاسی کر کے نفسیاتی افسانہ کے لئے بھی زمین ہموار کی۔

جارج ایلیٹ کا رجحان قدیم اقدار کی طرف اس وجہ سے ہے کہ وہ روایتی سماجی نظام پر اعتقاد اور اعتماد رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک سماج میں ہر شخص کا اپنا مقام اور اپنے فرائض ہیں لیکن وہ خود جس سماج کی نمائندگی کر رہی تھی وہ "رفارم بل" (۱۸۳۲ء) کے بعد ختم ہو چکا تھا اس لئے اس کی جزئیات میں وہ دلکشی نہیں پائی جاتی جو ڈکنس کے ناولوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اپنے فلسفیانہ رجحانات کی وجہ سے جارج ایلیٹ اکثر اپنے ناولوں میں منطقی اور اخلاقی بحثوں میں پڑ جاتی ہے جن میں اگرچہ شاعرانہ کیفیت نہیں ہوتی مگر بے لاگ حقیقت پسندی ضرور ہوتی ہے۔ اس کے یہاں تاریخ، فلسفہ اور معاشیات کی واقفیت کے علاوہ سائنسی تجزیہ اور قطعیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے شگفتہ اور فنی اعتبار سے دلکش صفحات کو خشک اور بے جان حصوں سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے تمام ناولوں میں کوئی نہ کوئی حکیمانہ تصور ضرور ہوتا ہے Adam Bede میں وہ ہر شخص کو اپنی اخلاقی اور مذہبی زندگی کا ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔

The Mill on The Floss میں کردار اور خارجی واقعات کی سازش سے تقدیر کی تکمیل دکھائی گئی ہے اور Silas Meriner میں ان مخفی قوتوں سے بحث ہے جو بالآخر انسان کی شخصیت کی تکمیل کرتی ہیں۔ جارج ایلیٹ کے فنی کردار کی انفرادیت اس کے ناولوں میں ان مقامات پر پوری طاقت اور شدت سے کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں خارجی اور داخلی کشمکش کے باوجود وہ انسان کو ایک خاص بلندی پر دیکھنا چاہتی ہے۔

Adam Bede میں جارج ایلیٹ کے اخلاقی اور جمالیاتی دونوں پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہاں ایک مخصوص سماجی پس منظر میں ہیٹی اور آدم کی محبت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ ہیٹی کو اگرچہ آدم سے محبت ہے لیکن وہ آرتھر کے فریب میں پڑ کر گناہ کی مرتکب ہوتی ہے اور جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ آدم کی تلاش میں نکل پڑتی ہے۔ دوسری طرف آدم ایک راہبہ "ڈائنہ" Dinah کی مذہبیت سے متاثر ہو کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔ اس ناول میں کرداروں کی علامتی خصوصیت اور جا بجا طویل مباحثے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں لیکن اس کی سب سے دلچسپ خوبی دیہاتی پس منظر ہے جس کے کھیت کھلیان اور سادہ طرز معاشرت ہمیں متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔

The Mill on the floss میں ہمیں بہت حد تک مصنف کی اپنی زندگی کا خاکہ نظر آتا ہے۔ میگی Maggie کے بچپن سے لے کر جوانی کے واقعات خود جارج ایلیٹ کی ذہنی صلاحیتوں، پرجوش فطرت اور شدید احساسات کا آئینہ ہیں۔

ان تمام ناولوں میں Silas Marne کی اپنی منفرد اہمیت ہے۔ یہ ایک غریب جولاہے کی زندگی کی روداد ہے جو اپنے دوست کی مکاری اور دغابازی سے چوری کے الزام میں پکڑا جاتا ہے اور اپنی منگیتر سے بچھڑ جاتا ہے۔ اسے کسی دور کے ملک میں جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنی دولت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ان مصیبتوں کی وجہ سے وہ زندگی اور انسان سے بیزار ہو جاتا ہے لیکن آخر کار ایک سنہرے بالوں کی لڑکی اس کی زندگی سنوار دیتی ہے۔ اس ناول میں ہمیں جارج ایلیٹ کی فنکاری کا

احساس تو ضرور ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ اس کی مذہبیت کو بھی پڑھنے والا محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس ناول کو افسانہ کے روپ میں مصنف کے عقیدۂ نجات کی تفسیر کا دور شروع ہوتا ہے۔

ان ابتدائی ناولوں کے بعد جو ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۱ء کے درمیان شائع ہوئے جارج ایلیٹ کی زیادہ اہم تصانیف کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان میں Romola اور Middle March (1870) زیادہ مشہور ہیں۔

"مڈل مارچ" اس دور کے ناولوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے اسے طالستائے کے "جنگ و صلح" War & Peace سے بھی مشابہت دیتے ہیں۔ اگرچہ جارج ایلیٹ اور طالستائے کے تخیل، مشاہدہ اور فنکاری میں نمایاں فرق ہے لیکن اول الذکر کا اکتساب بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں۔ اس ناول میں جارج ایلیٹ نے ۱۸۳۲ء سے "رفارم ایکٹ" سے پہلے کی دیہاتی زندگی کا جو مرقع پیش کیا ہے وہ اس کے فن کی معراج ہے۔ یہاں کم و بیش چار پلاٹ ملتے ہیں ــــــ ڈارتھیا کی کہانی، لڈگیٹ کی شادی، میری گارتھ کی زندگی اور بلسٹروڈ کا زوال۔ لیکن ان سب کو جس فنی چابکدستی سے باہم مربوط کیا گیا ہے وہ جارج ایلیٹ کا ہی حصہ ہے۔ یہاں نفسیاتی تجزیہ اور فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ جارج ایلیٹ جبر و اختیار کے درمیان انسان کی کشمکشوں کا عبرتناک رخ پیش کرتی ہے۔ اپنے ابتدائی ناول سے لے کر "مڈل مارچ" کے زمانہ تک جارج ایلیٹ دیہاتی زندگی میں لوگوں کے اخلاقی اور روحانی اقدار اور ان کے ذہنی کشمکش کی داستان مرتب کرتی رہی مگر اس کے آخری ناولوں میں اس کے مطمح نظر اور اس کے ذہن و شعور کی نزاکتوں کا پوری طرح احساس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اسے جدید نفسیاتی افسانہ کے بانیوں میں شمار کرنا کچھ زیادہ مبالغہ نہیں۔

جارج میریڈتھ (۱۸۲۸ء سے ۱۹۰۹ء)

ناول کا فن بنیادی طور پر زندگی کی ترجمانی اور کرداروں کے داخلی اور خارجی موثرات اور کیفیات کی تشریح ہے۔ اس طرح ناول نگار ایک حد تک نثر میں شاعری کر سکتا ہے لیکن

ہر ناول نگار نہ تو شاعر ہو سکتا ہے اور نہ ہر شاعر کے لئے ممکن ہے کہ فن افسانہ کا حق ادا کرے عہد وکٹوریہ میں البتہ ہم کو دو ادیب ــــــ میریڈتھ اور ہارڈی ــــــ ایسے ملتے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیتیں بیک وقت دونوں اصناف پر حاوی ہیں۔

میریڈتھ عہد وکٹوریہ میں جدید رومانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے رجحانات اور میلانات تخئیلی اور تخلیقی اعتبار سے ایک خاص تحریک کے پروردہ ہیں۔ اس کے خیال میں فکر داخلی جذبہ کے تابع ہے اور عقلیت خود زندگی کا وجدان ہے۔ ان اسباب کی بنا پر اس کے یہاں ماہرین نفسیات کی تخلیلی صلاحیت اور "افادیوں" Utili Tarians کی وسعت فکر و نظر کے ساتھ کارلائل جیسے تصور پرستوں کی وجدانیت بھی ملتی ہے۔ بحیثیت ایک ناول نگار کے میریڈتھ کسی خاص مدرسۂ فکر کی طرف مائل نظر نہیں آتا بلکہ اس کا فن اس کا ذاتی اکتساب ہے۔ ابتدا میں وہ مشرقی رومانوں سے دلچسپی رکھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کے یہاں اخلاقی مسائل، اور حیات انسانی کے دوسرے معاملات بھی آنے لگے تھے۔ اس کے باوجود اس کی حقیقت نگاری میں ہمیں ٹھیکرے، ٹرالپ اور جارج ایلیٹ کی سماجی دلچسپیاں کم نظر آتی ہیں۔ میریڈتھ نے اگرچہ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "طربیہ کا مقصد" Idea of Comedy میں طربیہ کے کلاسیکی نظریوں کی حمایت کی ہے لیکن خود اس کے ناولوں میں بن جانسن اور کانگریو Congreve کی معاشرتی تنقید نہیں ملتی۔ ان خامیوں کے باوجود اس کے کردار جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ اسٹیونسن نے کہا تھا کہ "میریڈتھ کے افسانوں کی دلچسپی اس وجہ سے ہے کہ ان میں جنسی شعور اور مزاحیہ میلان کے ساتھ احساس جمال بھی موجود ہے۔ ان میں وہ حسن بھی ہے جس کا پس منظر خدا کی زمین ہے۔"

The Ordeal of Richard Feveral
"رچارڈ فیورل کے مصائب"

میریڈتھ کے ان دلچسپ کارناموں میں شامل کیا جاتا ہے جن کا مستقل موضوع زندگی کا طربیہ ہے اور جہاں حقیقت اور فریب کی کشمکش بھی ہے اور مرکزی کردار کے ذہن و اخلاق کی تہذیب و تربیت بھی۔ اس ناول میں ہماری ملاقات سر آسٹن فیورل

سے ہوتی ہے جو ایک مخصوص نظام تعلیم کا حامی ہے۔ اس کا بیٹا رچارڈ فیورل ہے جس کی تربیت اس کی زندگی کی آزمائشوں اور دلشوار گزاریوں سے ہوتی ہے۔ اس کی محبوبہ لوسی Lucy بنات خود ایک دلچسپ اور زندہ کردار ہے جس پر طربیہ کا سارا دار و مدار ہے۔ میریڈتھ کے مقبول عام ناولوں میں Evan Harrington بھی ہے جس میں اس نے اپنی خاندانی تاریخ بیان کی ہے۔ جس کا ہمزاد ناول Adventures of Harry Richmond بھی ایک طرح سے مرکزی کردار کی اپنی ماں کے خاندان اور باپ سے وفاداری کے کشمکش کی داستان ہے۔ میریڈتھ کے دوسرے مشہور ناولوں میں Beauchamp's, Career اور Diana of the Crossways اہم ہیں لیکن اس کا شاہکار "مغرور" The Egoist ہے جہاں مصنف کی تمام انفرادی خصوصیات ضبط و توازن کے ساتھ اکٹھا ہوگئی ہیں۔ میریڈتھ کا کوئی دوسرا ناول اس نفسیاتی تعمق اور مشاہداتی جامعیت کو نہیں پہونچتا۔ ناول کا پلاٹ بہت مختصر ہے Sir Willoughby جو غرور و نخوت کا پیکر ہے اپنی محبوبہ Constantia Durham کی بے التفاتی کی وجہ سے Leatitia Dale سے انتقاماً منہ پھیر لیتا ہے تاکہ Clara Middleton سے شادی کر سکے لیکن جب ادھر سے بھی ناامیدی ہوتی ہے تو Laetitia سے ہی اسی کے شرائط کے مطابق شادی کر لیتا ہے۔ اس ناول سے ہمیں جین آسٹن کے چند کردار یاد آجاتے ہیں لیکن اس ناول کا ہیرو اپنی انفرادیت کی وجہ سے ممتاز ہے۔

میریڈتھ کے ناولوں میں تمسخر کے پہلو کچھ اس طرح نمایاں ہیں کہ ہم اس کی نفسیاتی صلاحیتوں سے چشم پوشی کر لیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ ایک طرف شاعر کا دل رکھتا ہے تو دوسری طرف ماہر نفسیات کا ذہن بھی۔ جارج الیٹ کے ساتھ میریڈتھ نے نفسیاتی ناول کے لئے زمین ہموار کی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے فنکاروں نے اس صنف کو معراج کمال تک پہونچا دیا۔

طامس ہارڈی (سنہ ۱۸۴۰ء سے سنہ ۱۹۲۸ء) :۔

دورِ جدید کے انگریزی ناول نگاروں میں ہارڈی اپنے فکری اجتہادات اور فنی تعبیر کے باعث اردو خواں طبقہ میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ وہ بیک وقت ایک بڑا مفکر اور بڑا فنکار ہے۔ اس کی تخلیقات پر دوسرے فلاسفہ کے علاوہ فرانسیسی ادیب روسو Rousseau کا اثر نمایاں ہے۔ صنعتی انقلاب اور مادیت سے ہارڈی کی بیزاری رومانی شاعروں کا ترکہ ہے لیکن اس کے غم میں شوریدگی اور بغاوت کے بجائے سکون اور تلخی کے عناصر غالب ہیں۔ اس کے یہاں ابتدائی انسانوں کی جبلّی خواہشوں اور فطری جذبی کا پرخلوص شعور موجود ہے۔ اسی لئے وہ ہنری جیمس کی طرح مہذب دنیا کی عکاسی نہ کرکے دیہات کی طرف مائل ہے۔ جس طرح سروالٹر اسکاٹ نے شمالی سرحدوں کی افسانوی تاریخ میں علاقائی ناول کو فروغ دیا تھا اسی طرح ہارڈی نے اپنے ناولوں سے دیہاتی زندگی کے یادگار مرقع مرتب کئے۔ اسکاٹ کی طرح اسے بھی اس بات کا خدشہ سے احساس تھا کہ سائنس اور صنعتی انقلاب کے اثرات بہت جلد فطرت کے ان گہوارں کو مادی کثافتوں کی نذر کردیں گے۔ اور ان خطوں کے باشندوں میں بھی شہریوں کی طرح تکلف اور نمائش آنے لگے گی۔ غالباً اسی احساس سے مجبور ہوکر ہارڈی نے اپنے "ویکس ناول" Wessex Novels لکھے جن میں دیہاتی تہذیب اور معاشرت کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس کے کردار شہری معاشرتی زندگی کے نمائندہ ہونے کے بجائے دیہاتی فضا، موسم اور روایتی طرزِ زندگی کے اصلی اور بے ساختہ تصویریں ہیں۔ اس سے پہلے کہ اس کے کرداروں کی تمام انفرادی خصوصیات وعلامات ہمارے سامنے آئیں ہم "اوک" Oak کو ایک ایماندار اور ہوشیار گڈریہ اور "ہنچارڈ" Henchard کو ایک کامیاب کاشتکار پاتے ہیں۔ اسی طرح "باتھ شیبا" Bathsheba ہمارے سامنے ایک "عشوہ گر" سے زیادہ ایک زراعت پیشہ گوالن کی حیثیت سے آتی ہے۔ ہارڈی کے تمام ناولوں میں دیہاتی ماحول اور سیدھے سادے انسانوں پر اس کے اثرات کی تفسیریں ملتی ہیں۔

ذہنی اعتبار سے ہارڈی اپنے وقت سے پہلے کی پیداوار ہے لیکن جذباتی اعتبار سے وہ روایت پسند ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں بھی وہ سائنس کے باوجود بھوتوں، خوابوں اور محیر العقول مخلوقات میں عقیدہ رکھتا تھا اور ڈارون، مل، ہکسلے اور اسپنسر کی تعلیم بھی مافوق الفطرت سے اس کے اعتقاد کو نہیں ہٹا سکی۔ جارج الیٹ کی طرح ہارڈی بھی ان فلسفیوں کے شاگردوں میں تھا لیکن دونوں نے اس تعلیم سے اپنے فن میں الگ الگ کام لئے۔ جارج الیٹ کے یہاں ہر شخص کو خیر و شر کے درمیان فیصلہ کرنے کا حق ارادی حاصل ہے لیکن ہارڈی کے یہاں ایسا کوئی فلسفہ موجود نہیں ہے۔ اس کے نزدیک فطرت اور انسان اور اس کے عزائم و مقاصد کے درمیان کشمکش میں کسی قسم کے سمجھوتہ کی گنجائش نہیں۔ ہارڈی کے افسانوں کے پلاٹ اسی کشمکش اور شکست و ریخت سے مرکب ہیں۔ اس کا فلسفۂ حیات یقینی طور پر قنوطی ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اگر ایک طرف مہذب دنیا مشینوں اور سرمایہ دارانہ نظام کا غلام ہے تو دوسری طرف دیہاتوں میں عناصر فطرت اور دوسرے شر پر عوامل انسان کو زیر کرنے کے لئے تلے ہوئے ہیں۔ اسی "اندھی مشیت" کو ہارڈی نے President of The Immortals کہا ہے۔

ہارڈی کی ناول نگاری میں تاریخی ارتقا ہے۔ اس کے ابتدائی ناولوں میں یا تو روایتی پلاٹ ملتے ہیں یا پھر ماجرا اور کرداروں میں ایک قسم کا باہمی ارتباط موجود ہے لیکن اس کے زیادہ کامیاب کارنامے وہ ہیں جن میں حقیقت نگاری اور نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ انسان اور شر پر عناصر کے درمیان تصادم اور کشمکش دکھائی گئی ہے۔ ان ناولوں میں Far From The Madding Crowd کے علاوہ The Mayor of Casterbridge (Return of the Native Jude The Obscure اور Tess سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ کئی اعتبار سے Return of The Native ان تمام افسانوں میں منفرد اور ممتاز ہے۔ اس کا پلاٹ کلاسیکی شاہکاروں کی طرح بالکل سادہ ہے اسلئے ہمارا ذہن مختلف سمتوں میں نہیں بھٹکتا۔ Clym Yeobright جو پیرس میں ہیرے کا کاروبار

کر رہا تھا اپنے وطن واپس آکر درس و تدریس کرنے لگا اور رفتہ رفتہ اسے Eustacia Vye سے محبت ہوگئی۔ یوسٹیشیا اپنے اندر ایک خاص رومانی میلان رکھتی تھی اس وجہ سے شادی کے باوجود اپنے پہلے چاہنے والے Wildeve کو وہ بالکل خاطر انداز نہ کر سکی۔ اس نے Clym سے شادی بھی محض پیرس جانے کی لالچ میں کی تھی۔ لیکن جب اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو اس نے پرانے عاشق کے ساتھ اپنے تعلقات دوبارہ قائم کر لئے لیکن ان کی محبت کا انجام موت ہی ثابت ہوا۔ Clym ہارڈی کے تصور پرست کرداروں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اس کے اندر آرنلڈ کے خانہ بدوش طالب علم Scholar Gipsy کے تمام زخم و ناسور موجود ہیں۔ اور اس طرح وہ بہت حد تک "جدید انسان" ہے لیکن یوسٹیشیا روایتی کردار ہے جس کے اندر جذبات کی شدت اپنے ماحول سے بغاوت میں بدل جاتا ہے۔ ان دونوں کی ٹریجڈی ان کی طبیعتوں کے اس زبردست اختلاف کی بنا پر واقع ہوئی۔ اس ناول میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز اس کا جغرافیائی پس منظر ہے جو جھاڑیوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے اور Egdon Heath کہلاتا ہے۔ اسی میدان کے پس منظر میں ہارڈی نے زندگی کے ڈرامے پیش کئے ہیں۔

Far From The Madding Crowd دیہاتی زندگی اور دیہقانی طرز معاشرت کی زندہ تصویر ہے۔ اس ناول میں ہیروئن "باتھ شیبا" کا حسن مرغزاروں اور وادیوں کے پس منظر میں ایک المیہ طربیہ کے لئے مواد اور اسباب مہیا کرتا ہے۔ اس کے بعد ہارڈی کے دوسرے ناولوں میں خیر و شر کا تصادم اور فطرت اور انسان کے درمیان کشمکش کا احساس غالب نظر آتا ہے لیکن ہارڈی کی قنوطیت اس کی شاعری کی وجہ سے حسین و جمیل صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کی تلخیاں ہم کو بدمزہ یا بیزار نہیں کرتیں۔ خارجی فطرت کی جو حسین اور دلکش مصوری ہارڈی کے یہاں موجود ہے وہ کسی دوسرے افسانہ نگار کا حصہ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم تھوڑی

دیر کے لئے ان حسین وادیوں، مرغزاروں، پہاڑیوں اور جھیلوں کی دنیا میں اپنے یا ہارڈی کے کرداروں کی کلفتوں اور پریشانیوں کو بھول سے جاتے ہیں۔ ان مناظر کی عکاسی میں ہمیں زندگی، تازگی اور مشاہدہ کی گہرائی ملتی ہے۔ ہارڈی کی شخصیت بھی اس کے کرداروں کی طرح انہیں مناظر کے سایہ میں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

Jude The Obscure بہت حد تک ہارڈی کے فلسفۂ حیات کی آخری دستاویز ہے جس میں جدید تہذیب کی تشنجی کیفیات کا دلدوز نقشہ ملتا ہے۔ اس ناول میں ہارڈی نے اپنے زمانہ کی افسانوی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے اسی لئے اسکا انداز مصنف کے دوسرے تخلیقات سے مختلف ہے۔ "جوڈ" ایک حوصلہ مند اور جوشیلا طالب علم ہے جو زندگی کے اہم لمحات میں حقائق سے روگشی کے لئے جام و مینا کا سہارا لیتا ہے لیکن اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ شراب و شباب کی لذتوں کے ساتھ عظیم خواب بھی دیکھتا ہے جن کی تکمیل موجودہ حالات میں اس کے لئے ناممکن ہے۔ ایک ذہین انسان کی جنسی ترغیبات اور مادی زندگی کی مایوس کن فضا میں بلندیوں کا خواب واقعی معنوں میں عظیم فن کا مواد ہے ناول کی ہیروئن Sue بھی ایک ذہین عورت ہے لیکن اس کے اندر جنسی جذبہ ضعیف ہے۔ ہارڈی ان کرداروں کے ذریعہ جدید معاشرت اور اخلاقی کھوکھلا پن کا پردہ فاش کرتا ہے۔

ہارڈی نہ صرف انگریزی ناول نگاروں بلکہ دنیائے افسانہ میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔ اس کے اکتسابات کا صحیح اندازہ ہمیں شکسپیر اور دوسرے کلاسیکی المیہ نگاروں کے فن کی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ خیر و شر کے تصادم کے ساتھ اس نے اپنے ناولوں میں دیہات اور اس کے پرسکون پس منظر میں جس شاعرانہ انداز سے جذباتی ڈرامے پیش کئے ہیں ان کا اثر دیرپا ہے۔ جازف کانریڈ Joseph Canred. اور دوسرے ناول نگار اگرچہ براہ راست ہارڈی سے متاثر نہیں لیکن ان کے یہاں وہی حزنیہ تصور نفسیاتی تجزیہ اور حیات و کائنات کے مشاہدے ہیں جو ہارڈی کا طرۂ امتیاز ہے۔

باب ہفتم

بیسویں صدی کا ادب

سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۶۰ء

فکر و ادب میں کسی دور کا تعین قطعی سن اور تاریخ کے ساتھ ناممکن ہے اس لئے کہ شاعروں اور ادیبوں کی ایک نسل ابھی ختم نہیں ہو پاتی کہ دوسری بالغ ہونے لگتی ہے۔ اسی کا نام تاریخی تسلسل ہے۔ تاریخی طور پر اگرچہ ہم رومانی دور کو سنہ ۱۸۳۲ء کے بعد ختم سمجھتے ہیں لیکن اس کے اثرات انیسویں صدی کے آخر تک کسی نہ کسی روپ میں کارفرما معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگرچہ گزشتہ صدی کی آخری دہائیوں سے ہی جدید رجحانات رونما ہونے لگے تھے مگر بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے پہلے جدید ادبی میلانات واضح طور پر نمایاں نہیں ہوئے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی انگریزی ادب میں عہد وکٹوریہ کے ادب اور طرز معاشرت سے شعوری انحراف ملتا ہے۔ نئی نسل نے اپنے بزرگوں کے خیالات و عقائد، ادبی اور سیاسی نظریات پر نہ صرف شک اور بے اطمینانی کے ساتھ غور کرنا شروع کیا بلکہ بعض اوقات کھلے طور پر ان کی تضحیک بھی کی۔ ان کے نزدیک وکٹوریہ کا دورِ حکومت محض خود

آسودگی اور فرضی اور غیر حقیقی قدروں کا زمانہ تھا۔ چنانچہ مفکروں اور ادیبوں کی اس نوجوان نسل نے اس بات کا بیڑہ اٹھایا کہ وہ گزشتہ عہد کے تمام ثقافتی مفروضات اور فکر وعمل کے جملہ میلانات وتصورات کا پردہ فاش کرینگے ۔ برنارڈشا، ٹیس، ایچ ۔ جی ۔ ویلز اور گالزوردی بہت واضح طور پر زندگی کی نئی سمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

جدید ادب میں مارکس اور فرائڈ **Freud** کے اثرات سب سے زیادہ قوی اور دیر پا ثابت ہوئے ۔ موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے آخر تک فکر وتخلیق کے میدان میں یہی لوگ رہنمائی کر رہے تھے ۔ مارکس نے اپنے معاشی فلسفہ کے ذریعہ ادب کو خواص کی سطح سے عوام کی سطح پر لانے کی کوشش کی چنانچہ شعر وادب میں حقیقت نگاری، خارجیت اور سماجی شعور اسی مدرسۂ فکر کی دین ہے ۔ برنارڈشا، ایچ ۔ جی ۔ ویلز اور گالزوردی کے یہاں جو اشتراکی عناصر ملتے ہیں ان کا پتہ یہیں ملتا ہے ۔ انیسویں صدی کے اواخر میں میتھو آرنلڈ نے بھی ادب اور شاعری کو "تنقید حیات" قرار دیا تھا لیکن اس کے نزدیک اعلیٰ ادب محض کلاسیکی، غیر رومانی یا تصوفانہ ادب ہو سکتا تھا ۔ اس کے برخلاف مارکس کے حامیوں نے فکری اور عملی زندگی کو براہ راست سماجی حالات واسباب اور پیداوار اور تقسیم کے ذرائع سے وابستہ قرار دیا اور "ادب برائے زندگی" کے تصور کی منضبط اور واضح طور پر تحریک وتلقین شروع کی ۔ لیکن انگریزی ادب میں مارکس کی حقیقت پسندی اور خارجیت اس حد تک کامیاب نہ ہو سکی جس حد تک کہ وہ روس اور یورپ کے دوسرے ممالک میں ہوئی ۔ انگلستان میں انفرادیت کی لے اجتماعیت پر رہ رہ کر غالب ہوتی نظر آتی ہے ۔ یہ ادبی انفرادیت ادیبوں اور شاعروں کو اپنی ذات اور اس کے بیرونی اور اندرونی حادثات کے ساتھ بڑھی ہوئی دلچسپی کا نتیجہ ہے ۔ ایسے مختلف النوع رجحانات اور میلانات کے ہوتے ہوئے مدرسوں اور دبستانوں کا روایتی تصور ختم ہوتا جا رہا ہے ۔ ہر لکھنے والا اپنی جگہ ایک انجمن ہے اور ایک نیا زاویۂ نگاہ پیش کرتا ہے ۔ چنانچہ شا اور ویلز جیسے صالح اور رجائیت ارباب فکر کے پہلو بہ پہلو ڈی ۔ ایچ ۔ لارنس اور جیمس جوائس جیسے خارج المرکز ادیب بھی ملتے ہیں جو سیلانی شعور کے ذریعہ اپنا فلسفۂ حیات پیش کرتے ہیں ۔

بیسویں صدی میں سیاسی اور سماجی زندگی پیچیدگیوں کی وجہ سے ادب میں کوئی مثبت تصور مشکل سے ملتا ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان انگریز اور دوسری یورپی قومیں جن تباہ کاریوں سے دو چار تھیں ان سے انتشار اور بحران کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ ان اسباب کی بنا پر ادب میں تنہائی اور لامرکزیت کا احساس شدت کے ساتھ ملتا ہے جو تشکیک اور اکثر یاسیت کی شکل لئے ہوئے ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ساری ادبی فضا پر سورج کے اجیالے کے بجائے کہر اور دھند لکا چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے یا دوسری طرف احیائے ماضی، مذہبیت اور فراریت کے میلانات عام ہیں۔ کانریڈ، لارنس، اور آلڈس ہکسلے جیسے مصنفوں کے مطالعہ سے ہمیں اس عہد کے رجحان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شاعری میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے یہاں قنوطیت بالآخر مذہبیت کے ساتھ مخلوط ہو کر ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے جو نئی گمراہیوں کے امکانات کی حامل ہے۔ "خرابہ" سے لے کر آخری زمانہ کی مذہبی نظموں تک شاعر کے یہاں ایک قسم کے روحانی انقلاب کا احساس ہوتا ہے جو دراصل انقلاب نہیں بلکہ انتشار ہے۔

جدید ادب میں باوجود شکست وریخت کے میلانات کے مختلف اصناف میں نئے تجربے حیرت انگیز ہیں۔ شاعری میں مذہبی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی مباحث یکساں طور پر داخل ہیں۔ ڈرامے میں جدید حقیقت نگاری کو خاص مقام حاصل ہے۔ شا اور گالزوردی کے ڈرامے رومانی اور روایتی ڈراموں پر قابل قدر اضافہ ہیں۔ ان ڈراموں کے ساتھ ایکانکی ناٹک، منظوم ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے اور آپرا Opera بھی مقبول عام ہوتے جا رہے ہیں۔ ناول جدید ادب کی مقبول ترین صنف ہے جس میں داستان گوئی کے ساتھ حیات و کائنات کے مباحث بھی موجود ہیں۔ فلسفیانہ اور نفسیاتی ناول سارے اصناف ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خاص اصناف کے علاوہ انشائیہ، تاریخ نگاری، سیرت، تنقید، سفرنامے اور رپورتاژ بھی اپنا اپنا امتیازی مقام رکھتے ہیں۔

جدید انگریزی ادب بھی دنیا کے تمام مہذب ممالک کے ادب کی طرح تذبذب اور بحران کی منزل سے گزر رہا ہے۔ مادی فارغ البالی کے باوجود معاشرہ میں انتشار باقی ہے۔

اسی لیے سوائے چند مستثنیات کے انگریزی میں اعلیٰ اور صالح ادب کے نمونے کم ملتے ہیں۔
لیکن جتنے فنی اور تکنیکی تجربے اس دور میں ہوئے ہیں وہ اپنی جگہ بہت قابل قدر ہیں۔

شاعری

(الف) قنوطی شعرا: ہارڈی اور ہاؤس مین

طامس ہارڈی: ۱۸۴۰ء سے ۱۹۲۸ء

ہارڈی کے آخری ناول "جوڈ" Jude The Obscure پر دارو گیر کا
جو ہنگامہ برپا ہوا اس سے چڑھ کر اس نے ناول لکھنا چھوڑ دیا اور شاعری کو پھر اپنا
ذریعۂ اظہار بنایا۔ وہ بیسویں صدی کے اوائل میں آرنلڈ اور دوسرے قنوطی شاعروں کا
جانشین کہا جا سکتا ہے لیکن اس پر مشہور فرانسیسی مفکر روسو Rousseau کا اثر
زیادہ غالب ہے۔

اگرچہ ہارڈی ۱۸۹۸ء کے مجموعہ سے پہلے بحیثیت ناول نگار کے ہی مشہور تھا۔
لیکن اس نے ۱۸۶۰ء سے ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈارون کا
فلسفۂ ارتقا اور ماہرین معاشیات کے نظریے قدیم طرز زندگی کو جھٹکے دے رہے تھے۔
ان افکار کا اثر اس کی شاعری اور ناولوں پر پڑے بغیر نہ رہ سکا Wessex Poems
(1898) اور (1902) Poems of The Past & Present
میں وہ کبھی فطرت کو کائنات اور حیات انسانی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور کبھی اسے
ایک غیبی قوت کا نائب سمجھتا ہے۔ بہر حال وہ فطرت ہو یا کوئی پس پردہ غیبی قوت لیکن
وہ بہر حال ایک غارت گر قوت ہے (8-1904) The Dynast نپولین کے جنگوں
کا عظیم الشان رزمیہ ڈرامہ ہے جو سیکڑوں مناظر پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامہ کی ترکیب میں
بے شمار انسانی کردار اور ماورائی عنصری قوتیں شامل ہیں۔ اس منظوم ڈرامہ میں انسان
کی کمزوری اور بے بسی اور اندھی مشیت کی کارفرمائیوں کا ماتم بڑے پر گداز انداز میں کیا گیا ہے۔
۱۹۲۰ء میں ورسائی کی صلح سے اگرچہ ہارڈی کو بہت دکھ ہوا لیکن اس نے

نے اپنے ۱۹۲۲ء کے مجموعہ میں خود کو "قنوطی" کے بجائے "ارتقائیت" Evolutionary Meliorism کا حامی ظاہر کیا اس کی آخری دور کی شاعری میں ہم کو امید کی ایک تھرتھراہٹ محسوس ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو بالآخر انسان کی فلاح ونجات کے امکان کی ایک جھلک نظر آرہی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے فلسفۂ حیات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ممکن ہوسکی۔

فنی اعتبار سے ہارڈی کی شاعری کا مرتبہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن اس کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ جس زمانہ میں اس نے شاعری شروع کی تھی اس وقت انگریزی شاعری تجربوں کے دور سے گذر رہی تھی۔ سوئنبرن اور ہاپکنس شاعری میں فکر اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے نئے تجربے کر رہے تھے لیکن ہارڈی کا اثر آنے والی نسلوں پر زیادہ دیر پا رہا۔ ٹینی سن اور براؤننگ جدید سائنس کو آخری وقت تک مقابلہ کی دعوت دیتے رہے آرنلڈ اور میریڈتھ اپنے طور پر مفاہمت کی کوشش کرتے رہے اور پری رفلائٹ شعرا خواب و خیال کی دنیا میں پناہ لے کر بیٹھ گئے لیکن ہارڈی نے حقائق کو تسلیم کر کے ان کا سامنا کیا۔ اس کے یہاں غم اور غصہ سے زیادہ انسان اور مشیت کے درمیان اس ازلی رشتہ کا احساس ملتا ہے جو ایک کائناتی بصیرت کی علامت اور عظیم شاعری کی پہچان ہے۔

ہاؤس مین: ۱۸۵۹ء سے ۱۹۳۶ء

ہاؤس مین کا شمار ان شاعروں میں ہے جو شاعری کی فطری اور بے ساختہ صلاحیت کے ساتھ ساتھ علم وفضل میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ہاؤس مین کی شاعری بیک وقت اندرونی تخلیقی تحریک اور زندگی اور ادب کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ دنیائے فکر و ادب میں وہ اپنی دو مختصر نظموں کے مجموعوں یعنی A Shropshire Lad (1896) اور Last Poems (1922) کی وجہ سے مشہور رہا۔

ہاؤس مین کی حیات شعری کی ابتدا عہد وکٹوریہ کے اواخر میں ہوئی اور وہ اس دور کے حزن پرست شاعروں کے سلسلہ کی ایک آخری کڑی ہے لیکن اس کی شاعری کو فروغ اور شہرت بیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ اس کے یہاں بھی ذہنی پر تامل اداسی اور تلملاہٹ

کا احساس ملتا ہے جو آرنلڈ سے ہارڈی تک اس قبیل کے دوسرے شاعروں کا خاصہ رہا ہے۔ اپنی نظموں میں ہاؤس مین زندگی کی تلخیوں اور تشنہ کامیوں کا ذکر بڑے سوز و گداز سے کرتا ہے۔ ہارڈی کی طرح وہ بھی انسانی زندگی کی محرومیوں کو فطرت کی بے مہری کی حد تک بڑھی ہوئی بے تعلقی کا نتیجہ بتاتا ہے اور تمام بنی نوع آدم کو "جبریت" کا شکار مانتا ہے لیکن دونوں شاعروں میں اسلوب بیان اور لہجہ کی حد تک اختلاف ہے۔ ہارڈی کے یہاں باوجود سای قنوطیت کے ہمدردی اور ترس کا جذبہ موجود ہے لیکن ہاؤس مین کے یہاں تلخی کا احساس غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے دردانہ منطق فکر کے ساتھ زندگی اور اس کے تمام عوامل اور عوارض پر غور کرتا ہے۔

(ب) عبوری شاعری اور جدید رومانیت: برجز، ییٹس اور والٹر ڈی لا میئر

رابرٹ برجز

برجز عبوری دور کے ان شاعروں میں سے ہے جو عہد وکٹوریہ اور بیسویں صدی کے درمیان کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ معنوی اعتبار سے اپنے پیشروؤں سے زیادہ نزدیک ہے لیکن اس کی شاعری کی ہیئت اور روح مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے۔ اپنے ہمعصر واٹسن Watson کے برخلاف برجز جدت ادا کا اس قدر قائل نہیں جس قدر حسن معنی کا۔ اس کی شاعری میں واردات قلب کی صداقت اور جذبات کی شدت کا احساس غالب ہے اگرچہ برجز کے یہاں کلاسیکی ضبط و توازن بھی موجود ہے جس سے انگریزی شاعروں گو نے بہت کچھ سیکھا لیکن اس کا روایتی اسلوب بہت کافی حد تک ناقابل قبول ثابت ہوا۔

برجز کا پہلا مجموعہ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا لیکن اس کی اصل شہرت اس کی طویل شاہکار نظم "عہد نامۂ حسن" The Testament of Beauty کی بدولت ہوئی جو ۱۹۲۹ء میں چھپی۔ اس دوران میں اس نے ڈرامے لکھے۔ بیانیہ نظمیں تصنیف کیں اور دوسرے اصناف میں بھی طبع آزمائی کی مگر اس کی مختصر غنائیہ نظمیں ہی ان سب میں زیادہ وقیع ہیں۔ ان نظموں میں موضوعات کی وسعت کے باوجود تخیل کی بلند پروازی کم ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان میں گہر

کا چکنا پن ضرور ہے لیکن جذبات کی گرمی نہیں ملتی۔ کبھی کبھی

"Awake My Heart To Be Loved, Awake, Awake"

جیسی نظموں میں شدت احساس کا پتہ چلتا ہے لیکن ایسی مثالیں برجز کی شاعری میں کم ہیں۔ اس کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ برجز رومانی شاعروں کی طرح جذبات کی شدت کا قائل نہیں بلکہ ضبط و توازن کا حامی ہے۔

برجز کی شاعری میں سب سے اہم عنصر حسن کی تلاش ہے وہ کیٹس کی طرح زندگی اور کائنات میں حسن کی جستجو میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن اسے جنسی محبت یا ارضی حسن کی زیادہ پروا نہیں۔ وہ اس حسن کا قائل ہے جو بالآخر "حسن ماورا" سے ہمیں روشناس کرا سکے :-

All Earthly Beauty Hath One Cause And Proof
To Lead The Pilgrim Soul To Beauty Above

کیٹس کی طرح اس کے نزدیک بھی حسن ہی خیر اور حقیقت ہے اور اسی سے سارے عالم کا نظام قائم ہے یہاں تک کہ خدائی دستور بھی حسن کے تصور پر ہی مبنی ہے :-

"Beauty is The Eternal Spouse Of the Wisdom Of God
And Angel of His Presure Through All Creations"

حسن کا یہی مثبت تصور برجز کی رجائیت کا ذمہ دار ہے اگرچہ یہ تصور خود اپنی جگہ نہایت اہم ہے۔ برجز حسن کو ایک آہنگ تصور کرتا ہے جو سارے نظام کائنات کی روح رواں ہے یہ آہنگ شاعر کا ایمان ہے۔ اس تصور اور اس ایمان کا لازمی نتیجہ وہ نشاط ہے جس کا احساس برجز کی شاعری میں ہر جگہ ملتا ہے۔

برجز کے نظام فکر میں عشق کا بھی ایک خاص درجہ ہے جو اس کے حسن کے تصور سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس نے نہ صرف تصور عشق کو اپنے مجموعوں میں تکرار اور تاکید کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ فن اور زندگی پر اس کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان نظموں میں بھی وہ جذباتی شدت یا ربودگی نہیں ملتی جو دنیا کی عظیم شاعری کی پہچان رہی ہے۔ اسی طرح برجز کی نظموں میں پس منظر کے طور پر فطری مناظر بھی ملتے ہیں اور

وہ انگلستان کے دیہاتی مناظر کی عکاسی بڑے ذوق وانہاک کے ساتھ کرتا ہے لیکن اس کے یہاں نظام فطرت کے متعلق کوئی مربوط نظریہ نہیں ملتا ۔

بحیثیت ایک فنکار کے برجز کی شاعری میں متعدد خامیاں ہیں ۔ اس کے یہاں "فکر پُر تاثر" غالب ہے اور اس کی نظموں میں جذبہ اور احساس کی شدت بھی کم محسوس ہوتی ہے لیکن ان تمام کوتاہیوں کے باوجود جدید انگریزی شاعری میں برجز اپنا منفرد مقام رکھتا ہے اس کو جو کچھ مقبولیت حاصل ہے اس کا سبب انبساط اور مسرت کا وہ میلان ہے جس سے اس کی شاعری کسی موقع پر بھی خالی نہیں ہوتی ۔

ییٹس

آئرستانی شاعر ییٹس نہ صرف کیلٹک مدرسہ Celtic School کے بانیوں اور نمائندوں میں ایک ممتاز مرتبہ کا مالک ہے بلکہ اس کا شمار ان مفکروں اور فنکاروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے جدید ذہن کی تشکیل کی ۔ ییٹس انیسویں صدی کے آخری دہائی کے ان شاعروں میں ہے جو پری رفلائٹ مدرسہ سے براہ راست متاثر تھے ۔ جدید میکانکی تہذیب اور مادیت کے خلاف مارس نے عہدِ وسطیٰ کی داستانوں اور رومانوں میں فرار کی ڈھونڈھی، رازٹی نے اطالوی شعراء کی غنائیت اور احساسیت کا سہارا لیا اور سوئنبرن کو روم کی لذت پرستی اور تعیش میں سکون ملا لیکن ییٹس کے فرار کا راستہ سب سے مختلف تھا ۔ اس نے اپنے لئے ایک خیالی دنیا بنائی جہاں سائنس اور تاریخ کی تحقیقاتی جبریت کا کوئی سوال نہیں اٹھتا ۔ اس نے ماضی کو حال سے زیادہ حسین اور سکون بخش پایا اور مستقبل کو ماضی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن ماضی کا یہ تصور نسبتاً محدود تھا ۔ ییٹس اور اس کے دوسرے رفقا نے سارے مستقبل کی تعمیر آئرستان کے ماضی کے دھندلکوں سے کرنا چاہا اس لئے کہ قدیم کیلٹک روایات واساطیر ان لوگوں کے نزدیک ماضی قریب اور حال دونوں کے مقابلہ میں زیادہ جمیل، زیادہ صحت بخش اور زیادہ خوش آئند تھے ۔

ییٹس کی شاعری میں خواب وخیال کا عنصر ابتدائی دور کے کلام میں نمایاں طور

پر ملتا ہے ۔ Wanderings of Oisin اور The Lake
Isle Of INNisfree جیسی نظموں میں قدیم آئرستانی تہذیب کی رمزیہ
تصویریں ملتی ہیں جن سے شاعر کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ابتدائی دور کے کلام
میں مذہبی اور اساطیری عناصر کے ساتھ جادو اور مافوق الفطرت کی بھی کارفرمائی ہے ۔
وہ پیکر نگاری کے ذریعہ انھیں عناصر سے ایک عظیم الشان دنیا کی تخلیق کرنا چاہتا ہے ۔
شیلی کی نظموں میں پتیوں، ناؤں، ستاروں اور غاروں کے تصور سے جو فضا پیدا ہوتی
ہے وہ ییٹس کے یہاں گلاب، سفید چڑیوں، جھاگ اور مافوق الفطرت عناصر سے پیدا
ہوتی ہے ییٹس نے انگریزی اور آئرستانی شاعری کے علاوہ فرانسیسی رمز نگاروں سے
بھی استفادہ کیا ۔ ورلین Verlaine اور بلجیم کے مشہور تمثیل نگار میتر لنک
Materlinck کے اثرات اس کے مجموعہ The Wind Among
The Reeds (1899) میں بخوبی واضح ہیں ۔ ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۵ء کا مجموعۂ کلام خواب،
موسیقی اور آرزومندی کی شاعری ہے جس آئرستانی دیومالا اور اساطیر سے ایک
دلفریب فضا پیدا ہوگئی ہے ۔

چند برسوں تک آئرستانی ڈرامہ سے متعلق رہنے کے بعد جب ییٹس دوبارہ شاعری
کی طرف مائل ہوا تو اس کا انداز بیان کافی بدلا ہوا تھا The Green Helmet
& other Poems (1909-12) میں واضح طور پر بیزاری اور غم و غصہ کا
میلان موجود ہے ۔ ییٹس کی شاعری میں یہ موڑ ہمیں سترھویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر
ڈن Donne کی یاد دلاتا ہے لیکن ییٹس کے ذہن کی یہ انقلابی حرکت تصور پسندی
سے زیادہ حقیقت نگاری کی طرف تھی ۔ وہ اب کتابوں کی دنیا سے نکل کر انسانوں کی دنیا
میں آچکا تھا حالانکہ سن رسیدگی اور جسمانی انحطاط کا احساس اس کے دل میں چٹکیاں لے
رہا تھا ۔ ان عوامل کا اثر ییٹس کے اسلوب بیان پر پڑے بغیر نہ رہ سکا جو ایک طرح کی جذباتی
برودت اور اسلوب کی قطعیت کے روپ میں ظاہر ہوا ۔

ییٹس کی شاعری میں اخلاقی کٹر پن کے بجائے ایک قسم کی ارضی عرفانیت کا احساس ہوتا

ہے ۔ مافوق الفطرت اور سحر وطلسم کے ساتھ اس کے پرجوش عقیدت کی بنا پر ہم ضعیف الاعتقادی کا شبہ بھی کرسکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے زندگی کو بالکل نئے اور منفرد انداز سے دیکھنے کی کوشش کی اور اپنا نقطہ نظر پیش کیا ۔ اس کی نظم "A Vision" ان تمام انفرادی خصوصیات کی حامل ہے ۔ اس نظم میں انسانی تہذیب اور کردار کو مختلف ادوار وں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو بلیک اور سویڈنبرگ کے مجذوبانہ تصوف کی آواز بازگشت معلوم ہوتی ہے ۔

ییٹس کی عظمت کا اعتراف معاصرین کے علاوہ دور حاضر کے شاعروں نے بھی کیا ہے جو اس کی دور بدور اکتسابات شعری کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان کو قابل تقلید بھی سمجھتے ہیں نئی نسل کی شاعری میں ییٹس کی سب سے بڑی دین وہ حسین اور بلیغ ابہام ہے جس کو خواب کی کیفیت کہہ سکتے ہیں اور جو انگریزی کے بڑے سے بڑے پیش قدم نوجوان شاعر کے دیہاں بھی جا بجا ملتی ہے ۔

والٹر ڈی لامیئر

والٹر ڈی لامیئر کی شاعری میں بچپن اور خواب کی دنیا مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس حد تک دلآویز ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ شاعر نے اپنے لئے جو کائنات پیدا کی ہے وہ یادوں سے بنی ہے یا محض تخیل سے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کیٹس کی طرح ڈی لامیئر بھی رمز وایما اور اشارہ کنایہ کی زبان میں بچپن اور بلوغ کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے ۔ اس کے یہاں بچّے کے ساتھ رومانی محبت اس تمام پچھلی روایتی شاعری سے مختلف ہے جس کا موضوع بچپن رہا ہے Songs of Child hood (1902) اور Peacock Pie (1913) میں بچپن کی ایسی معصومیت اور طہارت ملتی ہے جیسے ہم کسی صاحب نظر اور بلند مذاق بچّے کی داستان سن رہے ہوں ۔ ان مجموعوں میں ایسی دنیا کا احساس ہوتا ہے جہاں خواب اور حقیقت ایک حلقۂ رفاقت میں دوش بدوش اور زانو بزانو نظر آتے ہیں اور جہاں پریاں زمین پر اتر کر انسانوں سے راز و نیاز کے ساتھ سرگوشیاں کرتی ہیں ۔ ان نظموں میں بلیک ، کولرج ، اور ییٹس کے اثرات واضح طور پر ملتے ہیں ۔

والٹر ڈی لامیئر کی شاعری میں ایک دوسری دُھن بھی ہے جو ۱۹۰۶ء کے مجموعہ میں اس کے فکری میلان اور فنی انداز دونوں میں ایک تبدیلی کا احساس دلاتی ہے۔ یہاں بچپن کی خوشیوں کا تصور بلوغ کی ذمہ داریوں سے بدل جاتا ہے یہاں تک کہ انسان اپنے کو بھری محفل میں اکیلا پانے لگتا ہے۔ اس مقام پر پہونچ کر شاعر عدم اعتماد اور بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے اور انسانی کردار میں بھی اس کو خلا اور ویرانی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ڈی لامیئر کی زیادہ دقیع شاعری وہ ہے جہاں سایہ اور دھوپ، بچپن اور پیری اور غم اور حسرت کی متضاد فضا ملتی ہے۔ اس حد تک اس کی شاعری ٹیس سے ملتی جلتی ہے۔

ڈی لامیئر کا احساس اور بالغ ذہن تین طرح سے آسودگی کی تلاش کرتا ہے —— خوابوں کی دنیا میں، موت کی پراسرار کشش میں اور بچپن کی یاد میں۔ اسے خواب میں وہ آسودگی اور تکمیل نظر آتی ہے جو بیداری میں ناممکن ہے۔ اپنی نظموں کی اسی داخلی کیفیت کی بنا پر وہ ہمیں مشہور امریکی شاعر پو Poe کی یاد دلاتا ہے۔ والٹر ڈی لامیئر عریاں بیان کا نہیں بلکہ رمزیہ اظہار کا شاعر ہے اور اس کی شاعری خواب و خیال، خوف اور موت کے احساس اور حیرت و استعجاب کی شاعری ہے۔ وہ ذہنی طور پر ٹیس کا ہمنوا کبھی نہیں ہو سکا لیکن روحانی کیفیات اور جذبات کی شدت کی بنا پر وہ آج بھی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔

(ج) عہد جارج کے شعراء

موجودہ صدی کے اوائل میں انگریزی شاعری میں چند مخصوص رجحانات بڑی اہمیت رکھتے تھے:-

(۱) درمیانی اساتذہ مثلاً ورڈسورتھ اور ٹنی سن کے توسط سے انگریزی کے کلاسیکی شعراء مثلاً اسپنسر، شیکسپیئر اور ملٹن وغیرہ کے اثرات کو قبول کرکے اپنے فکر و فن میں جذب کرنا۔

(۲) ادب میں مذہبی احیاء کی تحریک اور مابعد الطبیعاتی اور صوفی شاعروں مثلاً ڈن، واہن Vaughan اور کراشا Crawshaw وغیرہ کے کلام کا

پر خلوص مطالعہ۔

(۳) جمالیاتی رجحانات یعنی پری رفلائٹ تحریک اور رمزیت سے گہرا تعلق۔

(۴) حقیقت آمیز تاثرات کی طرف رجحان۔

(۵) فطری شاعری اور دیہات، سمندر اور رومانی موضوعات سے دلچسپی۔

یہ سارے میلانات کسی نہ کسی روپ میں عہد جارج کے شاعروں کے یہاں ملتے ہیں۔ اس گروہ میں روپرٹ بروک اور میسفلڈ جیسے مشہور فنکاروں کے علاوہ ابرکرامبی Abercrombie اور جان ڈرنک واٹر J. Drink Water جیسے شعرا بھی شامل ہیں۔ ان سب شاعروں کے یہاں ایک مخصوص غنائیت کے ساتھ جدید تہذیب کے خلاف مدھم باغیانہ انداز ملتا ہے۔ ان شاعروں نے منظوم ڈراموں کے ذریعے جذبات کی آفاقیت پر زور دیا اور آسکر وائلڈ اور اس کے پیروؤں کی پر تکلف سادگی اور پیدا کردہ بے ساختہ پن سے احتراز کیا لیکن چونکہ ان فنکاروں نے ساتھ ہی ساتھ مادی اور خارجی دنیا کے مسائل سے بھی بے نیازی برتی اس لئے ان ڈراموں میں کوئی حرکت اور زندگی نہیں ملتی۔

عہد جارج کے انگریزی شاعروں میں روپرٹ بروک اور جان میسفلڈ بالخصوص قابل ذکر ہیں اسلئے کہ ان کے یہاں نہ صرف اس دور کی تمام خصوصیات ملتی ہیں بلکہ ان کا لب و لہجہ بھی منفرد ہے۔

روپرٹ بروک

سر فلپ سڈنی کی طرح جنگ عظیم کے دوران بروک کی موت نے اسے وہ مقبولیت بخشی جو اس شاعری کی بدولت تھی جس کی روح رواں وطنیت ہے۔ اسے انگریزی خواں طبقہ نے صاحب فن کی حیثیت سے کم اور ایک نوجوان، باہمت اور زندہ دل شاعر کی حیثیت سے زیادہ یاد کیا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد بروک فیبین جماعت Fabian Society کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اس تعلق کا اثر بھی کچھ دنوں تک اس پر باقی رہا لیکن جلد ہی اس کو اس جماعت کی غلط اندیشی اور تخیلی افلاس کا احساس ہو گیا اور بالآخر اس سے

اس جماعت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ سیاست سے علیحدگی کے بعد اس نے اپنے لئے محض
تین کام مخصوص کر لئے ——— مطالعۂ شعر، شعر گوئی اور مجسم شعر ہونے کی کوشش
ابتدا میں بروک اٹھارھویں صدی کے شاعروں سے زیادہ متاثر رہا لیکن جلد ہی وہ
ان کے حلقۂ اثر سے باہر نکل آیا۔ اس نے سمندری بیماریوں پر نظمیں لکھیں اور کلاسیکی ہیروں
کو بھی موضوع سخن بنایا۔ بروک پر ڈیٹس اور دوسرے انحطاطی تصور پرست شاعروں کا بھی
اثر رہا۔ چنانچہ اس سے اگر ایک طرف اس کی شاعری میں جسمانی لذتیت کا میلان پیدا ہوا
تو دوسری طرف جسم اور روح کے درمیان عدم توازن کا احساس بھی بڑھنے لگا۔ فطرت کے
متعلق بھی بروک کا نظریہ فلسفیانہ نہیں تھا۔ وہ محض فطرت کے ظاہری حسن سے اثر قبول
کرتا تھا۔ اپنی مشہور نظم The Great Lover میں اس نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ شاعری
میں سماجی شعور بھی لازمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ترقی" کے بارے میں کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا
سکتا کہ وہ ممکن ہے یا نہیں لیکن "انقلاب" سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔ جب زندگی میں اس قدر
ہماہمی ہے تو ہمیں قنوطی یا فراری بننے کی ضرورت نہیں۔

ایام جنگ میں روپرٹ بروک کی شاعری کے ساتھ بڑے شغف اور ولولہ کا اظہار کیا گیا
لیکن اس کے فوراً بعد ردعمل بھی شروع ہو گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے مجموعۂ کلام کو پیش نظر رکھتے
ہوئے اسے بڑے شاعروں میں شامل کرنا مناسب نہ ہوگا لیکن اس کے یہاں اچھی شاعری کے
کچھ عناصر ضرور ملتے ہیں۔ اس کے مجموعہ "۱۹۱۴ء" کی نظموں میں جو سنجیدگی ملتی ہے وہ اس بات کا
احساس دلاتی ہے کہ وہ ہم کو فکر و نغمگی کی کن اچھوتی وادیوں کی طرف لے جا سکتا تھا لیکن وہ
نوجوان مرا اور اس کی صلاحیتیں روبہ کار نہ آسکیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا
ہے کہ بروک کو زندگی کو پرکھنے اور اپنے تجربوں کو براہ راست نظم کرنے پر بڑی قدرت حاصل
تھی اور شاید وہ زندہ رہتا تو شاعری کے اور دوسرے ایسے راستے نکالتا جو نئی نسل کے
لئے زیادہ سزاوار اور مبارک ثابت ہوتا۔

جان میسفلڈ

میسفلڈ کی ادبی زندگی اس کی شخصیت کے دو متضاد پہلوؤں کے درمیان ہم آہنگی

کی کوشش ہے۔ ایک طرف تو وہ ٹھوس اور سنگین مادّی زندگی کی کثیف حقیقتوں سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف اس کے اندر فطری طور پر معیاری تہذیب اور شائستگی کی آرزو بھی شدّت کے ساتھ کارفرما ہے۔ یہ متضاد کیفیت Everlisting Mercy اور Daffodil Fields جیسی نظموں میں ملتی ہے جن میں شر سے خیر اور بدصورتی سے حسن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر حقیقت پسندی اور تصور پرستی کے درمیان مفاہمت کی آرزو کا سب سے زیادہ کامیاب اظہار اس کے Reynarda The Fox میں ملتا ہے۔ اس شاہکار نظم میں میسفلڈ نے چاسر بالخصوص اس کے "تمہیدیہ" Prologue سے استفادہ کیا ہے اور اگرچہ اس کے یہاں چاسر کی ظرافت اور فنی چابکدستی نہیں ملتی لیکن اس کا یہ کارنامہ بیسویں صدی کی طویل نظموں میں ایک قابل لحاظ مقام رکھتا ہے۔

میسفلڈ کی شاعری میں تاثریت اور حسن آفرینی کو بھی بڑا دخل ہے۔ ایک فنکار کے لئے حسن کی شعوری تلاش نازک مرحلہ ہوتی ہے۔ انحطاطی شعراء اس سلسلہ میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انھوں نے حسن کو دوسرے عوامل سے الگ کر کے پیش کیا اور اہل تشکیک حسن مطلق کے مبہم اور غیر قطعی تصور میں سرگرداں رہے لیکن میسفلڈ کے یہاں "حسین لمحات" کی تلاش زیادہ اہم ہے۔ The Days That Make Us Happy Make Us wise اپنی مشہور نظم Hollingdon Downs میں اس نے حسن کا داخلی نظریہ پیش کیا ہے۔

عہد جارج کی شاعری بیسویں صدی کے اوائل میں نئی رومانی تحریک کی شباب ہے اور غنائیت اس دور کے شاعروں کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت ہے۔ اگرچہ ان شاعروں نے سماجی اور ذہنی زندگی کی ترجمانی بھی کی لیکن بنیادی طور پر ان کی شاعری روایتی رومانی شاعری ہی کی گونج ہے اسی لئے ایڈورڈ مارش کا یہ کہنا صحیح تھا کہ اس کے قلمی معاونوں کی تصانیف میں کوئی خاص تازگی موجود نہیں۔ اس کے باوجود اس دور کے شاعروں کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ ایک زمانہ تک ان شاعروں نے تصوریت اور رومانی جمال پرستی کی ترویج

اشاعت میں بڑا حصہ لیا اور اپنی حد تک اس تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں ورڈسورتھ، کولرج یا شیلی کا ذہن موجود نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے بیسویں صدی میں انگریزی رومانیت کو ایک خاص موڑ دیا۔

د پیکر نگار شعراء

پہلی جنگ عظیم سے قبل انگلستان میں ذہنی اور ادبی فضا بہت حد تک بین الاقوامی ہونے لگی تھی۔ روسی ناچ Ballet سے موسیقی اور اسٹیج کی دنیا ایک حد تک متاثر ہوئی۔ تاثریت Impressionism، مکعبیت Cabism اور دوسرے فنی اجتہادات عام ہونے لگے مگر اس کے ساتھ ہی ذہین طبقہ میں ایک قسم کی بے چینی اور کرب کے آثار بھی نمایاں ہو رہے تھے۔

پیکر نگار شعرا بھی عہد جارج کے شاعروں کی طرح مجموعوں کے ذریعہ متعارف ہوئے ۱۹۱۴ء میں Des Imagists اور اس کے بعد مسلسل تین سال تک Some Imagist Poets نے پڑھنے والے طبقہ میں ان شاعروں کو اچھی طرح روشناس کرادیا۔ اس تحریک کے تین خاص انگریزی اراکین T. E. Hulme، Richard Aldington اور B. S. Flint تھے۔ امریکی اراکین میں Ezra Pound، H. D. (مابعد بیگم ایلڈنگٹن) اور Amy Lowell پیش پیش تھے۔

سب سے پہلے ہیولم نے ۱۹۰۸ء میں شاعروں کا ایک کلب قائم کیا جس میں انگریزی شاعری میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے نظم معرّیٰ اور جاپانی اور چینی شاعری سے اثرات قبول کرنے کی تلقین کی گئی۔ یہ مدرسہ ۱۹۱۷ء کے بعد منتشر ہو کے رہ گیا لیکن اس کے اثرات عصری شاعری پر پڑے بغیر نہ رہ سکے۔ ہیولم نے اپنے "اندازے" Speculation میں جس جمالیاتی نظریۂ شاعری کا ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ مستقل تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ ہیولم خود برگساں Bargson سے متاثر تھا اس لئے وہ منطق کی بجائے وجدان کا قائل تھا اور بیان و

اظہار میں قطعیت کا حامل۔ فرانسیسی ادیب گورماں Gourmont کے زیر اثر اس نے "لفظ" کا مسلک عام کیا جو آئندہ جدید شاعری کی ترکیب اور اس کے مزاج میں شعوری یا غیر شعوری طور پر قابل لحاظ حد تک دخیل ہوئی۔ اس کے نزدیک شاعری الفاظ کے نقش و نگار سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ اسی بنا پر اس نے الفاظ کی واضح، قطعی اور انفرادی اہمیت پر زور دیا۔

پیکر نگاروں کے خاص اصول حسب ذیل ہیں :۔

(۱) موضوعات کا آزادانہ انتخاب اور براہ راست اظہار۔

(۲) اختصار اور ایجاز بیان

(۳) جدت اسلوب (آزاد نظم)

(۴) شبیہیت Imagism

(۵) "ارتکاز" Contentration اور "عضویاتی آہنگ" Organic Rhythm کا استعمال۔

پیکر نگار شاعروں نے طرز ادا اور اسلوب بیان کو پیکر نگاری سے الگ کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ہی افکار اور خیالات سے بے اعتنائی برتی۔ چنانچہ ایذرا پاؤنڈ نے یہ ہدایت کی تھی کہ پیکر نگاروں کو فلسفیانہ یا بیانیہ شاعری کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہیئے۔ بنیادی طور پر ان شاعروں نے تاثریت پسندوں Impressionists سے اثرات قبول کیے اور واقعات و کیفیات کو فوری تاثرات کے توسط سے سپرد قلم کرنے کی کوشش کی۔ اس نقطے سے ان لوگوں نے طویل اور رزمیہ نظموں کی مخالفت کی جن میں جذبات کے اظہار میں ناہمواری ہو سکتی ہے۔ ان کے نزدیک ہومر اور ملٹن کی شاعری مختصر نظموں کا سلسلہ ہے جن میں شعری کیفیات سے بھرپور بند نثر کے غیر شعری ٹکڑوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ جب تک ان اصولوں پر سختی کے ساتھ عمل کیا گیا اس وقت تک تاثراتی تحریک کی بنا پر طویل نظموں کا لکھنا ناممکن ہو گیا تھا لیکن رفتہ رفتہ ایذرا پاؤنڈ ہربرٹ ریڈ اور ٹی ایس۔ ایلیٹ کے یہاں اس نظریۂ شاعری سے بیزاری کا احساس بڑھنے لگا۔ ان

شاعروں نے نظم نگاری میں ایک نئی تکنک پر طبع آزمائی کی جس میں رمز و کنایہ کو منطقی ربط اور تاریخی تسلسل پر ترجیح دی گئی۔

رمز نگاروں Symbolists اور پیکر نگاروں Imagists میں بنیادی فرق بھی ہے۔ رمز نگاروں نے احساسات اور جذبات کے باہمی علائق کو عام لغات و محاورات کے بجائے غیر مانوس اور غرابت کی حد تک نازک تشبیہات کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی۔ بلارمے Mallarme اپنی شاعری میں سیدھے الفاظ کی جگہ تشبیہات و استعارات کا ایک مجموعی آہنگ پیدا کر کے رموز کے پردہ میں کیفیات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ اس کے برخلاف پیکر نگاروں کے یہاں مقصد اور تکنک کے لحاظ سے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا۔ یہ شعراء براہ راست اور واضح مگر مختصر بیان کے قائل تھے۔ ان کے یہاں الفاظ کی رمزیت اور تشبیہات و استعارات کی غرابت نہیں ملتی۔

انگریزی اور امریکی پیکر نگار شاعروں میں ایذرا پاؤنڈ Ezra Pound سب سے نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ اس کے کردار شعری میں مختلف اثرات کار فرما ہیں لیکن جمالیاتی خصوصیت حاوی ہے۔ پاؤنڈ کو محض پر تکلف رنگینی سے ہی دلچسپی نہیں بلکہ اس کے یہاں انگلستان کے درمیانی طبقہ کے خلاف اشتعال انگیزی بھی ہے جس سے اس کے باغیانہ ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔

ایذرا پاؤنڈ کی شاعری میں فرانسیسی اثرات کے علاوہ مارکس کی تخیلی اشتراکیت اور ییٹس کی جدید متصوفانہ تصوریت کا پرتو بھی ہے جو ابتدائی دور کے کلام میں نمایاں ہے۔ ان مواخذ کے علاوہ اس نے عہد وسطیٰ اور نشاۃ الثانیہ کے فرانسیسی اور اطالوی ادب سے بھی استفادہ کیا ہے جس کی بنا پر اسے عروض و قافیہ اور مختلف بحروں میں آزاد تجربہ کا موقع ملا۔ پاؤنڈ کی شاعری بہت حد تک تکنک اور تجربہ کی شاعری ہے جس میں خاص نظام فکر کی گنجائش نہیں لیکن اس کے یہاں جمالیاتی نظریہ کی حمایت ہر جگہ نمایاں ہے۔

"مابرلے" Mauberley پاؤنڈ کے شاہکار نظموں میں شامل ہے جس میں پہلی دفعہ ہمیں فکری تسلسل ملتا ہے۔ یہ مجموعہ ایک دستاویز ہے جس سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ شاعر کو

اپنے عہد سے کیا تعلق ہے۔ یہاں وہ ایسے تماشائی کی طرح اپنی ذات اور ماحول کا جائزہ لیتا ہے جس کے تمام التباسات دور ہوچکے ہیں اور جو خود تلخ بے تعلقی کی منزل تک پہونچ گیا ہے۔ اس مجموعہ میں پاؤنڈ نے کائناتی تشبیہوں، دور از کار تلمیحوں اور کلاسیکی نظموں کے مستعار فقروں کے ذریعہ کم سے کم الفاظ میں ایک خاص فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں وہ مابعد الطبیعاتی اور تجریدی اسلوب بیان کی بنا پر اپنے معاصرین کے فاضلانہ تصنع اور عالمانہ تکلف سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اس نظم کو آرنلڈ کی زبان میں "تنقید حیات" کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔ یہی مشکل پسندی Homage To Sextus Propertius (1934) میں موجود ہے جہاں پاؤنڈ نے کلاسیکی شاعر سکٹس کے مرثیوں کا بے تحاشہ ترجمہ کیا ہے۔ اسے لاطینی شاعری کا بلیغ اختصار اور اس کی تلمیحیں بہت مرغوب ہیں لیکن وہ اس اسلوب کو کامیابی کے ساتھ نہیں نبھا سکا۔

پاؤنڈ کے سب سے دلچسپ اور شہرۂ آفاق کارنامے اس کے منظوم پارے Cantos ہیں جن میں وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے ماضی کو استعمال کرتا ہے۔ ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو فنون، تاریخ، ادب اور مذہب کے تقابلی مطالعہ پر کسی پریشان خیال شاعر کی آشفتہ بیانی سے سابقہ ہے۔ ان منظوم پاروں میں کلاسیکی اور تواریخی تلمیحوں کے ذریعہ جذباتی مصوری کی کوشش کی گئی ہے لیکن کسی مرکزی خیال کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی لئے نقادوں نے اسے "لازمانیت کا رزمیہ" Boic Of Timelessness کہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاؤنڈ کا شعری تجربہ غیر مربوط مناظر کا مجموعہ ہے اور اس کی کائنات محض پیکر نگاری ہے۔ اسکر وائلڈ نے کبھی یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ بغیر پلاٹ کے کوئی ناول اس طرح لکھے جیسے ایرانی قالین ہو، شعوری یا غیر شعوری طور پر پاؤنڈ کا بھی یہی مطمح نظر معلوم ہوتا ہے۔

۷ فلسفیانہ رمز نگاری: ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں ذہنی اور روحانی انتشار سے اگرچہ "رومانیت"

کو کوئی خاص صدمہ نہیں پہونچا لیکن جنگ کے بعد معاشی اور روحانی خلفشار نے رومانی نظریہ شعر و ادب کی جگہ حقیقت نگاری کے لئے میدان ہموار کیا۔ اب انگریزی میں ایسے شعرا نظر آنے لگے جو کلاسیکی شاعری، جدید سائنس اور سترھویں صدی کے مابعد الطبیعاتی M:taphysical شاعری سے براہ راست اثرات قبول کر رہے تھے اور ان کو سمو کر شاعری میں ایک نیا مزاج پیدا کر رہے تھے۔ ان شاعروں میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔ اس کی شاعری میں جدید نفسیات، بشریات، رمز نگاری اور فلسفہ کا بہترین امتزاج ملتا ہے اور اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ مغربی یورپ کی ذہنی اور روحانی کشمکش کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا ہے۔

شعر و ادب میں ایلیٹ اپنے پیشرو میتھو آرنلڈ اور اپنے ہمعصر ٹی۔ ای۔ ہیومل کی روایتوں کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ انھیں کے اثر سے اس نے رومانی نظریۂ ادب پر کلاسیکی روایت کو ترجیح بھی دی ہے۔ "شاعری جذبات کا اظہار نہیں بلکہ جذبات سے فرار کا نام ہے"۔ یہ سبق اس نے پیکر نگاروں سے سیکھا اور فرانسیسی رمز نگاروں اور مابعد الطبیعاتی شاعروں سے استفادہ کر کے جدید انگریزی شاعری کو نئے راستہ پر لانے میں کامیاب ہوا۔

ایلیٹ کا ابتدائی مجموعۂ کلام —— Prufrock & Other Observations (1917) معنوی اور صوری اعتبار سے ایک اجتہادی اقدام ہے ان نظموں میں اس نے عہد وکٹوریہ کی خود آسودگی کے خلاف جدید زندگی کی تلخیوں اور اس کے دردناک پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں زندگی کے موجودہ نظام سے بیزاری اور کسی بہتر نظام کی حسرت کا رومانی اضطراب کے ساتھ اظہار خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں ماضی کی شاندار روایات کے برخلاف حال کے کھوکھلے پن کا زیادہ شدت سے احساس ہوتا ہے اور ہم کو اندازہ ہونے لگتا ہے کہ شاعر کا اصل میلان کیا ہے اور وہ آگے چل کر کیا ہوگا۔

"خرابہ" The Wasteland (1922) میں ایلیٹ کی مزاج شعری نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جدید یورپ کی روح کو رزمیہ انداز میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ یہ مغربی انسان کے زوال کا مرثیہ بھی ہے اور مستقبل کا خیر مقدم بھی۔

یہاں شاعر مغربی تہذیب کے "شکستہ اصنام" Broken Images کا ماتم کرتے کرتے ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہے کہ اس کو خود اپنی آواز صدا بصحرا معلوم ہوتی ہے۔ ایلیٹ نے مس ویسٹن کے "رسوم سے رومان تک" "From Ritual To Romance" نامی کتاب کو اپنا ماخذ بنایا ہے جس میں خشک سالی اور قحط کی مدافعت کسی مرد غازی کے ذریعہ "مقدس پیالہ" Holy Grail کی بازیافت پر منحصر ہے۔ ایلیٹ کے نزدیک یورپ ایک "خرابہ" ہے اور اسے نئی زندگی دینے کے لئے ابر رحمت کی ضرورت ہے جو خود آسودگی اور مادی فارغ البالی سے نہیں بلکہ روحانی ریاضتوں اور حالات حاضرہ کے مکمل جائزہ سے ہی ممکن ہے۔

"خرابہ" کسی طرح بھی عام فہم نظم نہیں کہی جا سکتی اس لئے کہ جب تک کسی کو دانتے، سترھویں صدی کے شعری و ڈرامائی ادب، بدھ مت، قدیم دیومالا، جدید نفسیات اور بشریات سے واقفیت نہیں اس وقت تک اسے سمجھنا دشوار ہے لیکن اس مشکل پسندی کے باوجود نظم کی نغمگی اور اس کے فنی حسن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جدید مغربی معاشرت پر جو سنبھلا ہوا طنز اور پیغمبرانہ جستجو اس میں موجود ہے وہ جدید شاعری میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ نظم کی ترکیب حسب ذیل ہے :۔

پہلے باب میں "مردوں کا دفن" "Burial Of The Dead" کے عنوان سے شاعر موسم بہار میں خزاں کی علامتوں کا نوحہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس موسم میں بھی پیدائش اور افزائش کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ "خرابہ" دراصل ہمارا معاشرہ ہے جسے ہم "شکستہ اصنام" کا ڈھیر کہہ سکتے ہیں :۔

"A Heap Of Broken Immages Where The Sun Beats
And The Dead Tree Gives No Shelter, The Cricket
No Relief And The Dry Stone No
Sound Of Water",

[ٹوٹی ہوئی مورتیں جن پر سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں
جہاں سوکھے درختوں سے سایہ نہیں ملتا اور جھینگر کی آواز سکون نہیں پیدا کرتی

اور جہاں سوکھے پتھروں سے پانی کی کوئی آہٹ نہیں ملتی]

نظم کے اس حصّہ کا خاتمہ لندن کی مصنوعی دلفریبیوں پر ہوتا ہے۔

دوسرے باب "شطرنج کے کھیل" A Game Of Chess کے پردہ میں شاعر ہم کو جدید عورت کی نفسیات سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈرائنگ روم کی مصنوعی معاشرت نے زندگی اور بالخصوص عورت کی زندگی میں جو میکانکیت اور بے کیفی پیدا کردی ہے۔ مندرجہ ذیل سوال اس کی طرف قطعی اور واضح اشارہ کرتا ہے:۔

What Shall We Do Tomorrow ?

What Shali We Ever Do ?

[کل ہم کیا کریں گے ؟

(اور سچ تو یہ ہے کہ) ہم کبھی بھی کیا کرسکتے ہیں ؟]

اور اس عورت کا رفیق جواب دیتا ہے کہ دس بجے غسل، شام کو کار میں تفریح اور اس کے بعد شطرنج کا کھیل۔

شطرنج اور تعیش کی زندگی اور ہوٹلوں اور ناچ گھروں کی مصنوعی تہذیب یہ جیسے گوری الیٹ کا ہی کارنامہ ہے۔

تیسرے باب "وعظ آتشیں" The Fire Sermon میں بیزاری کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے اور شاعر کو گوتم بدھ کی نصیحتیں یاد آتی ہیں جب انھوں نے عیش و عشرت کو خیرباد کہہ کے نفس پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ الیٹ کے نزدیک جدید معاشرہ بدھ جیسے نفسوں سے خالی ہے اور یہاں سنت آگسٹن جیسے خدا پرست اور صوفیوں کا خیال ہی وہم ہے۔

چوتھے باب "پانی کے کنارے موت" Death By Water میں زندگی اور زندگی کے تعیشات کی بے ثباتی پر نظر ڈالی گئی ہے۔

پانچواں باب "بادل کی گرج کیا کہتی ہے" What The Thunder Said ساری نظم کا نچوڑ ہے۔ یہاں شاعر لندن کی مصنوعی زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرنے کی کوشش

کرتا ہے :-

Here Is No Water But Only Rock,

Rock And No Water And The Sandy Road

The Road Winding Above Among The Mountains

Which Are Mountains Of Rock Without Water

[یہاں پانی کا پتہ نہیں محض چٹان ہی چٹان ہیں۔
چٹان مگر پانی سے محروم اور ریتلی سڑک !
سڑک جو پہاڑوں پر بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔
پہاڑ جو بغیر پانی کے چٹانوں سے بنے ہیں]

اس ویرانہ میں ہم سب تشنہ سراب ہیں۔ یہاں دو ساتھ چلتے ہیں تو تیسرا سایہ بھی ہم قدم ہوتا ہے۔ غم و حسرت کے پر درد نالے ہیں اور پھر خطرناک منزل۔ مندر تک پہونچنے پر سناٹا ہے مگر مرغ کی بانگ سنائی دیتی ہے۔ ابر رحمت جوش میں آتا ہے اور سوکھی زمین سیراب ہو جاتی ہے۔ بادل سے نغمہ سنائی دیتا ہے ———— دا ' دیا دھوم اور دمتیا ———— خود سپردگی، ہمدردی اور نفس کشی۔ یہی نجات کے ذرائع ہیں۔

"خرابہ" بہت معنوں میں جدید معاشرت کا عہد نامہ ہے۔ فکر کی موسیقیت، الفاظ اور محاورات کے در و بست اور ایسے دقیق نفسیاتی تجزیہ کے ساتھ اس قدر وسیع اور بلیغ موضوع کو چار سو اشعار میں نظم کرنا بجائے خود ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ایلیٹ کی دوسری مشہور نظم "کھوکھلے انسان" The Hollow Man ہے جس میں وہی خیالات کارفرما ہیں جو جنگ عظیم کے بعد عام ہو گئے تھے زندگی کی خرابیوں اور روحانی خلفشار کی ترجمانی کے بعد شاعر کہتا ہے :-

This Is The Way The World Ends

This Is The Way The World Ends

Not With a Baug But A Whimper

[ہماری زندگی یوں ہی گزرتی ہے
یوں ہی گزرتی ہے
گھن گرج کے ساتھ نہیں بلکہ پھپک پھپک کر]

سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھی ہوئی نظم Ash Wednesday، نقادوں کے نزدیک ایلیٹ کی بہترین نظم ہے جس میں شاعر ذاتی نجات کے لئے کوشاں نظر آتا ہے۔ "خرابہ" میں وہ جس تذبذب سے دوچار تھا اس کا ازالہ اس مذہبی نظم سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ یہاں شاعر اپنے دور کی مادیت سے بیزار ہو کر خدا، مذہب اور نجات کے مسئلہ کو بخوبی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ نظم کے پہلے حصہ میں روح انسانی دنیا سے منہ پھیر کر مراقبہ کی مسرتوں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ دوسرے حصہ میں شاعر نے روحانی موت کا تصور پیش کیا ہے۔ تیسرے حصہ میں روح کا سفرنامہ ہے۔ انسانی روح زندگی کے آلام سے تنگ آکر آسمان کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ راستہ کے مختلف موڑوں پر اسے تاریکی، تباہی اور نحوست سے سابقہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنا راستہ نکالتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے چوتھے حصہ میں روح کو خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اسے غیبی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ پانچویں حصہ میں شاعر "خواہران نقاب پوش" Veiled Sisters سے خدا کے گمراہ بندوں کی نجات کے لئے دعا کرتا ہے۔ آخری حصے میں روح کی خیر و شر سے کشمکش دکھائی گئی ہے۔ اس نظم میں "طربیہ الہامی" کے خالق اطالوی شاعر دانتے کا اثر نمایاں طور پر غالب ہے اور شاعر کا مطمح نظر اس کے اثباتی تصور کی نمائندگی کرتا ہے۔

دور اول کی ان شاہکار نظموں کے بعد ایلیٹ منظوم ڈرامہ کی طرف متوجہ ہوا اور پھر اس نے The Rock (1934) Murder In The Cathedral (1935) Cocktail Party (1944) اور Family Reunion (1950) Party تصنیف کیں۔ ان ڈراموں کے مذہبی رجحان نے ایلیٹ کو انگریزی کلیسا کا مبلغ بنا دیا ہے لیکن اس سے اس کی شہرت اور مقبولیت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ ایلیٹ کی جدید شعری کوششوں میں The Four Quartets ۱۹۴۴ء

The Dry Salvages اور Burnt Norton (1941)

وغیرہ ہیں۔ ان مجموعوں میں بھی مذہبی احیار اور اثباتی نقطۂ نگاہ کی کارفرمائیاں ہیں۔ ابتدائی طنزیہ اسلوب کی جگہ اب شاعر کے مزاج میں اعتدال اور توازن کو زیادہ دخل ہے۔ اسکی روحانیت بہت حد تک عیسائی متصوفین کی یاد دلاتی ہے اور اس کی شاعری کا مرکزی تصور مسیحیت ہے۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان ایلیٹ انگریزی شاعری میں سب سے زیادہ موثر قوت رہا ہے۔ اس کا دائرہ اثر محض فن اور تکنیک تک محدود نہیں بلکہ اسکی حیثیت ایک ژرف نگاہ نقاد کی بھی ہے۔ اگر ایذرا پاؤنڈ نے "ماؔبرلے" میں سماجی تنقید کو راہ دی تو ایلیٹ نے جدید تہذیب کے رُوبہ زوال معیاروں کا پردہ فاش کیا اور اپنے طریقہ پر نئی قدروں اور نئے معیاروں کی طرف اشارے بھی کئے۔

(س) جدید رجحانات :۔

انگریزی شاعری کے جدید ترین دور میں ہم کو کچھ نئے میلانات اور نئے تجربے ملتے ہیں جو نئی توانائیوں کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یورپ کے فکر وادب سے ہم آہنگی اور امریکہ سے ذہنی اور ثقافتی قرب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ ان عوامل کی بنا پر شاعروں اور ادیبوں کے مطمح نظر میں نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود انفرادیت اس قدر غالب ہے کہ ان کو کسی ایک مدرسہ یا ایک تحریک کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ کزمیاں نے انگریزی ادب کے عصری دور پر تبصرہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ اس میں اتنے ہی میلانات ہیں۔ جتنے لکھنے والے۔

جدید شاعروں میں "ایڈمنڈ بلنڈن" Edmund Blunden اور رابرٹ گریوس Robert Graves کے علاوہ سرریلی Surrealist تحریک کے شاعروں کو بھی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ دوسری طرف ترقی پسند شاعروں کے مقابلہ میں نفسیاتی اور داخلی انداز کے فنکاروں نے بھی اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ شاعری میں داخلی میلان کا سب سے

اہم نمائندہ شاعر "دلان طامس" Dylan Thomas ہے۔ اس کی شاعری میں رومانی عناصر اور شدید انفرادیت کے امتزاج سے ایک خاص دلکشی پیدا ہوگئی ہے ۱۹۳۷ء میں "نئی شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے دلان طامس نے کہا تھا کہ "نظم جتنی ہی داخلی کیفیات کی حامل ہوگی اسی قدر اس کے بیانیہ خطوط واضح ہوں گے"۔ فکر و خیال کی اسی وضاحت کی بنا پر وہ اپنے موضوعات کو شعور اور لاشعور کی گہرائیوں میں لے جاکر بھی مبہم نہیں ہونے دیتا لیکن فرائڈ کے اثر سے اس کے یہاں محبت، ارتقا اور مذہب وغیرہ دبے ہوئے جنسی محرکات کے تابع معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے نقادوں نے اسے ہاپکنس اور جیمس جوائس سے زیادہ قریب بتایا ہے۔

جدید انگریزی شاعری میں جن مشاہیر کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے ان میں تین ترقی پسند شاعروں آڈن، اسپنڈر اور لیوس کا کلام قابل لحاظ ہے۔ ان کی شاعری میں امید و رجائیت کے ساتھ عملیت اور تصوریت کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔ ان کے یہاں سماجی شعور بھی محض سطحی خارجیت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل آہنگ ہے۔ اگرچہ یہ شعرا اشتراکی نظریوں سے متاثر ہیں لیکن ان کی اشتراکیت مارکس کے بجائے شیلی سے زیادہ نزدیک ہے یہ لوگ جدید تہذیب کے صحتمند عناصر کو قبول کرتے ہیں اور انسان کے ایجادات اور مصنوعات کے ساتھ ساتھ قدرت کے مناظر اور اس کی قوتوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آڈن W. H. Auden کے یہاں شاعرانہ بے راہ روی اور طنز کے عناصر اشتراکی نظریات سے مخلوط نظر آتے ہیں۔ صوری طور پر وہ شاعرانہ روایات سے انحراف بھی کرتا ہے اور قواعد اور عروض سے لاپرواہی بھی برتتا ہے لیکن جذبۂ اصلاح سے مغلوب ہوکر وہ اکثر طنز پر آجاتا ہے۔ ابتدائی دور میں اس کے یہاں رومانی مہمات اور جذباتی طور پر فوجی خدمات انجام دینے کا ولولہ موجود تھا لیکن رفتہ رفتہ A Happy New Year اور Birthday Ode سے اس کا ذہنی میلان بدلنے لگا۔

۱۹۳۶ء میں "A Scent Of F6" لکھ کر آڈن نے بڑی مقبولیت حاصل کرلی۔ اس منظوم ڈرامہ میں اس نے کوہ پیمائی اور تحقیق و تفتیش کی سماجی اہمیت

سے جنسی اور عملی اور تصوراتی کشمکش کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ڈرامے کی اہمیت رمز و کنایہ سے زیادہ کرداروں مثلاً سیاست دانوں، مبلغوں اور مخاطب عوام کی بدولت ہے۔ اپنی نظم "اسپین" میں آڈن نے جمہوری خیالات کا اظہار کیا ہے اور سیاست داں سے زیادہ انسان دوست ماہر نفسیات نظر آتا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی پر اس کے یہاں بھی غم کا شدید احساس ملتا ہے :۔

The Stars Are, Dead, The Animals Will Not Lock
We Are Left Alone With Our Day, And The Time
Is Short And History To Be Defeated May Say Alas
But Cannot Held Ner Pardon

[ستارے مردہ ہو چکے ہیں۔ جانوروں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔
ہم میدان میں اکیلے رہ گئے ہیں اور وقت کم ہے !!
اور تاریخ کی شکست پر نہ تو ماتم کئے بنتا ہے اور نہ اس سے درگزر
کیا جا سکتا ہے]

New Year Letter (1941) اور Another Time (1940)
The Age Of کے علاوہ For The Time Beirg (1945)
Arxiety (1948) اس کے اہم شعری مجموعے ہیں۔

آڈن اب اگرچہ امریکی شہری ہے لیکن تیسری دہائی کے آکسفورڈ گروپ کے نوجوان شاعروں بالخصوص Louis Macneice کے لئے اب تک ایک مؤثر قوت ہے۔ حال میں ذہن اور تکنک میں تبدیلی کے ساتھ اس کے خیالات میں کافی بدل چکے ہیں اور اس کی اشتراکیت پر تشکیک اور قنوطیت غالب آنے لگی ہے۔ اس طرح زندگی کے عصری مسائل نے اس کو تذبذب اور تردد کے دور The Age Of Anxiety کا ترجمان بنا دیا ہے۔

اسپنڈر Stephon Spender کی شاعرانہ صلاحیتیں آڈن سے

مختلف ہیں۔ اس کے یہاں نہ تو وہ زور بیان ہے اور نہ وہ طنز کا ملکہ لیکن ابتدائی دور کے کلام میں اس کے یہاں روپرٹ برک کی طرح ایک احساسی کیفیت ملتی ہے۔ ان لفظوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ رومانی احساسات اور انقلابی تصورات کو ملا کر ایک آہنگ بنا سکتا ہے۔ اس دور کے بعد کی شاعری میں اسپنڈر مشینی علامتوں اور پیکروں کا بھی استعمال کرنے لگا جس سے عہد جارج کی شاعرانہ روایت برقرار ہے۔

اسپنڈر نہ صرف ذہن انسانی کا قائل ہے بلکہ زمان و مکان کی حقیقت پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ذاتی شعور سے پرے حقائق کی ایک ایسی دنیا ہے جہاں جدید تخیل کا گزر نہیں لیکن اس تصوریت کے باوجود وہ ارضی مسائل سے بے تعلق اور بے نیاز نہیں ہے۔ وہ ان غریبوں اور بیکاروں کا شاعر ہے جنھیں سماج نے ٹھکرا دیا ہے۔ شیلی کی طرح وہ بھی مادیت کی قربان گاہ پر انسانیت سوزی کا سخت مخالف ہے:-

How Was It That Works, Money, Interest
Building Could Ever Hide, The Palpable And
Obvious Love of Man For Man

[یہ کیسے ممکن ہوا کہ کارخانے، دولت اور عمارتوں نے انسانوں کے ساتھ انسان کی محبت کو چھپا دیا ہے]

انھیں اسباب کی بنا پر وہ اشتراکی نظام کا قائل ہے جس میں دولت کی تقسیم زیادہ انصاف کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ اسپنڈر کی حالیہ شعری تصانیف میں Ruins & Visions (1942) اور Poems of Dedication (1946) اہم ہیں۔ ان مجموعوں میں فکر و تامل کے ساتھ اخلاقی پہلو بھی نمایاں ہے۔ اسپنڈر اب شاعری سے زیادہ صحافت اور تنقید کی طرف مائل ہے۔

اپنے معاصرین میں لیوس C. D. Lewis ایک ممتاز مقام کا مالک ہے۔ اس کے یہاں آڈن سے زیادہ یکسوئی ملتی ہے۔ ۱۹۲۹ء میں شائع ہونے والی Transitional Poems کو اس نے اپنی یکسوئی کا ہی نتیجہ بتایا ہے۔ اس

کے ابتدائی کلام میں ہاپکنس اور ایلیٹ کے زیر اثر فلسفیانہ طرز فکر کے ساتھ منطقی اسلوب بیان نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لیوس جیسا حساس اور رومانی مزاج کا شاعر محض زمانہ کے مطالبات سے مجبور ہو کر اپنے اصل مزاج اور میلان کو دبائے ہوئے ہے۔ From Feathers To Iron (1931) اس کی روحانی خود نوشت ہے جس میں نظریاتی مباحث سے زندگی کو درجہ بدرجہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کا موضوع "شاعری" اور "تناسل" کے تجربے ہیں۔ لیوس کے نزدیک بچوں کے بغیر محبت کی تکمیل ناممکن ہے:۔

Here is Love's Junction, No Terminus

He Arrives At Girl or Boy

شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلقات دو سال تک کفالت پر قابو پانے کے بعد نئی سمت اختیار کرتے ہیں اور اپنی آسودگی کی نت نئی صورتیں نکالتے ہیں۔ یہ مجموعہ غنائی نظموں کا سلسلہ ہے اور یہاں خانگی محبت کو بالخصوص بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

"مقناطیسی پہاڑ" **The Magnetic Mountain—1933**

کو ہم لیوس کی اشتراکیت کا نمائندہ کہہ سکتے ہیں لیکن اس نظم میں فرد اور سماج کے تصورات خلط ملط سے ہیں۔ یہاں وہ ہاپکنس اور آڈن سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ شاعر پرانے دنوں کی حسین یادوں کا سہارا لئے ہوئے حقیقت کے مقناطیسی پہاڑ کی تلاش کرتا ہے۔ اس کے دوست اور رفیق ہمنوائی کے لئے آمادہ ہیں لیکن ماں کی مامتا اور پادری کی مذہبیت اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس کے ترقی کے سب سے بڑے دشمن "محبت، پریس اور روحانیت" ہیں۔ بالآخر انسان اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آسمان کی بلندیوں پر پہونچ کر بھی وہ زمین سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ اس نظم میں مارکسیت کو صحیح معنوں میں شاعرانہ موضوع کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں شاعر کو اداروں کی بجائے اپنے تخیل کی تلاش ہے اور اس کے حصول کے بعد فرد اور سماج کے مطالبات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ "عقل اور عشق" کے درمیان کوئی بیگانگی باقی نہیں رہ جاتی۔ ۱۹۳۴ء میں **A Hope For Poetry**

لکھ کر لیوس نے اپنے مدرسۂ خیال کی وضاحت کی۔

لیوس کی آخری تصانیف میں Ward Over All (1943) اور An Italian Visit (1953) زیادہ اہم ہیں۔ ان مجموعوں میں موضوعات کی وسعت کے ساتھ ابتدائی کلام کے جوش و خروش کی پختگی اور نرمی پائی جاتی ہے یہاں وہ انگریزی شاعری میں ایک ایسی روایت کی نمائندگی کرتا ہے جو پرانی روایتوں سے اپنا رشتہ توڑے ہوئے بغیر زندگی کی نئی سمتوں اور ضرورتوں کا احساس دلاتی ہے اور جو ورڈسورتھ، ہارڈی، ایلیٹ اور آڈن سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے

ڈرامہ

جدید ڈرامہ کا پس منظر :۔

شیکسپیر اور اس کے معاصرین کے بعد انگریزی ڈرامہ کم و بیش دو سو برسوں تک جمود کے عالم میں رہا سترھویں صدی میں دور بحالی کے ڈرامہ نگاروں اور اٹھارھویں صدی میں شیریڈن اور گولڈ اسمتھ کے باوجود اس صنف کو نئی توانائی نہیں مل سکی یہی وجہ ہے کہ شیریڈن کے آخری کامیاب ڈرامہ مطبوعہ ۱۷۷۹ء اور دور حاضر کے ڈرامہ نگار رابرٹسن Robertson کے پہلے ڈرامہ مطبوعہ ۱۸۶۵ء کے درمیان ایک وسیع خلا محسوس ہوتا ہے۔ اس دوران میں رومانی شاعروں نے کچھ منظوم ڈرامے ضرور لکھے لیکن وہ اسٹیج کے لائق نہیں تھے۔ اس سلسلہ میں ایک بات البتہ قابل غور ہے کہ جہاں ایک طرف فن ڈرامہ میں اعلیٰ تخلیقی ذہن کی کمی تھی تو دوسری طرف اداکاری کے فن نے بڑی ترقی کی۔ عوام پرانے ڈراموں کو نئے ایکٹروں کے ذریعہ دیکھنے کے مشتاق رہتے۔ اکثر اوقات شیکسپیر اور دوسرے مشاہیر کے ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کیا جاتا۔ مجموعی طور پر اس زمانہ میں حقیقت نگاری سے زیادہ ڈرامہ کے تفریحی پہلو پر زور دیا گیا لیکن رفتہ رفتہ جدید ڈرامہ رابرٹسن (۱۸۲۹ء سے ۱۸۷۱ء) کے یہاں حقیقت نگاری کے سانچے میں ڈھلنے لگا۔ رابرٹسن نے حقیقی زندگی سے کرداروں کا انتخاب کیا اور ان کے مکالموں کی بنیاد بھی روزمرہ کی زندگی پر رکھی۔ اس کے ڈرامہ "سوسائٹی" Society سے انگریزی ڈرامہ میں دو خاص تبدیلیاں واقع ہوئیں:۔

(۱) حقیقی کردار جو عوام سے برتر نہیں ہوتے تھے بلکہ انھیں میں سے ہوتے تھے۔
(۲) منظوم ڈرامہ کی جگہ روزمرہ کی نثری بول چال کو ڈرامائی اظہار کا مستقل ذریعہ بنایا گیا۔

رابرٹسن کے جانشینوں میں پنرو pinero ہنری آرتھر جونس Henry Arthur Jomes اور آسکر وائلڈ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان فنکاروں نے جدید ڈرامہ کو بہت حد تک قدیم لوازمات سے پاک کیا۔ پنرو نے قدماء کے محبوب طریقۂ اظہار " تنہا کلامی " Soliloquy سے احتراز کیا اور اظہار کے نئے طریقے اختیار کئے۔ ان جدتوں کے باوجود انیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک ادبی فضا ان تبدیلیوں کے لئے سازگار نہیں ہو سکی تھی۔ عوام اخلاقی اور مذہبی معاملات میں نئے خیالات کو پسند نہیں کرتے تھے اور جہاں کہیں کسی ڈرامہ نگار نے جسارت کی کہ اسٹیج پر ہنگامے برپا ہو جاتے۔ عہد وکٹوریہ کے عوام مذہب، اخلاق، سیاست اور معاشرت میں اپنے مروجہ رسوم اور عقائد سے انحراف نہیں پسند کرتے تھے اور انہیں اسباب کی بنا پر ابتدائی دور میں ڈرامای حقیقت نگاری ماحول کے ذہنی انقلاب سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔

ناروے کے مشہور مجتہد ڈرامہ نگار ابسن Ibsen کے زمانہ تک آتے آتے ذہنی اور نفسیاتی فضا بہت حد تک بدل چکی تھی اور سماجی و معاشرتی مسائل پر تبادلۂ خیال کا رواج بھی عام ہو چلا تھا۔ ابسن نے اپنی جدت پسندیوں سے نہ صرف انگریزی ڈرامہ بلکہ یورپین ڈرامہ پر بھی بہت اثر ڈالا۔ جدید ڈرامہ نگاروں میں وہ سب سے پہلا فنکار ہے جس کا ایک پیغام ہوتا ہے اور جس کے لئے وہ بالکل نیا تکنک اختیار کرتا ہے۔ یہ نیا اسلوب خود اس کی ایجاد ہے۔ ابسن نے گرد و پیش کی آدمی اور واقعی زندگی کو ڈرامہ کا موضوع بنایا اور اس کو معمولی انسانوں سے آباد کیا۔ اس کے ڈراموں میں خانگی زندگی کے المیے ہیں اور ان کی بنیاد افراد اور ماحول اور مروجہ معاشرتی نظام کے درمیان کشمکش پر ہوتی ہے۔ ابسن نے اپنی جدتوں سے دنیائے فکر و فن میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا جو عارضی نہیں بلکہ دیرپا ثابت ہوا۔

جدید ڈرامہ ہماری عصری زندگی کے نئے مسائل کا آئینہ دار ہے۔ جدید معاشرت کی تلخ حقیقتوں اور سماجی زندگی کی پیچیدگیوں نے ہم کو مجبور کر دیا ہے کہ ہم رومان سے منہ پھیر کر

اصلیت کی طرف متوجہ ہوں۔ برنارڈ شا اور گالزوردی کے ڈراموں میں زندگی کے اقدار و مسائل سے جو شدید اور رنگ طرفہ لگاؤ ملتا ہے وہ نئے دور کا نیا مطالبہ ہے۔ ان نئے ڈراموں میں سیاست، اخلاق، اور مذہب کے علاوہ معاشیات، نفسیات اور جنسیات غرضکہ زندگی کے ہر مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں منظوم اظہار خیال کے لئے بھی کوئی گنجائش نہیں اس لئے کہ محنت اور سرمایہ کی آویزش، حکومت اور عوام کے تعلقات اور قانون و عدالت کے مراحل نثر کی زبان میں ہی زیادہ کامیابی کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ منظوم ڈراموں میں اگرچہ الیٹ اور میسفیلڈ وغیرہ ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن وہ جدید تحریک سے دور ہی ہیں۔ ان تمام ڈراموں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پلاٹ سے زیادہ کردار اور کردار سے زیادہ خیالات و تصورات اہمیت رکھتے ہیں۔ اب ڈرامائی ماجرا محض تاریخی تسلسل کا نام نہیں بلکہ کرداروں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید ہے اور اس کا مقصد تفریح نہیں بلکہ اصلاح ہے کردار بھی اب افراد Individuals نہیں بلکہ مختلف طبقوں کی زندگی کے مطالبات و میلانات کے نمائندہ ہوتے ہیں اور مخص کر کے پیش کئے جاتے ہیں ۔

انگریزی ڈرامہ میں برنارڈ شا اور گالزوردی کے ساتھ آئرستانی شاعر ییٹس Yeats اور سر جیمس بیری Sir James Barries کی انفرادیت بھی مسلم ہے۔ ان فنکاروں کے یہاں رومانی اور تفریحی عناصر غالب ہیں ۱۹۲۰ء کے بعد اگرچہ برنارڈ شا کے مختلف ڈرامے منظر عام پر آتے رہے لیکن حقیقت نگاری کا زور ختم ہونے لگا اور ڈرامہ میں نئے تجربے ہونے لگے۔

منظوم ڈراموں Poetic Drama کے ساتھ ایکانکی ناٹکوں One Act Plays کو بھی روز بروز فروغ حاصل ہوتا گیا اور انکی مقبولیت بھی بڑھتی گئی ۔

جارج برنارڈ شا ۱۸۵۶ء سے ۱۹۵۰ء

برنارڈ شا کے ڈرامے نہ صرف اپنے دور کے لئے خاص اہمیت رکھتے ہیں بلکہ بعد کی نسلوں کو بھی فکر و عمل کی نئی سمتوں اور نئی راہوں سے آشنا کرتے ہیں ۱۸۷۶ء میں لندن آنے سے پہلے وہ ڈبلن میں کلرک تھا لیکن اسے اپنی صلاحیتوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔ خود اس کا قول

تھا کہ "لندن والوں کی تعلیم و تربیت میرا منصب تھا اور مقدر بھی" مگر اس منزل پر پہونچنے میں اسے بڑی دقتوں اور دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ سولہ سال کی طویل مدت تک وہ چند سرسری مضامین اور معمولی ناولوں کے سوا کچھ بھی نہیں لکھ سکا لیکن اس کے ذہن پر نئے محرکات بڑی تیزی کے ساتھ اثر انداز ہو رہے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں ہنری جارج کے اثر سے وہ اشتراکی خیالات کا حامی ہو گیا تھا اور شا کی انسان دوستی اور سبزی خوری کا علمبردار بھی۔ اس کے دوستوں میں سڈنی ویب Sidney Webb بھی تھا جس نے ۱۸۸۴ء میں اشتراکی اصولوں پر تحقیق اور تعلیم کی غرض سے فیبین سوسائٹی Fabian Society کی بنیاد ڈالی ۱۸۸۵ء تک برنارڈ شا اس نئی تحریک کا مبلغ اور مقرر تھا۔ اس طرح اسٹیج پر پہونچنے سے پہلے شا نے طنز و تمسخر اور سنجیدہ تنقید کے ذریعہ عوام کے دلوں میں خاصی جگہ پیدا کر لی تھی۔

برنارڈ شا کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۸۸۵ء میں ہوا جب کہ انگلستان میں ابسن کے ڈراموں کا کافی چرچا تھا۔ اس کے یہاں ڈبلن کے قیام کے زمانہ سے ہی سماجی اداروں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ ابسن کے اثر سے اس کے خیالات اور بھی راسخ ہو گئے۔ اس کو ابسن کی نئی ڈراماٹی ٹکنک اور اس کی رومانیت اور تصوریت کے متعلق رایوں سے بہت حد تک اتفاق تھا۔ چنانچہ شا بھی ابسن کی طرح غیر معقول تصوریت کا شدید مخالف تھا جس سے اس کے نزدیک سماج میں مختلف خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں۔

۱۸۹۸ء میں شا کے ڈراموں کے دو مجموعے Plays Pleasant & Unpleasant شائع ہوئے Unpleasant Plays کے ذریعہ شا نے طنزیہ انداز میں عوام اور ان کے مذہبی، سیاسی اداروں کے علاوہ ان کے مسلمہ عقاید کی تنقید شروع کر دی۔ وہ لوگوں کو جذبات اور رومان کی دنیا سے کھینچ کر حقائق سے آنکھیں ملانے پر مجبور کرتا۔ مضافاتی زمینداری، رنڈیوں کا پیشہ، شادی بیاہ، سیاست اور مذہب غرضکہ زندگی کے ہر مسئلہ پر اس نے دو ٹوک رائیں دیں۔ اس طرح شا نے ابسن کے ساتھ ایک نئے ڈرامہ کی بنیاد ڈالی جس میں مقصدیت اور افادیت کا میلان غالب ہے۔ اس کا قول ہے کہ ایک

عمدہ ڈرامہ میں گرجا کی دعاؤں Church Service کی خوبیاں ہونی چاہئیں —
فنکارانہ رسوم، عقائد کی پختگی اور پند و نصائح۔ اس کے Pleasant Plays
میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ان ڈراموں میں اگرچہ خیالات کو کرداروں کے تابع رکھا گیا
ہے لیکن زور و اثر سے انکار نہیں "اسلحہ اور انسان" Arms & The Man
ایک دلچسپ ڈرامہ ہے لیکن اس مجموعہ کا شاہکار Candida ہے جس میں ابسن
کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

Three Plays For Puritans (1901) کے بعد جب ۱۹۰۳ء میں
شا کا شاہکار ڈرامہ Man & Superman شائع ہوا تو وہ اپنے فن کا استاد تسلیم
کیا جا چکا تھا۔ اس ڈرامہ میں خیالات و افکار ڈرامہ کے فنی مطالبات پر حاوی ہیں۔ خود شا
نے اسے "طربیہ اور فلسفہ" کہا تھا کیونکہ اس نے اس ڈرامہ میں انسان کی تکمیل حیات اور
نجات کے فلسفہ کو پیش کیا ہے۔ ہارڈی کے فلسفۂ جبریت Immanents Will
کے برخلاف شا کا فلسفہ عمل اور جد و جہد کی دعوت دیتا ہے۔ اس عظیم کوشش میں مرد اور
عورت دونوں شانہ بشانہ کام کرتے ہیں۔ مگر نئی دنیا کی تخلیق اسی وقت ممکن ہے جب انسان
دوبارہ پیدا ہو — "Ye Must Be Born And Born Different"

پہلی جنگ عظیم کے بعد شا کے قابل لحاظ ڈراموں میں Back To Methu
selah نہایت اہم ہے۔ اس ڈرامہ میں مصنف نے جدید تہذیب پر تبصرہ کرتے ہوئے
بتایا ہے کہ انسان کا اصل مقدر کیا ہے اور اسے تمام ارتقائی منازل طے کر کے کیا ہونا ہے۔ شا
نے سب سے زیادہ الزام ڈارون اور اس کے فلسفۂ ارتقا پر عائد کیا ہے جس کی رُو سے انسان
محض واقعات و حالات کے تاریخی تسلسل کا نام رہ جاتا ہے اور اس کے اندر کوئی روحانی قوت
نہیں رہ جاتی۔ اسی وجہ سے اس نے "بقائے اصلح" Natural Selection کی جگہ
"تخلیقی ارتقا" Creative Evolution کا سبق دیا ہے۔ شا کا خیال
ہے کہ انسان نہ صرف فوق البشر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ وہ قوت ارادی سے ارتقائی
منازل بھی طے کر سکتا ہے۔ اگر زرّاف Giraffe اپنی گردن اونچی کر کے اپنا مقصد

حاصل کر سکتا ہے تو انسان بھی قوت ارادی سے ایک خاص نہج پر اپنے مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے۔

شا کا خلاق ذہن مستقل نئے مسائل پر غور کرتا رہا اور ان کا حل پیش کرتا رہا۔ اس کے ڈرامے بحث و حجت اور طنز و تمسخر کا عجیب مجموعہ ہیں۔ اصلاح کے جذبہ کے ساتھ اس کے یہاں استہزا کا انداز بھی نمایاں ہے۔ بیسویں صدی کے مفکر ادیبوں میں شا کی حیثیت تاریخی اور کلاسیکی ہے۔ اس کے انقلابی اور باغیانہ خیالات سے جہاں ایک طرف اصلاح معاشرت کی کوششیں کی گئیں وہاں انگریزی ڈرامہ میں بھی قابل قدر اضافہ ہوا۔ اس کا انداز بیان ہمعصر ڈرامہ نگاروں سے اس قدر منفرد ہے کہ اس فن میں کوئی اس کی تقلید نہیں کر سکا۔

جان گالزوردی

جدید انگریزی ڈرامہ میں برنارڈ شا کے بعد دوسری اہم شخصیت گالزوردی ہے۔ اس نے بھی اپنے مشہور ہمعصر کی طرح اپنے ناولوں اور ڈراموں کے ذریعہ سماجی انقلاب میں بڑا حصہ لیا ہے گالزوردی ابتدا سے ہی اپنے طبقہ کی معاشرت اور اس کے میلان فکر اور طرز عمل سے آسودہ نہیں تھا۔ اس کے یہاں بھی اصلاح کا جذبہ اسی شدت سے موجود تھا جس طرح شا کی تصانیف میں ملتا ہے لیکن وہ اپنے ہمعصر کے برخلاف طنز و تمسخر سے زیادہ ہمدردی اور باہمی تعاون کا قائل رہا۔

یورپ کے سفر کے دوران میں گالزوردی کو مختلف قوموں سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے موقعے ملے لیکن فرانس اور روس سے اس نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا۔ اس کے ان تجربوں نے اس کے اندر ایک اخلاقی قوت پیدا کر دی جو بڑے خلوص اور صداقت کی حامل ہے۔ وہ خود میتھو آرنلڈ، شا اور ویلس کے گروہ کا رکن معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی آفاقی ہمدردی رجائیت اور معروضی اسلوب بیان اس کو اپنے پیشروؤں سے ممتاز کرتے ہیں۔

گالزوردی کے ساتھ ڈرامہ میں حقیقت پسندی نئی منزلیں طے کرتی ہے۔ وہ صوری اور معنوی طور پر حقیقت کو پیش کرنے کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک فنکار کا فرض ہے کہ فطری زندگی کی عکاسی اس طرح کرے کہ ہر چیز اور ہر واقعہ اپنے اصلی خد و خال میں سامنے آئے۔ گالزوردی کے ڈراموں میں نشاۃ الثانیہ کی روح موجود ہے اسی طرح گالزوردی کے ڈراموں میں بیسویں صدی کی

معاشی اور معاشرتی زندگی کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان ڈراموں میں دولت کی تقسیم، سرمایہ اور محنت کی آویزش، قانون اور عدالت کے نظام اور ذات پات کے مسئلوں پر بڑی نکتہ شناسی کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ گالزوردی نے کسی موقع پر فن کی تعریف یوں کی تھی :-

"Perfect Expression Of Self In Contact With The World

[دنیوی تعلق کے ساتھ فرد کی شخصیت کا مکمل اظہار]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ آفاقی انسانی احساسات کی عکاسی سے زیادہ زمانہ کے مزاج کی ترجمانی کا قائل ہے۔

گالزوردی کے ڈراموں کا اصل موضوع خاندانی تعلقات، سماجی بے انصافی، تصوریت کا المیہ اور ذات پات کی تفریق ہے۔ اس کے سب سے موثر ڈرامے وہ ہیں جس میں وہ جدید معاشرہ میں امیروں اور غریبوں کا فرق بتلاتا ہے اور قانون اور عدالت کی بدعنوانیوں کو طشت ازبام کرتا ہے "The Silver Box" اور Justicé ایسے ہی ڈرامے ہیں۔ "Strife" ذات پات اور طبقہ وارانہ امتیاز کا شاہکار ہے۔ یہاں سرمایہ اور محنت کی جنگ دراصل حق اور انصاف کے درمیان کشمکش کا المیہ ہے۔ اس جنگ میں نہ کسی کو جیت ہوتی ہے اور نہ کوئی ہارتا ہے مگر دونوں پارٹیاں کافی نقصان اٹھا کر مفاہمت کر لیتی ہیں۔

اخلاق اور معاشرت کے بارے میں گالزوردی کا یہ اصلاحی رجحان اس کے ڈراموں اور ناولوں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ بڑے خلوص اور دیانتداری کے ساتھ اپنے دور کی واقعی زندگی کو اپنے ڈراموں کا موضوع بناتا ہے۔ اس کے تمام تر موضوعات عام زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اس کے کرداروں میں کبھی معمولی چوروں سے لیکر اوسط طبقہ کے ممبران پارلیمنٹ شامل ہیں۔ گالزوردی اپنی پرخلوص حقیقت نگاری کی بدولت سماجی امراض کی تشخیص بڑی خوبی سے کر لیتا ہے لیکن صحت کے مناسب نسخے نہیں تجویز کر سکتا اسی لئے اس کے یہاں غم پسندی کی ایک زیریں لہر ملتی ہے۔

گالزوردی بیسویں صدی کے نمایندہ ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے ناولوں اور ڈراموں میں جو صداقت اور انسانیت پائی جاتی ہے اس سے اس کی ہمدردی

اور جذبۂ اصلاح کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ برنارڈ شا کی طرح اسٹیج کا آمر نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کا اثر ادبی حلقوں میں زیادہ دیرپا رہا۔

جے۔ ایم۔ بیری

بیسویں صدی کے شروع میں حقیقت نگاری فن ڈرامہ میں اولین حیثیت رکھتی تھی۔ اس مدرسہ کے مشاہیر مثلاً شا، گالزوردی اور بارکر وغیرہ نے اسٹیج کو معاشرتی اصلاح کا مرکز بنالیا تھا لیکن اس دور کا ہر ڈرامہ نگار اس لہر کے ساتھ بہنا نہیں پسند کرتا تھا اور نہ عوام ہی کو اصلاحی ڈراموں سے زیادہ دلچسپی تھی۔ ایسے ڈراموں میں محاسن شعری اور زندگی کی رنگا رنگیوں کی بھی گنجائش کم ہوتی۔ ان اسباب کی بنا پر لوگوں کی اکثریت اب بھی رومانی ڈرامے سے رغبت رکھتی تھی۔ بیری کا شمار ان رومانی ڈرامہ نگاروں میں کرنا چاہیئے جو اپنے تماشائیوں کو حال کی مادی زندگی اور اس کی کثافتوں سے دور حسین و لطیف دنیا کی سیر کراتے ہیں اور اپنے فن میں اصلاح کے قواعد و ضوابط کی پابندی گوارا نہیں کرتے۔ بیری حقیقی دنیا کے آلام اور مظالم سے بھاگ کر سحر و طلسم کی خیالی دنیا میں پناہ لیتا ہے جہاں اسے ذہنی اور روحانی سکون ملتا ہے۔

بیری کے ڈراموں میں ترتیب ماجرا بے ہنگم ہوتا ہے اور کردار بھی ناقابل تسلیم ہوتے ہیں اسی طرح اس کے مکالموں میں بھی جدت اور توانائی نہیں ملتی لیکن اس کے یہاں ایک خاص دلکشی ہوتی ہے جو اس کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ بیری کے ابتدائی ڈراموں

The Little Minister اور Professor's Love Story (1895)

(1897) میں اگرچہ اسٹیج کے مسلّمہ اصول کی پابندی کی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا انفرادی رنگ بھی نمایاں ہے۔ Quality Street (1901) محبت کی داستان اور اپنے سوز و گداز کے لئے مشہور رہے۔ یہ ڈرامہ روایتی چھاپ کے باوجود عوام میں بیحد مقبول ہوا ۱۹۰۳ء میں لکھا ہوا ڈرامہ Admirable Crichton بیری کا سب سے زیادہ مشہور مقبول کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس ڈرامہ میں مصنف نے ایک امیر گھرانہ کے افراد کو ان کے خانساماں کے ساتھ کسی ریگستانی جزیرہ میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ وہاں خانساماں ان لوگوں پر اپنی غفلت جتلانے لگتا ہے اور امیر کی لڑکی سے اظہار محبت بھی کرنے لگتا ہے۔ اس ڈرامہ

میں بھی سارے کردار فرضی ہیں لیکن ان کی کشش ڈرامہ میں تماشیہ کے عناصر کی بدولت ہے ۔
What Every Woman Knows اور Peter Pan
بیری کو خاصی شہرت حاصل ہو گئی تھی ۔ اس کے آخری کامیاب ڈرامے Dear Brutus
(1917) اور Mary Rose (1920) رومان اور تماشیہ کے بیچ کی چیزیں ہیں ۔
ان ڈراموں کی دلفریب فضا سے انکار نہیں لیکن یہاں ہم کو اپنی دنیا سے دور کا بھی لگاؤ نہیں محسوس ہوتا ۔ انھیں اسباب کی بنا پر بیری کو فراریت اور مجہولیت کا علمبردار کہا گیا ہے ۔ ان خامیوں کے باوجود بیری کی ڈرامائی قابلیت مسلم ہے ۔ وہ نہ صرف اپنے فن کا استاد تھا بلکہ تھیٹر کے تمام رموز سے بھی واقف تھا ۔ اس نے کامیابی کا راز یہ سمجھ لیا تھا کہ سنگین حقیقتوں سے انحراف کیا جائے اور خواب و خیال کو اصلیت پر ترجیح دی جائے چنانچہ اس نے محض اپنے تخیلہ سے رومانی فضا پیدا کر کے اپنے حاضرین کے لئے تفریح اور خوشدلی کا سامان مہیا کیا ۔

سمرسٹ ماہم

بیسویں صدی کی پہلی دو دہائی تک ہلکے طربیہ ڈرامہ کی مانگ نہیں تھی ۔ اس دوران میں جن ڈراموں کو امتیاز حاصل ہوا وہ زیادہ تر معاشرتی اصلاحی مسائل سے تعلق رکھتے تھے لیکن جنگ عظیم کے بعد طربیہ ڈراموں کی طرف عوام اور لکھنے والوں کا میلان از سر نو زندہ ہوا ۔ اس میلان کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ حاضرین حال کی ابتری کو خواب و خیال اور رومان کے دلکش فریب میں بھول جانا چاہتے تھے ۔

جنگ عظیم کے بعد ہلکے ڈراموں میں طربیہ کو خاص مقبولیت حاصل ہوئی ۔ یوں تو انگریزی طربیہ ڈرامہ کی روایت بہت شاندار رہی ہے لیکن انیسویں صدی کے اواخر میں رابرٹسن نے کرداروں کے طربیہ Comedy of Character کو رواج دیا ۔ بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں طربیہ نے طنزیہ صورت اختیار کر لی اور اس کے ذریعہ سماجی خرابیوں پر تنقید کی کوشش کی گئی ۔ خود غرضی اور خود نمائی اعلیٰ طبقوں میں رسائی کی کوشش ، فنکاروں کا مادی وسائل کی طرف میلان اور عورتوں کی ناقص العقلی اور ان کا اپنے کو کمسن سمجھنے کا خبط ، یہ تھیں وہ اخلاقی کمزوریاں جن کو ڈرامہ نگاروں نے رسوا کرنا شروع کیا ۔ جنگ کے بعد سماجی تنقید کے ساتھ

ڈرامہ کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ نئے سرمایہ دار جو چور بازار کے ماہر تھے نئے عزیب جو اپنی وضع پر قائم تھے، خاندانوں کا قلع قمع، معاشرتی انحطاط، فیشن پرستی، لڑکیوں کا مردانہ پن اور لڑکیوں کی نسوانیت، سگریٹ کی لت اور پارٹیاں، یہ سب طنز نگاری کے لئے موزوں موضوعات ثابت ہوئے۔ سومرسٹ ماہم اسی دور میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگرچہ اس نے ۱۸۹۸ء سے ہی ڈرامے لکھنا شروع کر دیئے تھے لیکن اس کی اصل شہرت جنگ عظیم کے بعد ہی ہوئی۔

سومرسٹ ماہم کے یہاں پنرو کی فنکاری اور آسکر وائلڈ کے اثرات کا پتہ ملتا ہے۔ اس کے ڈراموں سے نہ صرف عوام کی بدلتی ہوئی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کے روزمرہ اور محاورہ سے بھی واقفیت ہوتی ہے Cheiar's Wife (1919) کے بعد ماہم کی ڈرامہ نگاری کا اہم دور شروع ہوتا ہے۔ اس کے ڈرامہ The Circle (1921) کا مقابلہ ہم شیریڈن اور وائلڈ کے کارناموں سے کر سکتے ہیں۔ اس ڈرامہ میں ایک قسم کی اخلاقی کلبیت کی جھلک ملتی ہے لیکن مصنف نے اسے کہیں سے بھی سنجیدہ نہیں ہونے دیا ہے Our Betters (1923) میں امیر کاہلوں کی انحطاطی عیش پرستی کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔ نقادوں نے بجا طور پر اس ڈرامہ کو دور بحالی کے بعد کامیاب ترین طربیہ ڈراموں شمار کیا ہے۔

موجودہ صدی کی تیسری دہائی تک پہونچتے پہونچتے ماہم کے یہاں کچھ تبدیلیاں محسوس ہونے لگتی ہیں۔ The Bread Winner (1931) میں اس نے ایک مرد کی گھریلو زندگی سے بیزاری اور آزادی کی تلاش دکھائی ہے۔ اس ڈرامہ میں ابسن کے "گڑیا کا گھر" کے بالکل برعکس صورت حال پیش کی گئی ہے۔

ماہم اپنے طربیہ ڈراموں کے ذریعہ اپنے سماج کی کلبیت اور نمائشی زندگی کا پردہ فاش کرتا ہے اسی لئے کہیں کہیں ان میں دور بحالی کے ڈراموں کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ماہم کے کرداروں میں وہ زندگی اور توانائی نہیں پائی جاتی جو کانگریو کے کرداروں کی اہم خصوصیت ہے۔ ماہم کا اصل فن ناول ہے لیکن وہ بلاشبہ ہمارے دور کے مشہور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

"نئے تجربے"

جدید انگریزی ڈرامہ میں شاعری اور ناول کی طرح نئے تجربوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے چنانچہ حقیقت نگاری اور رومانیت کے ساتھ نئے لکھنے والوں نے اپنے فن میں جدت اسلوب بھی پیدا کیا ہے۔ منظوم ڈراموں میں ٹی۔ایس۔ ایلیٹ T. S. Eliot ' اشر ووڈ Isher Wood اور کرسٹفر فرائی Christo pher fry کے تجربے اپنی جگہ اہم اکتساب ہیں۔ جدید ڈرامہ نگاروں نے اگر ایک طرف عصری ادب سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف قدما کی خوشہ چینی سے بھی دریغ نہیں کیا ہے البتہ ان کی زبان اور اسلوب بیان بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔

دورِ جدید کے ڈرامہ نگاروں میں جیمس برڈی James Bridie اور نول کاورڈ Noel Coward کے بعد پریسٹلے J. B. Priestley کے تجربے قابل لحاظ ہیں۔ اگرچہ پریسٹلے کی اپنی تخلیقی قابلیت کے اظہار کے لئے بہترین میدان ناول ہے لیکن جدید انگریزی ڈرامہ کی تاریخ میں اس کی حیثیت مسلّم ہے۔ وہ ۱۹۳۱ء کے بعد تھیٹر کی دنیا میں داخل ہوا اور بہت جلد Eden End نامی ڈرامہ کے بعد مشہور ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلے "خیالات" سے تجربہ کیا اور J. W. punn کے اثر سے حال و ماضی کو بیک وقت پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں Time & Conways اور "I have bean here before اہم کارنامے ہیں۔

پریسٹلے کے "فارم" From کا تجربہ بھی حیرت انگیز ہے۔ وہ تبتی اساطیر کے مطابق باردو Bard. کے نظریہ کا قائل ہو گیا تھا "بارود" تبتی لوگوں کے بقول وہ حالت ہے جو موت کے بعد فوراً پیش آتی ہے اور انسان کو اپنی موت کا یقین نہیں آتا اور وہ اپنے خیالات و احساسات کو حقیقی سمجھتا ہے۔ اس نظریہ سے استفادہ کرتے ہوئے پریسٹلے نے انسان کی زندگی کو نئے طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی جس میں معمولی اور عامیانہ زندگی کو بھی ایک خاص زندگی حاصل ہو سکے Johnson over Jordan (1938) اس سلسلہ میں اس کا کامیاب ترین اکتساب ہے۔

عروج و زوال زندگی اور فن دونوں کے لئے لازمی ہے۔ بیسویں صدی میں جب عقائد اور اعمال کے درمیان زبردست خلیج پیدا ہونے لگی اور زندگی انفرادی خانوں میں تقسیم ہوتی گئی تو فن ڈرامہ میں بھی نئے تجربے اور نئے انفرادی لہجے عام ہوتے گئے۔ بیسویں صدی کے شروع میں حقیقت نگاری کا زور رہا۔ شا، گالز ورذی اور بارکر نے اپنے ڈراموں کو معاشرتی مسائل کے اظہار کا آلہ بنایا لیکن بیری کی رومانیت نے فن ڈرامہ میں ایک نئی راہ دکھائی۔ پھر جنگ عظیم کے بعد طربیہ اور طنزیہ ڈراموں کی مانگ بڑھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کلاسیکی ڈراموں کا بھی احیا ہوا۔ اور ڈرامہ نگاروں نے مواد کے علاوہ قدما کے منظوم ڈراموں کے اسالیب کو بھی اختیار کرنے کی کوششیں کیں۔ حقیقت نگاری اب اپنا ابتدائی زور و اثر کھو چکی ہے لیکن نئے تجربے ابھی جاری ہیں۔ ان تمام تجربوں میں رومان، شاعری اور موسیقی یعنی تفریحی عناصر کو زیادہ دخل ہے۔ ممکن ہے فن ڈرامہ اعتدال پر پہونچ کر بصیرت اور مسرت دونوں کا سامان خوش آہنگی کے ساتھ فراہم کر سکے۔

ناول

جدید ناول کی خصوصیات :-

انگریزی ناول انیسویں صدی میں ہی دوسرے اصناف ادب سے زیادہ عام مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ بیسویں صدی میں اس کا اقتدار روزافزوں ترقی کرتا رہا۔ زمانہ حال میں فن ڈرامہ کی مقبولیت سینما اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے بہت گھٹ گئی ہے اور شعر و شاعری خواص کے حلقہ میں فکر و تخیل کی ورزش ہو کر رہ گئی ہے یا پھر کچھ عوامی سطح کی شاعری ہوتی رہی ہے جس کو ادب کی تاریخ میں کبھی کوئی جگہ نہیں مل سکتی لیکن ان تمام خارجی عوامل کے باوجود ناول کی مقبولیت اور شہرت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں جتنے اچھے لکھنے والے ہیں ان میں سے بیشتر یا تو ناول نگار ہیں یا نقاد۔ ناول کی اس مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس میں شاعری، ڈرامہ اور افسانہ کی تمام خوبیاں بیک وقت جمع ہو سکتی ہیں اور خیالات و احساسات کے اظہار کے لئے اس کا کینوس بے حد وسیع ہو سکتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدا سے ہی ناول میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اگر ایک طرف

روایتی رنگ میں ناول لکھنے والوں کی کمی نہ تھی تو دوسری طرف فرائڈ اور مارکس کے اثرات بھی کچھ کم اہم نہ تھے۔ کچھ نئے لکھنے والوں نے مشرق بعید اور افریقہ وغیرہ ممالک کے لوگوں کی طرز معاشرت اور بود و باش پر بھی طبع آزمائی کی۔ نئے ناول نگاروں کا ایک حلقہ اصلاح معاشرت کے لئے کوشاں رہا اور اس حیثیت سے ایچ۔جی۔ ویلز سرفہرست نظر آتا ہے۔ ہنری جیمس اور ڈی۔ایچ لارنس جیسے لکھنے والوں نے ناول میں انسان کی نفسیاتی روداد پر زیادہ زور دیا۔ اگرچہ جیمس اور لارنس اپنے اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ ان ناول نگاروں کو ہم مجموعی طور پر اس جماعت سے متعلق کرسکتے ہیں جو تاثر پسند Impressionist کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد کی نسل تاثر پسندی میں ان سے بھی آگے نکل گئی۔ موخرالذکر ناولوں کا سنگ بنیاد شعور کا بہاؤ یا شعور کی لہر ہے جسکو ہم آج "چشمۂ شعور Stream of Consciousmess کہتے ہیں۔

نئی نسل کے ناول نگار تکنک اور فکری زاویوں کے اعتبار سے انفرادی طور پر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ ان کے یہاں ناول تفریح سے زیادہ زندگی کی مخصوص انداز میں نمائندگی یا اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ ہے۔ ان تمام میلانات اور خصوصیات کے باوجود آج ہم کو ڈکنس، جارج ایلیٹ اور ہارڈی کے قد و قامت کے ناول نگار نہیں ملتے۔ نئی نسل میں ہیئت کے جدید ترین تجربے ضرور ملتے ہیں لیکن ان کے یہاں دماغی کاوش اور آورد کا عنصر غالب محسوس ہوتا ہے۔ اسی لئے عام پڑھنے والے ان ناولوں سے خاطرخواہ لطف نہیں اٹھاسکتے۔

دورِ جدید کے ناول نگاروں میں ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ وہ "مسلسل ناول" لکھنے لگے ہیں۔ فرانس میں رومیں رولاں Romain Rolland نے "ژین کرسٹاف" لکھا اور مارسل پروست Marcel Proust نے "گزشتہ یادیں" ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان مکمل کئے۔ انگلستان میں ڈارو تھی رچارڈسن کے Pilgrimage کے ساتھ گالزوردی کے Forsyte Saga اور آرنلڈ بینیٹ کے Clayhanger کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان تمام مسلسل ناولوں کا سلسلہ انیسویں صدی میں بالزاک Balzac اور زولا Zola کے فن سے ملتا ہے۔

بیسویں صدی میں ناول کا فن اس قدر متنوع اور پیچیدہ ہوگیا ہے کہ ہمارے لئے

اس پر سیر حاصل تبصرہ کرنا مشکل کام ہے لیکن جدید ناول نگاروں کو مختلف مدرسوں میں تقسیم کر کے مطالعہ کرنے سے ان کی قدر اور اہمیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) "پردیسی ناول"

بیسویں صدی کے بیشتر ناول سفر ناموں کی شکل میں ہیں لیکن ان کے موضوعات اور اسالیب "رابن سن کروسو" Robinson Crusoe اور "سندباد جہازی" کے سفر ناموں سے مختلف ہیں۔ درحقیقت یہ ناول اس جدید رومانی تحریک کی پیداوار ہیں جو عہد وکٹوریہ کے ادب سے براہ راست ردِّعمل کے طور پر لکھے گئے اور جن میں دور دراز کے لوگوں کی طرز معاشرت اور وہاں کی پراسرار فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سائنس اور مادی مفاد کے شکنجہ سے بچ کر فراغت کی سانس لینے کے لئے ایسے ادب سے بہتر کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ انیسویں صدی کے وسط سے ہی برٹن جیسے ادیبوں نے مسلّمہ روایات سے انحراف کیا اور مشرق کی دنیا میں اپنی دلچسپی ظاہر کی۔ اس کا ناول "سیاحۃ المدینہ والمکہ Pilgrimage To El-Medinah &Mecca مشہور تصنیف ہے۔ جارج بارو George Barrow اور رچارڈ جیفریز Richard Jefferies کے ناولوں میں بھی روحانی نجات کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اسٹونسن Stevenson نے پردیسی ناول کو خاص طور پر رائج اور مقبول بنایا۔ اس کے یہاں اصلاح معاشرت کی کوئی تحریک نہیں نظر آتی۔ وہ محض تفریح کی غرض سے افسانے لکھتا ہے۔ اس کے ادبی کارناموں میں Inland Voyage کے علاوہ Treasure Island اور Travels With a Donkey بہت مشہور ہیں۔

رُڈیارڈ کپلنگ Rudyard Kipling جو ہندوستان میں اپنی استعمار پسندی کی وجہ سے بدنامی کی حد تک مشہور ہے ہندوستان ہی میں پیدا ہوا۔ ولایت واپس جا کر اس نے ہندوستان کی فضاؤں، جنگلوں اور وادیوں کو اپنے افسانوں کے ذریعے انگریز قارئین سے روشناس کیا۔ کپلنگ کے یہاں رومانی اور سامراجی اثرات کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ کبھی ہندوستان کے پُراسرار، محیر العقول اور مافوق الفطرت نقشے پیش کرتا ہے تو کبھی گوروں کی کالون

سے ملاقات اور بحری بیڑوں کی مہمات کے خاکے بھی کھینچتا ہے، اس کے ناولوں میں کم Kim سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا اور اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ناول کا ہیرو لاہور میں تربیت حاصل کرتا ہے اور مدرسہ کی تعلیم سے عاجز آکر تبتی لامہ کی شاگردی اختیار کر لیتا ہے۔

ہڈسن W. H. Hudson کو رومانی سفر نامے لکھنے میں بڑی قدرت حاصل تھی۔ وہ امریکہ اور مختلف ممالک کی سیر بھی کر چکا تھا۔ اس کی تصنیفوں میں حقیقت نگاری بالخصوص قدرتی مناظر اور عناصر کے بہترین مرقعے ملتے ہیں جو حقیقت پسندی اور رومانیت سے مرکب ہیں۔ Far Away & Long. A go (1918) میں ارجنٹائنا کی زندگی، نباتات اور چرندوں پرندوں کی دلچسپ تفصیلات ہیں۔ ہڈسن کے ناولوں میں Purple-land (1885) اور Greenmansion (1904) آج بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔

"کننگھم گراہم" Cunningham Graham کا شمار اگرچہ باقاعدہ طور پر ناول نگاروں میں نہیں ہو سکتا لیکن رومانی سفر ناموں کے مصنف کی حیثیت سے اس نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ جنوبی امریکہ چلا گیا اور یوریگوئے اور پیراگوئے میں پھرتا رہا۔ اس کی کتابوں میں اس کے سیاحتی تجربات اور مشاہدات کی تصویریں ملتی ہیں عرصہ تک وہ بھیس بدل کر مراکش اور دوسرے مسلم ممالک کی بھی سیر کرتا رہا جس کی بہترین تفصیل "مغرب الاقصیٰ" "Moghrebel—Acksa" سے ملتی ہے۔

"ولیم پکتھال" نے اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر دین محمدی قبول کیا اور قرآن شریف کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ لبنان، مصر اور ہندوستان میں سیر و سیاحت کے بعد اس نے عرصہ تک ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ دنیائے افسانہ میں پکتھال کی شہرت اس کے ناول "ماہی گیر سعید" "Said The Fisherman" کی بدولت ہے جس میں مشرقی زندگی کا دلپذیر عکس ملتا ہے۔

(۲) "ناول میں حقیقت نگاری"

اگرچہ انگریزی ناول میں حقیقت نگاری بالزاک، جیجوف اور موپاساں کے اثر سے بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی داخل ہو چکی تھی لیکن فیبین Fadian تحریک سے اسے خاص

تقویت حاصل ہوئی۔ اس تحریک کے نمائندوں میں جارج برنارڈ شا اور ایچ۔جی۔ ویلس سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ جنگ عظیم کے بعد سیاسی اور سماجی زندگی کی پیچیدگیوں سے ادب کا ڈھانچہ بدل رہا تھا۔ ان حالات و اسباب کی بنا پر حقیقت پسند ناول معاشرتی انقلاب اور سماجی بیداری کا بہترین وسیلہ ثابت ہوا۔

ایچ۔جی۔ ویلس نے اپنے منشور "معصر ناول" میں اپنے خیالات و مقاصد کی توضیح کرتے ہوئے ناول کے تفریحی رُخ پر سخت تنقید کی ہے۔ چونکہ وہ ناول کو معاشرتی مسائل کا آلہ بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ خالص "فنکاری" کی مخالفت کرتا ہے۔ ویلس کے ساتھ دو مختلف ذہنیتوں کے فنکار آرنلڈ بینیٹ اور گالزوردی بھی ناول میں حقیقت نگاری کے مبلغ اور علمبردار ہیں۔ وہ بھی سماج کے نقشے پیش کرتے ہیں اور معاشرے کی برائیوں کو ہمارے سامنے لاتے ہیں لیکن ان کے یہاں ویلس کا جذبۂ اصلاح اس شدت سے موجود نہیں ہے۔ وہ ویلس کے مقابلہ میں فنکار زیادہ اور مبلغ کم ہیں۔

ایچ۔جی۔ ویلس سنہ ۱۸۶۶ء سے سنہ ۱۹۳۶ء

انگریزی ناول میں جدید یعنی سماجی اور سائنٹفک حقیقت نگاری کا بانی اور مبلغ ایچ۔جی۔ ویلس ہے۔ وہ انگلستان کے علاقہ کینٹ Kent کے ایک معمولی گھرانہ میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی اس کو سخت اور دشوار گذار زندگی میں مبتلا رہنا پڑا۔ لندن اسکول سے فراغت کے بعد وہ صحافت، تدریس اور مختلف طریقوں سے روزی کماتا رہا۔ ۱۸۹۳ء سے وہ باقاعدہ طور پر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوا۔

ویلس نے مقالہ نگاری، تاریخ اور افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی لیکن اس کی شہرت بہت حد تک اس کے ناولوں کی بدولت ہے۔ ہم ان ناولوں کو بآسانی دو ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) سائنٹفک خیالی ناول: سنہ ۱۸۹۵ء سے سنہ ۱۹۰۸ء کے درمیان ویلس نے تخئیلی رومان لکھے جن کا مرکزی تصور سائنٹفک ہوتا تھا۔ ان میں The Time Machine (1895)

The First Man In The Moon The Invisible Man (1897)

The War In The Air (1908)

خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان تمام رومانوں میں ویلس واقعات سے بلند ہو کر زندگی کے سائنٹفک

امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ وہ نہ صرف اجرام فلکی سے اپنے نظریات کی توثیق کرتا ہے بلکہ انسانی زندگی کو نظام شمسی کے دوسرے ثوابت و سیارے سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان تمام ناولوں میں سائنسی رومان کے عناصر غالب ہیں جن میں سے بیشتر کو دورِ جدید کی سائنسی ترقیوں نے حقیقت بنا دیا ہے[۴۲]۔

(۲) **سماجی ناول:** رومانی ناولوں کے بعد ویلس معاشرت کے اہم اور سنگین مسائل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نظام قدرت پر فتح پانے کے لئے انسان کی جد و جہد اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ ویلس جیسے سماجی مفکر کے ہاتھ میں ناول ایک طرح سے معاشرتی خیالات کے ذریعہ اظہار بن جاتا ہے۔ **Tono Bungay** (1909) **Kipps** (1905) **New Machiavelli** (1911) اور **Marriage** (1912) میں سماجی مباحث کے ساتھ بین الاقوامی معاشیات اور مذہبی فلسفہ بھی جگہ پانے لگتے ہیں۔ ان تمام ناولوں میں ایک مشترک عنصر ہے لیکن **Tono Bungay** ایک حد تک منفرد ہے۔ اسے اگر ہم گالزوردی کے **Forsyte Siga** کے ساتھ مطالعہ کریں تو انگریزی سماج کے گرتے ہوئے ڈھانچہ اور مسلّمہ عقائد میں زبردست تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ ویلس کی یہ تصنیف ہمیں جدید انگلستان کے سب سے بڑے مسئلہ کی طرف متوجہ کرتی ہے جس میں رئیسوں اور جاگیرداروں کی دنیا ختم ہو رہی ہے اور نئے قسم کے سرمایہ داران کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کردار ہی یہاں سماجی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں اور مصنف خود پلیٹ فارم پر آکر تقریر نہیں کرتا۔

ویلس نے انگریزی ناول کی وہی خدمت انجام دی جو فرانس میں زولا، روس میں گورکی اور امریکہ میں ڈریزر نے انجام دی تھی لیکن چونکہ اس کی نظر ان تمام معاصرین سے زیادہ وسیع تھی اس لئے وہ اپنے ناولوں میں بین الاقوامی سیاست کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ اسکے بین الاقوامی اور آفاقی میلان کی ایک واضح دلیل اس کی مشہور تصنیف "تاریخ عالم" ہے جس میں اس نے اقوام عالم کے وفاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ انگریزی زبان میں ویلس پہلا مفکر ناول نگار ہے جو اپنی تصانیف میں آفاقی اور عالمگیر زاویہ نگاہ سے انسانی زندگی کے ماضی، حال اور مستقبل کو دیکھتا ہے۔

آرنلڈ بینٹ: ۱۸۶۷ء سے ۱۹۳۱ء تک

ویلیس کے بعد بینیٹ جدید حقیقت نگاری کے سربرآوردہ نمایندوں میں شمار کیا جاتا ہے
فرانسیسی فنکاروں بالخصوص فلوبیئر Flaubert اور موپاساں کی طرح وہ بھی زندگی کی
ہو بہو تصویر کھینچنے اور سماج کی اچھائیوں اور برائیوں کو بجنسہٖ پیش کرنے میں بڑی دستگاہ رکھتا ہے
اس کا فن ایک کیمرہ کی طرح ہے جس سے بغیر کسی ذاتی جذبہ یا احساس کے تصویر کشی کی جاتی ہے۔
بینیٹ انگلستان میں برتن سازی کے مشہور علاقہ "بینلی" میں پیدا ہوا ہے اس نے اپنے
ناولوں میں Five Towns کا نام دیا ہے۔ وہ اسی علاقہ کی صنعتی زندگی اور اس کے
سماجی اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ لندن یونیورسٹی کی تعلیم سے فراغت پا کر ۱۹۰۰ء میں بینیٹ
فرانس چلا گیا اور ۱۹۰۸ء تک وہاں مقیم رہا۔ اگرچہ فرانس جانے سے پہلے اس نے A Man
From The North اور Anna of The Five Towns لکھ کر نئے افسانہ نگاروں
میں اپنی جگہ بنالی تھی لیکن اس کی اصل شہرت اس کے شاہکار ناول The Old Wives
Tale (1908) کی بدولت ہوئی جو فرانس میں لکھا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے
Clayhanger (۱۹۱۰ء) Hilda Of The Lessways اور
These Twains وغیرہ ناول لکھے گئے۔

"بڑھی وں کی کہانی" اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے جس میں مِڈلینڈ علاقہ کی عام زندگی کی
بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے پہلے بالزاک لے ہی "بوڑھے گوریو" Old Goriot
میں فرانس کا نقشہ اس انداز سے کھینچا تھا۔ اس ناول میں ہمیں نہ صرف اس علاقہ کے گلی کوچوں اور
بازاروں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ جزئیات کی مدد سے اس دور کی پوری صنعتی زندگی کا خاکہ بھی ہمارے
سامنے آجاتا ہے یہ ناول دو بہنوں "کانسٹنس" Constance اور "صوفیہ" Sophia
کی کہانی ہے جو بڑھتی ہوئی مادیت اور صنعتی انقلاب کا شکار ہیں۔ اول الذکر اپنی حالت پر صبر
کر کے "برسلے" میں ہی زندگی گزار دیتی ہے اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز سی رہتی ہے لیکن صوفیہ
کے اندر زندگی کی توانائی ہے۔ وہ محبت کرتی ہے اور اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ نکلتی ہے۔
پیرس میں اس کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ "محاصرہ" کے دوران میں خاص
حلقوں سے روشناس ہوتی ہے۔ آخر کار وہ بھی اپنے وطن واپس آتی ہے اور اپنی بہن کے

ساتھ زندگی کے باقی دن گزار دیتی ہے۔

بینٹ کی کہانیوں میں "مادیت" کے خلاف بڑا قوی میلان پایا جاتا ہے۔ یہ وہ مرض ہے جو انسان سے زندگی کی مسرتیں چھین لیتا ہے اور جس سے سارے اخلاقی اور روحانی اقدار دب کر رہ جاتے ہیں۔ اگر زیادہ حق بیانی سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ بینٹ زندگی کا ایک ہی رُخ پیش کرتا ہے جس سے اس کے یہاں یکسانی اور بے کیفی پیدا ہو جاتی ہے اور ہم زندگی کی قیمتی قدروں اور مسرتوں کو حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔

گالزوردی

ویلس اور بینیٹ کے ساتھ تیسرا نام گالزوردی کا ہے جو ناول اور ڈرامہ میں زندگی کے مسائل پر غور و فکر اور حقیقت نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔ گالزوردی فن ناول میں بینیٹ کی حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس نے اپنے مطمحِ نظر کی وضاحت "سرائے امن" Inn of Tranquillity میں بخوبی کی ہے جس میں اس نے ناول نگار کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی ہے جو ایک راہب کی طرح اپنی قندیل کی روشنی میں خیر و شر کو جوں کا توں دکھاتا ہے۔ گالزوردی اپنے کو ایسے مصنف کی حیثیت سے لاتا ہے جو معاملے کے ہر پہلو پر نظر ڈالتا ہے لیکن اپنی رائے نہیں پیش کرتا۔ فن کی یہ معروضیت جسے اس نے ڈرامہ میں نبھانے کی کوشش کی ناول میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکی۔

ایک خوشحال متوسط طبقہ سے متعلق ہونے کے باوجود گالزوردی کو عام انسان کے ساتھ جو ہمدردی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے یہاں فکر و احساس کی وہی صداقت پائی جاتی ہے جو ہم کو اس سے پہلے میتھو آرنلڈ، میرڈیتھ اور سیموئل بٹلر کے یہاں محسوس ہوتی ہے چنانچہ ابتدائی کوششوں کے بعد جب اس نے ۱۹۰۴ء میں The Island Pharisees لکھی تو اس کے ذہن کی سمتیں متعین ہو چکی تھیں۔ اس ناول میں مصنف نے سماجی انتشار کے اسباب بیان کرتے ہوئے اس نے انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے جو قدیم و جدید کے درمیان جنگ کی صورت میں نمودار ہو چکا تھا۔ رؤسا اور جاگیردار پرانے نظام کو باقی رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن نئے انقلابی ان تمام روایتوں کو ختم کرنے پر آمادہ تھے۔

قدیم و جدید کی یہ کشمکش ہی گالزوردی کے تمام ناولوں کا مرکز ہے The Island Pharisees (1904) میں اس نے طبقۂ امرا کے عقاید پر سخت طنز کے ساتھ تنقید کی ہے The Mau of Property (1806) میں ان کی جاگیرداری پر شدید حملے کئے گئے ہیں۔ اسی طرح The Country House میں جاگیرداروں کے اعمال اور The Patricians میں ان کی وراثت اور ان کے احساس برتری کو زخم لگائے ہیں۔ گالزوردی کے ناولوں میں دور جدید کا رئیس اپنے عقائد، اعمال اور وراثت کی بنا پر ترقی پذیر سماج سے الگ اور اجنبی ہو جاتا ہے اور اس کو نئی نسل کے مجاہدوں سے ہر قدم پر شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ انھیں موضوعات کو لے کر گالزوردی نے Forsyte Saga لکھی جس میں سماجی انتشار، معاشی بدنظمی اور تمدنی کشمکش کا جزیہ کھینچا ہے Forsyte Saga اور A Modern Comedy کے ذریعہ اس نے عہد وکٹوریہ سے لے کر دور جدید کے چار پشتوں کی خاندانی تاریخ مرتب کی ہے جس میں تہذیب کے شکست و ریخت کی ترجمانی بڑے حسن اسلوب کے ساتھ کی گئی ہے۔ گالزورودی زندگی کے ان تمام معاملات و مسائل کو اپنا موضوع بناتا ہے جو جدید ادب کا جزو لاینفک ہیں لیکن وہ ان میں سے کسی کا کوئی حل نہیں پیش کر سکتا۔ اس کے باوجود اس کی جودت طبع اور وسعت نگاہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے ناولوں کی اشاعت روس میں بہت ہوئی ہے جہاں اسے ترقی پسند سماج کے داعیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

(۳) "تاثراتی ناول"

انگریزی ناول میں رومانی سفرنامے اور حقیقت نگاری دونوں فنی اعتبار سے عہد وکٹوریہ کی روایتیں ہیں۔ ان تمام ناولوں کی امتیازی خصوصیت پلاٹ کا ایک خاص انداز کردار کی ایک خاص ساخت اور فضا کی ایک خاص کیفیت ہیں لیکن جدید ناول جس کی ابتدا ہنری جیمس سے ہوتی ہے۔ بہت بڑی حد تک ان لوازمات سے آزاد ہے۔ اب ناول کا فن تاریخی تسلسل نہیں بلکہ زندگی کے مختلف تاثرات کی ترجمانی ہے۔ ان تاثرات میں خارجی آویزش اور داخلی کشمکش یکساں طور پر داخل ہیں۔ ہنری جیمس اپنے ناولوں میں کرداروں کی زندگی اور خارجی عوامل کے مقابلہ میں داخلی احساسات

اور افکار پر زیادہ زور دیتا ہے۔

ہنری جیمس کو انگریزی ناول میں "نفسیاتی مدرسہ" کا بانی کہا گیا ہے لیکن اسے "تاثر پسند" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ وہ نئی نسل کا ناول نگار تو ہے مگر شعور اور تحت الشعور کی گہرائیوں میں نہیں جاتا۔ اس کے یہاں زندگی کا عرفان موجود ہے اور وہ ناول نگاری کے بہترین دبستانوں کی پیداوار ہے۔ اس کے فن پر فرانسیسی تاثر پسندوں کا خاص اثر ہے۔

تاثراتی ناول پر بحث کرتے ہوئے فورڈ میڈکس Ford Madox نے لکھا ہے کہ ہم زندگی میں تاریخی تسلسل بہت کم پاتے ہیں اس لئے فن میں بھی اس کا جواز نہیں فنکار جب کسی حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ شروع سے آخر تک اس طرح بیان نہیں کرتا جس طرح مورخین کرتے ہیں۔ وہ چند تاثرات کو زندگی سے اخذ کر کے ترتیب دیتا ہے اور ان کو ایک کل بنا کر پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بڑی عمارت کو دیکھنے پر سب سے پہلے ہمیں اس کے معماروں کا خیال نہیں ہوتا بلکہ اس عمارت کی ساخت، اس کے حسن اور اس کی عظمت کا نقش ہمارے ذہن پر ہوتا ہے اور پھر ہم اسے ماضی کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ تاثراتی ناول نگاروں نے اس سلسلہ میں بڑے اختراعات سے کام لیا اور ہنری جیمس، جازف کانریڈ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ہاتھوں اس میں مزید وسعت ہوئی۔

تاثراتی ناول کی دوسری بڑی خصوصیت اس کا ڈرامائی انداز بیان ہے۔ ہنری جیمس نے ناول میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے ایسا معلوم ہو کہ قارئین ماضی میں چند کرداروں کی زندگی کا مطالعہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ خود اس ڈرامہ میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان ناولوں میں مصنف کرداروں کی زندگی پر تبصرہ نہیں کرتا بلکہ ایک کردار کے ذریعہ دوسرے کردار کو ہم سے روشناس کراتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں تاثراتی ناول کا فن تحلیلی نہیں بلکہ ترکیبی ہے۔ یہ تکنیک روایتی ناول پر دوسرا اہم اضافہ ہے۔ ڈکنس اور تھیکرے اپنے کرداروں کے حرکات سکنات پر جو رائیں دیتے ہیں وہ ہمیں تھکا دیتی ہیں لیکن جیمس اور کانریڈ کے یہاں مصنف اپنی رائے کے ساتھ پوشیدہ رہتا ہے اور اس کے کردار اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ہنری جیمس ۱۸۴۳ء سے ۱۹۱۶ء

جدید ناول کی تاریخ میں ہنری جیمس کے مقام کا اعتراف عام ہے لیکن اس کے فن کے متعلق رائیں مختلف ہیں۔ اگر ایک طرف جانئے کا رنیڈ جیسے ماہر فن نے اسے اپنا استاد اور "نازک ترین احساسات کا مورخ" تسلیم کیا ہے تو دوسری طرف ہارڈی اس پر محض "لفاظی" اور ویلیس "سطحیت" کا الزام لگاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جدید ناول نگار ہنری جیمس کے فن اور تکنیک سے تجاہل نہیں برت سکتا۔ جدید ناول میں تاثریت اور نفسیاتی کیفیات کی ترجمانی کر کے اس نے افسانہ کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ نقادوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ جیمس کو انگریزی ناول میں وہی مقام حاصل ہے جو فرانسیسی ناول میں فلوبیئر Flaubert کو ہے۔

ہنری جیمس امریکہ کے شہر نیویارک میں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوا۔ والدین نے ولیم جیمس (جو مشہور ماہر نفسیات ہوا) اور ہنری جیمس کو اعلیٰ ترین تعلیم دلوائی۔ دونوں بھائی اس غرض سے نیویارک، لندن، پیرس، جنیوا اور بون کے درسگاہوں میں بھیجے گئے۔ یورپ کی سیاحت اور مخصوص ذہنی میلان کی بنا پر ہنری جیمس کو امریکی تہذیب سے کوئی خاص اُنس پیدا نہیں ہو سکا۔ وہ ابتدا سے ہی اپنے کو عالمی شہری خیال کرتا تھا۔ اس وسعت خیال کا احساس اس کے ناولوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ہنری جیمس نے فن ناول پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو آج تک منشور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ناول نگاری ایک لطیف فن ہے اور اس کا مطالعہ سنجیدگی کے ساتھ کرنا چاہیئے اس کے یہاں حقیقت کی تلاش کا جذبہ زیادہ کارفرما ہے۔ اسی لئے وہ مباحث اور نظریات کے ذریعہ اس فن کے امکانات کا جائزہ لیتا ہے۔ ناول اس کے بقول زندگی کا براہ راست تاثر ہے جس میں مصنف کی انفرادیت اور اسلوب بیان کو خاص دخل حاصل ہے۔ اس کے ناولوں میں چند موضوعات بار بار آتے ہیں جن کو ہم حسب ذیل عنوانات دے سکتے ہیں :۔

(۱) بین الاقوامی صورت حال International Situation کے ناولوں میں وہ دکھاتا ہے کہ امریکہ پر یورپ، قدیم پر جدید اور معصوموں پر دنیا کے تجربہ کاروں کے حضرات کا دباؤ کیسے پڑتا ہے۔

(۲) اپنے چند ناولوں اور افسانوں میں ہنری جیمس فن اور فنکار کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے:

(۳) ہنری جیمس کے کچھ ناولوں میں نئی دنیا کے سیاحوں اور یورپ کے معاشرہ کے اثر سے ان کے جذباتی المیات کی بھی ترجمانی ملتی ہے۔

ہنری جیمس کے مشہور ناولوں مثلاً Roderick Hadson

Portrait of A Lady اور The Ambassador وغیرہ میں یہی موضوعات ملتے ہیں جیمس نے اس نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ اس کا شاہکار ناول The Portrait Of A Lady ہے جس میں فن اور نظریہ کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اِسابل آرچر ایک امریکی گھرانہ کی لڑکی ہے جس نے رومانی مزاج پایا ہے۔ امریکہ میں کئی معاشقوں کے بعد وہ تازہ رومانوں کی تلاش میں انگلستان آتی ہے۔ یہاں بھی وہ یکے بعد دیگرے بہت سے عاشقوں کے حوصلے بڑھا کر ان کو چھوڑ دیتی ہے۔ آخر کار اٹلی میں وہ ایک حرافہ کے جال میں پھنس جاتی ہے جو اس کی شادی ایک غریب فنکار کے ساتھ کرا دیتی ہے۔ وہ خود اس فنکار کی داشتہ تھی اور اسابیل کی دولت سے اپنی ناجائز لڑکی کے جہیز کا سامان کرنا چاہتی تھی۔ کہانی کا آخری حصّہ بہت دردناک ہے جب ہیروئن کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ پھر پلٹ کر خوشی اور مسرت کی تلاش نہیں کرتی بلکہ اپنے مقدر کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتی ہے اور صبر کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ اس ناول میں ہنری جیمس نے امریکی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زندگی کے نہ صرف جیتے جاگتے مرقعے پیش کئے ہیں بلکہ المیہ کا ایک نیا انداز بھی پیش کیا ہے۔ جدید زندگی کا المیہ محض موت نہیں بلکہ تمناؤں اور آرزوؤں کا خون، تنہائی کا احساس اور مقدرات سے سمجھوتہ ہے۔ ہنری جیمس نے اسابیل آرچر کا کردار ایک خاص زاویہ سے پیش کیا ہے اور اس کی زندگی میں ایک مستقل عذاب سے بچ کر بالآخر سپردگی کا نمونہ بن جاتی ہے۔

ہنری جیمس کے آخری دور کے تین ناول The Wings of Dove

The Ambassadors (1903) اور Golden Bowe (1904)

(1904) عظیم الشان کارنامے ہیں لیکن ان میں تکنک اور فنکاری سے کبھی کبھی گرانباری کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس سے تو انکار نہیں کہ ہنری جیمس جدید انسان اور اس کی تہذیب کا بہترین ترجمان ہے اور اس کے یہاں جذبہ و احساس کو مثالی کیفیت حاصل ہے لیکن وہ اپنے

ناولوں میں طبقۂ اعلیٰ کا فنکار ہو کر رہ جاتا ہے اور عوام اس سے کبھی مانوس نہیں ہو سکے۔ وہ دیدہ و دانستہ اپنے کرداروں کو ایسے خول میں رکھتا ہے جو اعلیٰ طبقہ سے مخصوص ہے۔ اس کے یہاں زندگی کا نظریہ یکسانیت کی وجہ سے بے کیفی کی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلس نے اسی لئے کہا تھا کہ ہنری جیمس کی دنیا اس گرجا گھر کی طرح ہے۔ جہاں ساری توجہ منبر پر ہوتی ہے مگر سامعین کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس کی مثال ایک دریائی گھوڑے کی طرح ہے جو مٹر کی پھلی کو اٹھانے کے لئے باربار جھکتا ہے۔

ہنری جیمس کے متعلق اگرچہ ہمیشہ رایوں میں اختلاف رہے گا لیکن اس سے انکار نہیں کہ اس نے اپنے بعد متعدد فنکاروں کو نئی روشنی کی تعلیم دی۔ امریکہ میں ایڈیتھ وھارٹن اس کی نازک خیالیوں کو ناول میں اپنانے کی کوشش کرتی رہی اور فاکنر **Faulkner** نے داخلی خود کلامی کا فن اسی سے سیکھا۔ انگلستان میں کانریڈ اور جیمس جوائس جیسے فنکار اس سے مستفید ہوئے اور یہ اس کی عظمت کی بین دلیل ہے۔

جازف کانریڈ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۲۴ء

بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں جازف کانریڈ نہ صرف انگلستان بلکہ یورپ اور امریکہ میں بھی شہرت رکھتا ہے۔ وہ پولینڈ کا باشندہ تھا لیکن اس کی تعلیم فرانسیسی زبان میں ہوئی باغی والدین کی اولاد ہونے کے باعث اسے سخت پریشانیوں اور ذہنی و روحانی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سترہ سال کی عمر میں وہ فرانس آیا لیکن مارسلیس **Marseilles** میں ایک معاشقہ کے بدولت ۱۸۷۸ء میں اسے انگلستان آکر پناہ لینا پڑی۔ مختلف ممالک میں بحری خدمات کے بعد وہ انگلستان کا باشندہ ہو گیا اور انگریزی قومیت اختیار کر لی۔

کانریڈ صحیح معنوں میں عالمی شہری تھا۔ وہ شمالی و جنوبی امریکہ، یورپ میں روس، پولینڈ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور اسپین اور افریقہ کے ممالک کے علاوہ ایشیا میں ہندوستان، لنکا، برما، ملایا مشرق بعید، چین اور آسٹریلیا تک سیاحت کر چکا تھا۔ اس کے ناولوں میں جو انسانی اور آفاقی عناصر ملتے ہیں وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتے ہیں، وہ عہد جدید کا ہی نہیں بلکہ مستقبل کا بھی فنکار ہے۔ اس کے افسانوں میں عصری مسائل کے بجائے بنیادی انسانی احساسات اور

جذبات کی کارفرمائی ہے۔ انسانی زندگی میں جذبات اور اعمال کی باہمی کشاکش سے جو ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا موثر طریقہ پر ادا کردینا کانریڈ ہی کا کام ہے۔

کانریڈ پیدائشی طور پر رومانی واقع ہوا تھا اسی لئے سمندر کی دلفریبیاں اس کو بچپن سے ہی اپنی طرف گرویدہ کئے ہوئے تھیں۔ وہ مشرق اور مشرقی طرز معاشرت کا بہت دلدادہ تھا اسی وجہ سے اس کے ناولوں میں مشرق بالخصوص ملایائی زندگی کی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ دور جدید کے رومانی حقیقت نگاروں میں وہ صف اول کے فنکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ رومانیت کے ساتھ کانریڈ کے مزاج میں حزن ویاس کا عنصر لازمی طور پر غالب رہا۔ اس کے افسانوں اور ناولوں میں نہ صرف کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ ملتا ہے، بلکہ زندگی کا ایک پرگداز عرفان بھی موجود ہے۔ وہ انسان کو مختلف داخلی وخارجی قوتوں سے جدوجہد کرتا ہوا پاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے یہاں کسی قسم کے مایوسیت کی گنجائش نہیں۔

کانریڈ کی ادبی شخصیت کی تشکیل میں روسی ناول نگاروں مثلاً دستوئیفسکی اور ترگنیف اور فرانسیسی فنکاروں بالخصوص وکٹر ہیوگو، بالزاک، فلوبیر اور موپاساں کے مطالعہ کا بڑا اثر ہے۔ انگریزی میں وہ ڈکنس اور مریاٹ Marryat کے علاوہ ہنری جیمس سے بھی متاثر رہا۔ وہ خود ایک خلاق ذہن اور شاعرانہ مزاج رکھتا تھا جس نے اس کو ایک منفرد فنکار بنا دیا۔ اگرچہ فن ناول نگاری میں کانریڈ نظریاتی مباحث سے احتراز کرتا رہا لیکن اس کے خطوط اور تنقیدی مقالوں سے اس کے خیالات اور میلانات کا پتہ ملتا ہے۔ وہ شدید قسم کے انفرادی مصنفین میں تھا اسی لئے اسے کسی مدرسۂ فکر کا غلام نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نہ تو ویلس کی طرح حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنا سکتا تھا اور نہ نفسیاتی ناول نگاروں کی طرح شعور ولاشعور کی گہرائیوں میں اپنا دم گھٹانا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک زندگی متنوع اور دلآویز کیفیتوں سے معمور ہے۔ فنکار کا مقصد نہ صرف زندگی سے لطف اندوز ہونا ہے بلکہ ڈوب کر اس کا جائزہ بھی لینا ہے۔ کانریڈ فنکارانہ جدت طرازیوں کے بجائے تخیل کی اہمیت کا قائل ہے اور اسے وہ زندگی کی ترجمانی کا بہترین وسیلہ سمجھتا ہے۔ انھیں اسباب کی بنا پر اسے "تاثر پسندوں" میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

کانریڈ کی ادبی زندگی تین مختلف ادوار میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ اپنے ابتدائی تخلیقی دور

میں اس نے ملایائی زندگی اور سمندری تجربوں کی مدد سے مشرقی رومان لکھے۔ ان ناولوں میں پلاٹ اور کردار نگاری سے زیادہ "پس منظر" اور "فضا" اہم ہیں۔ ان تصانیف میں جدید و قدیم کی باہمی کشمکش، نوآبادیاتی مسائل اور انفرادی المیہ کی جھلکیاں بھی موجود ہیں Almayer's Folly (1895) اور An Outcast (1896) اسی دور کی پیداوار ہیں۔
The Nigger of The Narcissus ایک بحری سفر کا دلچسپ مگر نتیجہ خیز بیان Heart of Darkness میں افریقہ میں یورپین اقوام کی تہذیب کے نام پر نوآبادیاتی ہوس اور لوٹ کھسوٹ اور خود ان کی اس تاریک براعظم کی فطری قوتوں سے مقابلہ کے نہایت موثر نقشے ہیں لیکن اس دور کے بہترین کارنامے (1900) Lord Jim اور (1904) Nostromo ہیں۔ اول الذکر ناول میں افسانہ کا ہیرو اپنے اصول و عقائد سے غداری کے باعث ایک جگہ سے دوسری جگہ پریشان پھرتا ہے اور آخر کار دنیا کی نگاہوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے موت کو قبول کر لیتا ہے۔ "ناسترومو" جنوبی امریکہ میں ابھرتے ہوئے جمہوریہ کی داستان ہے جس میں ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کی جنگ کے علاوہ جدید تجارتی مہمات، رسل و رسائل کے وسیلوں کے فروغ اور صنعت و صحافت کی تاریخ عجیب انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس ناول میں چاندی کی کان کے گرد انسانی ہوس اور انسانی خواہشوں کی بے حاصلی کے مرقعے بہت دلدوز ہیں۔

اپنی ادبی زندگی کے دوسرے دور میں کانریڈ نے مختلف قسم کے فنی تجربے کئے۔ A Secret Agent (1907) میں اس نے لندن کے خفیہ سراغ رسانوں اور دہشت پسندوں کی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ Under Western Eyes (1910) میں روسی استبداد اور جبریت کے روح فرسا مناظر ہیں (1912) Chance میں کانریڈ نے ڈکنس اور ہنری جیمس کے انداز میں ایک رومانی کہانی لکھی ہے۔ مگر اس دور کا شاہکار Victory (1915) ہے جو جنگ عظیم اول کے ابتدائی زمانہ میں لکھا گیا۔ اس ناول میں کانریڈ کی رومانیت، ڈرامائی اور فنی اسالیب بوجہ احسن موجود ہیں۔ ناول کا ہیرو ہیٹ Heyst دور جدید کے "ٹوٹتے اصنام" کا بہترین مرقع ہے جو اپنی مجہولیت کے باعث زبردست المیہ کا شکار ہوتا ہے آخری

دور میں کانریڈ نے اپنی یادداشتوں سے نئے افسانے مرتب کئے جن میں Arrow of Gold اور The Rover کافی مشہور ہیں۔

بیسویں صدی کے ناول نگاروں میں کانریڈ کا مقام بہت اونچا ہے۔ ہنری جیمس، ویلس اور ورجینیا وولف جیسے فنکاروں نے بھی اس کی ژرف نگاہی اور عظمت کا لوہا مانا ہے۔ دور جدید کے لکھنے والوں میں کانریڈ اپنے شاعرانہ و فلسفیانہ مطمح نظر، نفسیاتی تجزیہ اور اسلوب بیان کی جدتوں کی بناپر ہمیشہ منفرد رہے گا۔ اس کے متعلق ورجینیا وولف کا ایک جملہ بہت مشہور ہو گیا ہے:۔

"ہم اس کے اوراق پر نظر ڈالتے ہوئے ایسے ہی محسوس کرتے ہیں جیسے ہیلن آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے محسوس کرتی ہو گی کہ چاہے وہ کچھ بھی کرے وہ کسی حالت میں بھی معمولی عورت نہیں کہی جا سکتی"

ڈی۔ ایچ۔ لارنس ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۰ء

لارنس کی شخصیت اس کے معاصرین میں سب سے الگ ہے۔ وہ ایک معمولی گھرانہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی تھا لیکن اس کے اندر بہترین انسانی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اس کے برخلاف اس کی ماں تعلیم یافتہ، مہذب اور روحانیت کی پرستار تھی۔ والدین کے مزاج کے اس اختلاف کا اثر ان کی اولاد پر بھی پڑا چنانچہ لارنس نے اسی گھریلو تناقض کو اپنے مشہور ناول Sons & Lovers کا موضوع بنایا ہے۔ ۱۹۱۰ء میں اپنی ماں کے انتقال کے بعد لارنس ایک جرمن لڑکی فرائیدہ Frieda سے قریب ہوتا گیا اور ۱۹۱۴ء میں اس سے شادی بھی کر لی۔ جنگ عظیم کے دوران وہ اپنے وطن اور سارے یورپ سے اکتا کر قلب و روح کے سکون کے لئے آسٹریلیا چلا گیا جہاں اس نے Kangaroo کے عنوان سے ناول لکھا۔ اسی سیاحت کے سلسلہ میں اس نے اپنی زندگی کے کچھ دن میکسکو میں بھی گزارے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں لارنس اطالیہ میں رہا اور اسی ملک کے مشہور شہر وینس میں ۱۹۳۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔

لارنس نہ صرف افسانہ نگار بلکہ انشاپرداز اور شاعر بھی تھا۔ اس کی شخصیت اور فن کا صحیح اندازہ ان تمام تصانیف کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے دور کا بڑا ممتاز ذہن ہے۔ اس نے زندگی کو اپنے شعور کے آئینہ میں دیکھا اور اس کے اس طرح سے پیش کیا کہ زمانہ اس سے قبول کئے بغیر

نہیں رہ سکا۔ ایک اعتبار سے اس کے تمام ناول اس کی زندگی کی تفسیر کے مختلف ابواب معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کا روسو ہے جو اپنے معاصرین کی کند ذہنی اور بے حسی کا پردہ فاش کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ابتدا سے ہی وہ انگلستان کی کثیف مادیت اور صنعتی غلبہ کا سخت مخالف تھا صنعتی زندگی کے تصنع اور اس کی ریاکاری کے مقابلہ میں دیہات کے معصوم مناظر اور موسم کی خوشگوار تبدیلی اس کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھی۔ دیہات سے لارنس کی گرویدگی اس حد تک بڑھی کہ اسے رفتہ رفتہ یقین ہو گیا کہ شہروں اور صنعتی مرکزوں کے مقابلہ میں دیہات کی زندگی فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ دیہاتیوں کے مذہبی جذبات زیادہ فطری اور اصلی ہوتے ہیں اور ان کی زندگی میں ایک بے ساختہ رومانیت ہوتی ہے جو کسی نظریہ یا فلسفہ کی محتاج نہیں۔

لارنس زندگی کو سربستہ اسرار کا ایک سلسلہ سمجھتا ہے جن کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان وہ صحتمند رشتہ قائم کیا جائے جو فطرت کا مطالبہ ہے "جنسی شعور" نہ صرف لارنس کی زندگی بلکہ اس کے فن کا بھی محور ہے۔ اسی لئے اس کے اکثر نقادوں نے اسے "جذبۂ جنسی کا مصلوب" کہا ہے۔ وہ زندگی کو جدید تہذیب کی تمام پابندیوں سے آزاد کر کے فطری بنانے کا قائل ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ مختلف اسباب و حالات کے ہوتے ہوئے یہ ممکن نہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے معصوم تعلق پر ایک کثیف پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس فلسفہ اور طرز فکر نے لارنس کی کردار نگاری کو خاصہ مبہم بنا دیا ہے۔ اس کے کردار روایتی کرداروں کے برخلاف کسی خاص ماحول ہی کے پیداوار نہیں بلکہ اپنے اندر نفسیاتی کشمکش اور روحانی انتشار کی علامتیں بھی لئے ہوئے ہیں۔ ہنری جیمس جیسا ناول نگار بھی اپنے کرداروں کے داخلی ڈرامہ کی ترجمانی کرتے ہوئے خارجی دنیا سے بے تعلق نہیں رہ سکا لیکن لارنس اپنے کرداروں کے احساسات اور تاثرات کی نمائندگی کرتے ہوئے شعور اور تحت الشعور کا پابند رہ جاتا ہے۔ جدید زندگی کی سقیم کیفیت سے عاجز آ کر لارنس مرض کی تشخیص کرنا چاہتا ہے لیکن اس کوشش میں وہ خود جذباتی انفرادیت کا شکار ہو جاتا ہے اور سوائے جنسی شعور کے اس کے یہاں کوئی دوسری موثر قوت نہیں نظر آتی۔

Sons & Lovers لارنس کا پہلا کامیاب ناول ہے جس میں اس نے ماں اور بیٹے کے درمیان اس محبت سے بحث کی ہے جس کے اندر غیر شعوری طور پر جنسی

جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ یہ ناول فرائیڈ ہ سے شادی کے فوراً بعد لکھا گیا تھا اس لیے اس میں نفسیاتی اور جنسی زندگی کی تمام کیفیات موجود ہیں The Rainbow (1915) کو فحاشی کے تحت لے کر لارنس کی عدالت میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ اس ناول میں بھی داخلی زندگی کے اس بکھراؤ کا اظہار ہے جو جذبہ جنسی کی خارجی رکاوٹ سے پیدا ہوتا ہے اور جس سے جذبہ جنسی کی بے دریغ زندگی ہی میں پناہ مل سکتی Kangaroo (1923) میں فطری زندگی جو بدویت کی مترادف ہے اور جدید مہذب زندگی کے درمیان تصادم دکھایا گیا ہے جس نے انسان کی روح کو کئی اعتبار سے مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ میریڈیتھ نے انسان کی فطرت میں نسل، ذہن اور روح کی عظمت کو اہم مانا ہے لیکن لارنس محض "نسل" اور "جنسی شعور" کا قائل ہے جن کی تکمیل اور آسودگی سے انسان کائنات کے سربستہ اسرار سے آشنا ہو سکتا ہے۔

لارنس کا آخری کامیاب ناول Lady Chatterley's Lover ہے جو ۱۹۳۱ء میں اٹلی میں شائع ہوا۔ اس ناول میں مصنف نے اپنے مخصوص موضوع کو زیادہ وضاحت اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کر کے ایک نئے قسم کا فنی شاہکار پیدا کیا ہے۔ اس افسانہ میں ایک عورت اپنے نامرد شوہر سے بیزار ہو کر اپنے ملازم سے جنسی تعلقات قائم کر لیتی ہے اور اس کو اپنی آسودگی کا واحد آلہ بناتی ہے۔ اس ناول کی اشاعت پر بڑا واویلا مچا اور اسے "فحش و مخرب اخلاق" قرار دیا گیا۔ مڈلٹن مرے نے اس ناول کو لارنس کے فنی زوال کی بدترین مثال بتائی ہے کیونکہ یہاں انسان فطری طور پر جنسی لذت کے لئے مہذب، اخلاق اور جملہ روایتی اقدار کو قربان کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔ یہ تنقید سطحی اور عوامی اعتبار سے صحیح ہو سکتی ہے لیکن Lady Chatterley's Lover اس سے بہت بلند اور بالا تخلیقی کوشش ہے۔ اس ناول میں نفسیاتی زندگی کے تجزیہ کے علاوہ لارنس کی محرومی اور ناکامی اور زندگی سے بیزاری اور جدید تہذیب کے خلاف بغاوت کا بھی شدید اظہار ہے۔

لارنس فن ناول نگاری میں ایک مستقل سنگ میل ہے۔ اس کے یہاں پلاٹ اور کردار کے روایتی لوازمات کے بجائے داخلی زندگی کی کیفیتوں، جدید تہذیب کی ثقافتوں اور عام انسانوں کی نامرادیوں کا احساس ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جدید انسان کو جن مسائل سے سابقہ ہے ان کے

حل کے لئے ویلس، شا، جوائس اور ہکسلے کے ساتھ لارنس کا مطالعہ بہت ضروری ہے جس کا اپنا مخصوص مطمح نظر ہے اور ان مسائل کا بالکل جداگانہ حل۔ ہم کو اس کے نقطۂ نظر سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ہم اس کی بصیرت اور اس کے خلوص سے شاید ہی انکار کر سکتے ہیں۔

(۴) نفسیاتی ناول اور جیتمۂ شعور:۔

The Psychological Novel & Stream of Consciousness

اگرچہ ہنری جیمس، کانریڈ اور لارنس کے ناولوں میں روایتی ناول کے مقابلہ میں جدید نفسیاتی تجزیے اور داخلی زندگی کی تشریحات موجود ہیں لیکن یہ ناول نگار افسانہ کی روایتی ساخت سے منحرف نہیں تھے ان کے ناولوں میں ترتیب ماجرا، کردار نگاری اور پس منظر سے بے اعتنائی نہیں برتی گئی ہے۔ ان کے برخلاف ڈاروتھی رچارڈسن، جیمس جوائس اور ورجینیا وولف نہ صرف روایت سے انحراف کرتے ہیں بلکہ اس کے حرکات و سکنات کو خارجی دنیا سے آزاد و بے نیاز ہو کر ذہن اور شعور کی روشنی میں پیش کرتے ہیں اور کیفیات شاعرہ سے ان کی تدوین کرتے ہیں۔ ان ناول نگاروں کو ان کی شدید داخلی انفرادیت کے باعث "جیتمۂ شعور" (Stream of Consciousness) کا فنکار کہا گیا ہے۔

یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے کچھ قبل یعنی ۱۹۱۰ء میں ہی عہد وکٹوریہ کے مذہبی عقاید اور ادبی و فنی نظریات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ اسی زمانہ میں "تاثریت" کے بعد کی نقاشی Post—Impressionist Painting کی بھی دھوم مچی تھی۔ مشہور روسی ناول نگار دستوؤسکی کے ناولوں کے انگریزی ترجمے کئے جا رہے تھے اور فرائڈ Freud اور ینگ Jung کے نفسیاتی نظریات پر بحثیں ہو رہی تھیں لیکن جنگ عظیم کے بعد فضا یکایک بدل گئی۔ ہر فنکار شعوری طور پر داخلی دنیا سے زیادہ دلچسپی لینے لگا اور خارجی حقیقت نگاری ایک طرح سے قدامت پسندی تصور کی جانے لگی۔ زندگی اور اس کے اقدار کا اظہار شعور و لاشعور کی گہرائیوں میں تلاش کیا جانے لگا اور فن میں نفسیات کی اہمیت بڑھنے لگی۔ ولیم جیمس کی "اصول نفسیات" (۱۸۹۰ء) کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ذہن کی سرزمین" میں جیتمۂ شعور کا پتا لگایا اور اس کو جیتمۂ خیال اور داخلی زندگی کا نام دیا۔ اس کی تحقیقات کا بتدریج ناول نگاروں پر بھی اثر پڑا چنانچہ جدید نفسیاتی ناول نگاروں نے اپنے افسانوں کی بنیاد کردار اور

کی داخلی زندگی کی روداد پر رکھی۔ سب سے پہلے "مے سنکلیر' May Sinclaire
نے ۱۹۱۸ء میں ڈاروتھی رچارڈسن کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے "چشمۂ شعور" کی اصطلاح ایجاد
کی۔ فن ناول کی تنقید میں یہ ایک اہم اضافہ تھا۔ اگرچہ اس مخصوص تکنک کا استعمال رچارڈسن اور
اسالیٹ وغیرہ جیسے ناول نگاروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن اس اہتمام اور التزام کے ساتھ
داخلی فضا پیدا کرنا۔ جنگ عظیم کے بعد کے فنکاروں کا ہی کارنامہ ہے۔

ڈاروتھی رچارڈسن : ۱۸۹۳ء

ڈاروتھی "چشمۂ شعور" کی نمایندہ فنکار ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ناول ۱۹۱۵ء
"Pointed Roofs" میں اس تکنک کا استعمال کیا۔ ان ناولوں کا سلسلہ ۱۹۳۶ء
تک جاری رہا اور ان بارہ ناولوں کا مجموعہ "Pilgrimage" کے نام سے منظر عام پر
آیا۔ ان مسلسل ناولوں میں پلاٹ ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور المیہ اور طربیہ کے رسمی فرق کا
احساس باقی نہیں رہتا۔ نہ تو یہاں عشق و محبت کے رسمی مفروضات ملتے ہیں اور نہ ان کی
بنیاد پر کسی ذہنی کشمکش کا ہی پتہ چلتا ہے۔ ان تمام ناولوں میں مرکزی کردار "مریم ہنڈرسن"
کی روزمرہ زندگی اور اس کے ذہنی تجربات اور تاثرات کا بیان ہے۔

"Pilgrimagoe" یقیناً ایک بڑی تخلیقی کوشش ہے لیکن بہت کم لوگ ایسے نکلیں گے
جو بغیر تکان محسوس کئے ہوئے اس کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت گوارا کر سکیں۔ ناول کی ابتدا جرمنی
کے ایک اسکول میں ہوتی ہے جہاں مریم تعلیم پا رہی ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں مریم کے خیالات
اور تاثرات میں تازگی اور شگفتگی ملتی ہے اور زمانہ گزرتے جانے پر اس کے رد عمل کی مسلسل تاریخ
بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ مریم جب انگلستان واپس آتی ہے اور محبت میں ناکام ہوتی ہے تو
اس کی زندگی نیا موڑ اختیار کرتی ہے اور اسی اعتبار سے ناول میں بھی نیا موڑ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے
مشاہدات اکثر تاثیر انگیز اور تامل خیز ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ذہنی ماندگی اور فرار کا بھی احساس
ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک زندگی محض محسوسات اور تاثرات میں سمٹ کر رکھی
ہے۔ اس شدید داخلیت کے علاوہ یہ ناول ایک دوسرا مسئلہ بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔
جب ناول نگار داخلی زندگی میں اس قدر محو ہے اور اپنے کردار کے لمحہ بہ لمحہ تاثرات کا تفصیلی جائزہ

لیفے میں منہمک ہے تو پھر ناول کے ترکیبی عناصر کا انتخاب کس اصول پر ہو؟ ذہنی اور نفسیاتی زندگی کے ایسے ناول میں خالص جمالیاتی نکات کی بحث بے سود ہے۔

نقادوں نے ڈاروتھی رچارڈسن کے فن میں فرانسیسی رمز نگاروں Symbolists اور پیکر نگاروں Imagists کے اثرات کا پتہ لگایا ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ فرائڈ کی نفسیاتی تحقیقات کے ساتھ جدید ادب میں فرانسیسی فنکاروں کا اثر خاصہ اہم ہے لیکن محض نفسیاتی زندگی کے جزئیات اور داخلی کیفیات پر عظیم فن کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی۔

جیمس جوائس ۱۸۸۲ء سے ۱۹۴۱ء

خالص اجتہاد کے اعتبار سے بیسویں صدی کی شاعری میں جو مقام ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو حاصل ہے، ناول کے میدان میں جیمس جوائس کم و بیش وہی مرتبہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص فن کا مجتہد ہے لیکن ایسا مجتہد جس کا اجتہاد اسی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتا ہے

"اہل ڈبلن" The Dubliners جوائس کی ابتدائی افسانہ نگاری کا نمونہ ہے جس میں سیدھے سادے طریقے پر عام فہم زبان میں کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اگرچہ ان افسانوں میں بھی واقعات و کیفیات خاص قسم کے تاثر اور ایک خاص اسلوب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن ان میں زندگی کے ان اندرونی و بیرونی پیچیدگیوں کا کوئی اظہار نہیں ہے جو اس کے بعد کے ناولوں کی ایک عام خصوصیت ہے۔

"فنکار کی شبیہ" A Portrait of The Artist As A Young man جو ۱۹۱۶ء میں چھپی، ایک حد تک مصنف کی ذاتی زندگی کا خاکہ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار مذہبی اسکول کی پابندیوں سے نالاں ہو کر ذہنی آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اسکا خالص جمالیاتی مزاج مذہبیت سے بیزار نظر آتا ہے۔ یہ سوانحی افسانہ اگرچہ فنی طور پر زیادہ مبہم نہیں لیکن اس سے جوائس کی آئندہ ادبی میلانات کا پتہ لگتا ہے۔

"یولیسس" Ulysses ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ ناول نہ صرف جوائس کا شاہکار ہے بلکہ ذیلئے افسانہ میں ایک عجوبہ بھی ہے جس کی مثال فرانس کے مشہور ناول نگار پروست Proust کی "ماضیات کی یاد" سے ہی دی جاسکتی ہے۔ یہ ناول نفسیاتی علائم اور علائق

کا بے انتہا پیچیدہ مجاز ہے جس میں یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ زندگی کی کون سی تہ اور اس کی کون سی علامتیں اور اس کے کون سے رشتے زیادہ اہم ہیں اور کون سے کم۔

نقادوں نے جوائس کو دورِ جدید کا مزاحیہ نگار کہا ہے جو اپنے شاہکار کو مزاحیہ رزمیہ Comic Epic کا روپ دینا چاہتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جوائس کا رزمیہ ہومر کے رزمیہ کے برخلاف جدید زندگی کی تلخیوں، ناکامیوں اور کثافتوں کا آئینہ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہاں ہمیں روایتی ناول کی طرح "پلاٹ" کی تلاش بے سود معلوم ہوتی ہے۔ یہ ضخیم ناول ۱۹۰۴ء میں چوبیس گھنٹے کے اندر ڈبلن کے یہودی سیلزمین "بلوم" Bloom کے فکری ہفت خوان پر مشتمل ہے۔ بلوم کے علاوہ دوسرے اہم کردار "میرین" Marian اور ڈیڈالس Dedaulus ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے نفسیاتی ناولوں کے مقابلہ میں "یولیسس" میں خارجی طور پر عمل کا میدان بالکل محدود ہے۔ بلوم اور ڈیڈالس شہر میں آوارہ پھرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مختلف راستوں سے شہر میں چکر کاٹتے ہیں لیکن ناول کے آخر میں وہ کسی قحبہ خانہ میں ملتے ہیں جہاں سے بلوم اپنے دوست ڈیڈالس کو گھر لاتا ہے۔ اُس دن صبح کو بلوم اپنے گھر سے قصائی کے یہاں گوشت لینے جاتا ہے، اخبار کے دفتر تک پہونچتا ہے نیشنل لائبریری میں بھی گھوم آتا ہے، تجہیز و تکفین میں شامل ہوتا ہے اور کسی لڑکی کے خیال میں کھویا ہوا زنانہ ہسپتال تک پہونچ جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹہ کے ہی اندر اس کی بیوی اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے۔ ڈیڈالس اسی عرصہ میں اپنے ساتھیوں سے لڑتا ہے، اسکول میں درس دیتا ہے نیشنل لائبریری میں ہیملیٹ کے متعلق نیا نظریہ قائم کرتا ہے، قحبہ خانہ جاتا ہے اور بلوم کے ساتھ گھر لوٹتا ہے۔ ناول میں واقعات و کیفیات کا یہ بے ہنگم اجتماع ان کرداروں کی زندگی سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ ہمیں ان میں جدید زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ کردار عمومی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جوائس فن کے بنیادی نظریہ یعنی "اصولِ انتخاب" سے روگردانی کرتا ہے اسی لئے ساری زندگی کو سمیٹنے کی کوشش میں ناگوار ابہام اور پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔

"یولیسس" جدید مغربی ادب پر نفسیات کے اثرات کی بہترین اور بدترین مثال ہے۔ جوائس سے پہلے بھی شیکسپیئر، رچارڈسن اور براؤننگ جیسے فنکاروں کے یہاں نفسیاتی نکات

ملتے ہیں لیکن ان کے یہاں نفسیات نہ تو عام انفرادی زندگی کے باقی حالات و اسباب سے الگ کوئی چیز ہے اور نہ ان پر حاوی ہے۔ "یولیسیس" میں جدید نفسیات کے علاوہ مصوری سے "تاثریت" اور فلسفہ کے اس دبستان سے بھی اثرات قبول کئے گئے ہیں جو جرمنی اور فرانس میں "حیاتیت" Vitalism کے نام سے موسوم ہے۔ جوائس کی تعلیم و تربیت جس مذہبی فضا میں ہوئی اس کا اثر اس کے حساس اور خلاق ذہن پر پڑے بغیر نہیں رہ سکا جب جدید دنیا کی روحانی خراشوں کے اندمال کی کوئی ممکن صورت اسے نہیں نظر آتی تو وہ ماضی سے بغاوت کرتے ہوئے بھی پس وپیش کرتا ہے۔ وہ ییٹس اور ایلیٹ کی طرح کسی نئے دیومالا کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے جس کے ذریعہ وہ جدید ذہن کی بخوبی ترجمانی کر سکے۔

جوائس کا آخری کارنامہ Finnegan's Wake (1939) ہے جس میں وہی لاشعور اور خواب و خیال کی دنیا کا تجسس پایا جاتا ہے۔ اس ناول میں نہ صرف خیالات و میں انتشار اور بدنظمی پائی جاتی ہے بلکہ زبان اور انداز بیان میں بھی شدید انفرادیت محسوس ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوائس زندگی سے عاجز آ کر ایسی زبان استعمال کرنے لگا ہے جسے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکے۔ اس مشکل پسندی کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے پڑھنے والوں کی تعداد بہت مختصر ہے اور اس کے سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی کم۔ شاید آئندہ بھی اس کا مطالعہ انگریزی ناول کی تاریخ کے ساتھ دبستانی دلچسپی رکھنے والوں تک محدود رہے گا۔

ورجینیا وولف

یورپ کی پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان انگریزی کے سربرآوردہ اور نمایندہ ناول نگاروں میں ورجینیا وولف بھی ممتاز مقام رکھتی ہے۔ حساس اور شاعر مزاج فنکار ہونے کے علاوہ وہ ایسی میراث کی مالک تھی جو اس کے جمالیاتی نقطہ نظر کی عین مظہر ہے۔ وہ کیمبرج کے مشہور نقاد اور مورخ لیزلی اسٹیفن Leslie Stephen کی بیٹی تھی۔ اس کے یہاں علمی اور ثقافتی مسائل پر اکثر آزادانہ گفتگو ہوا کرتی تھی اور عصری زندگی کی بے دردیوں اور کثافتوں پر بیباکانہ تنقیدیں بھی عام تھیں۔ ایسے ماحول میں تربیت پا کر ورجینیا نے اپنے مزاج اور زندگی کے خارجی اسباب و حالات کے درمیان سخت تصادم محسوس کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ فرار کے لئے خودی

کے بڑھتے ہوئے احساس کے خول میں سمٹتی گئی ۔

ورجینیا وولف کی تحریروں میں شعور اور تحت الشعور کے ساتھ دلچسپی ابتدا ہی سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی پہلی افسانوی تصنیف The Voyage Out جس میں ایک جوان لڑکی محبت کی منزلیں طے کرتے کرتے مٹ جاتی ہے ، اس کی نفسیاتی شغف کی دلیل ہے ۔ اسی طرح (1919) Night & Day جس میں جدید روشنی میں تعلیم و تربیت پائی ہوئی ایک عورت کئی عاشقوں سے واسطہ رکھنے اور ان کو رد کر دینے کے بعد ایک نیا عاشق چنتی ہے ورجینیا وولف کے نفسیاتی میلانات کی ترجمان ہے ۔ ورجینیا کو مروجہ حقیقت نگاری سے شدید مخالفت تھی ۔ وہ ویلس اور بینیٹ کے دبستان سے اپنے کو بہت اجنبی پاتی تھی ۔ اپنے ۱۹۲۰ء کے مقالہ میں اس نے زندگی اور فن پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ " زندگی سجی سجائی قندیلوں کا نام نہیں بلکہ مختلف تاثرات کا مجموعی خاکہ ہے ۔" اسی لئے اس کے نزدیک فنکار کو اپنے فن میں تاریخی تسلسل سے زیادہ انسانی اور نفسیاتی حقیقت کی پاسداری لازم ہے جس سے حقیقی زندگی کی تشکیل ہو سکے ۔ اس کا خیال ہے کہ خارجی واقعیت نگاری انسانی شعور کی تاریخ ہونے کے بجائے ماحول اور خارجی اثرات کا طومار ہو کر رہ جاتی ہے ۔ ورجینیا نے اپنے طریقہ پر (1925) Mrs. Dolloway اور (1977) To The Light House میں زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔

"مسز ڈالوے" Mrs. Dolloway میں روایتی ناولوں کے برخلاف پلاٹ بہت مختصر ہے ۔ ڈالوے پارٹی کے لئے صبح کو بازار میں پھول لینے کے لئے جاتی ہے اور شام تک پارٹی کے بعد ناول ختم ہو جاتا ہے لیکن اس عرصہ میں اپنے مخصوص "چشمۂ شعور" کی تکنک کے ذریعہ ورجینیا وولف اپنی ہیروئن کا پورا کردار اور اس کی پوری زندگی پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہے ۔ وہ حال سے ماضی کی طرف ذہنی طور پر سیر کرتی ہے اور سارے واقعات کو ایک تسلسل دینے میں خاص جدت کا ثبوت دیتی ہے ۔ ناول نگار اپنے کردار کے ذہنی واردات اور روزمرہ زندگی کے عام عناصر (مثلاً موٹر کار، ہوائی جہاز اور گھنٹہ گھر کی آواز) کے درمیان بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ہم آہنگی قائم رکھتی ہے ۔ اور دونوں کچھ لازم و ملزوم معلوم ہوتے ہیں ۔ اس مخصوص تکنک سے ماضی اور حال کے علاوہ کردار کے داخلی اور خارجی تاثرات کو بیک وقت پیش کیا جا سکتا ہے ۔

"روشنی کا مینارہ" To The Light House ورجینیا وولف کا شاہکار ناول ہے۔ اس میں مسز رامزے Mrs. Ramray اس کے شوہر اور بچوں کی روشنی کے مینارہ تک پہونچنے کی داستان جس فنی حسن کے ساتھ بیان کی گئی ہے وہ ورجینیا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہاں روشنی کا مینار خود ایک رمز یا علامت بن جاتا ہے ماضی اور حال کو موت اور پیدائش کے ذریعہ پیش کر کے مصنف نے ناول میں ایک نئے عنصر کا اضافہ کیا ہے۔

"لہر" The Waves میں ورجینیا وولف نے روایتی پلاٹ کو یک قلم ختم کر دیا۔ اس ناول میں اس کے کردار یک طرفہ مکالموں کے ذریعہ اپنی اپنی زندگی کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اپنے آخری ناول Between The Acts (1941) میں ورجینیا کی کوشش یہ تھی کہ زندگی کے تاریخی منظر کو رومانی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرے لیکن موت نے اس کام کو پورا نہ ہونے دیا۔

ورجینیا وولف نے "چشمۂ شعور" کے تکنک سے اس حد تک استفادہ نہیں کیا جس حد تک ڈارو تھی رچارڈسن اور جیمس جوائس نے کیا تھا۔ اس نے اس تکنک کا استعمال اپنے انفرادی طریقہ سے کیا جس سے ہمیں نفسیاتی اشارے تو مل جاتے ہیں لیکن شعور کے اس بہاؤ کا احساس نہیں ہوتا جو اس دبستان کے فنکاروں کے لئے اثاثی اور اصلی حقیقت ہے۔ اس انفرادیت کی بدولت ورجینیا کے کرداروں میں لطیف احساس اور ذاتی نکھار ملتا ہے۔ اس کے کردار نفسیاتی دبستان کے دوسرے فنکاروں کے رجال داستان کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔

ورجینیا وولف کا دائرۂ خیال بہت محدود ہے۔ وہ داخلی زندگی کی گوناگوں نزاکتوں اور رنگینیوں کو پیش کرنے میں کامیاب ہے لیکن خارجی زندگی سے بے تعلقی کی وجہ سے اس کے ناول ہم کو کچھ ناآسودہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈی۔ ایس سیوج D. S. Savage نے اس حقیقت کا پردہ بڑی بے دردی کے ساتھ فاش کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ورجینیا کے ناولوں میں فراریت کا میلان اس قدر حاوی ہے کہ اس کے یہاں زندگی کا کوئی صالح اور متوازن تصور نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے وہ بیسویں صدی کے دوسرے سربرآوردہ ناول نگاروں سے پیچھے رہ جاتی ہے۔

(۵) جدید رجحانات اور معاصرین :-

بیسویں صدی میں ناول نگاری میں جتنے تجربے کئے گئے وہ ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ جدید لکھنے والوں نے نہ صرف روایتی ناول اور اس کے فنی مسلّمات سے غفلت برتی ہے بلکہ عمداً شاعری، ڈرامہ اور دوسرے اصناف ادب کے نئے رجحانات سے اثر قبول کرکے ناول کو ماہیت اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے از سر نو پیدا کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ناول میں شاعرانہ، ڈرامائی اور بیانیہ اظہار کی کافی گنجائش ہے اور اس میں معاشیات، سیاسیات اور سماجیات سے لے کر نفسیات، فلسفہ، جغرافیہ اور تاریخ کو پوری طرح سمویا جاسکتا ہے۔ نئے ناول نگاروں کا طرۂ امتیاز موضوعات کی یہی وسعت ہے لیکن جس لحاظ سے آج کا ناول ہم کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ اس کا مخصوص اسلوب اور اس کی نئی ہیئت ہے جس کا پچھلی صدی میں کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

فن ناول میں جدید رجحانات کی نمائندگی فارسٹر، آلڈس ہکسلے، سومرسٹ ماہم، جوائس کیری، گراہم گرین اور جارج آرویل وغیرہ کرتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کا انداز اور اسلوب بیان مختلف ہے لیکن سب کے یہاں ماحول کی پراگندگی اور فرد کی ذہنی آویزشوں کا احساس یکساں طور پر ملتا ہے۔

ای۔ ایم۔ فارسٹر

فارسٹر بیسویں صدی کے زندہ ناول نگاروں میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اگرچہ اس نے پچھلے چالیس سالوں کے اندر کوئی ناول نہیں پیش کیا لیکن اس کا دائرۂ اثر وسیع رہا ہے۔ اس نے اپنے ابتدائی ناول ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھے اور اس کا آخری ناول "ہندوستان کا سفر" A Passage To India ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

تاریخی اعتبار سے فارسٹر ورجینیا وولف اور لارنس کا پیشرو ہے لیکن تکنیکی نقطۂ نگاہ سے وہ روایتی ناول سے زیادہ قریب ہے۔ وہ فیلڈنگ اور میرڈیتھ کی طرح خیال اور نقطۂ نظر کی اہمیت کے باوجود کہانی کو کہانی رکھے رہنا فن ناول نگاری کی سب سے اہم شرط سمجھتا ہے۔ اس کے ناولوں سے اس کے سیاسی خیالات کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ وہ روایتی رواداری کا قائل جمہوری نظام

کا حامی اور سامراج کا مخالف ہے۔ اس کے ناولوں میں "شر" (جو بے رحم، مردہ اور تلخ ہے) کا تضاد "خیر" (جو زندگی کی تمام برکتوں کا مجموعہ ہے) سے دکھایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا موت اور زندگی کا نظریہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ فارسٹر کا خیال ہے کہ "موت انسان کو تباہ کر دیتی ہے لیکن موت کا احساس اسے بچا لیتا ہے" اس کی تصانیف میں یہ خیالات پیچیدہ ہو جاتے ہیں اور وہ ان کو رمز و کنایہ کے پردہ میں بیان کرنے کے لئے اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

بنیادی طور پر فارسٹر المیہ نگار انسان دوست ہے کیونکہ اس کے یہاں مظاہر کے پس پردہ منفی اقدار اور حقائق کا احساس ہوتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کا جواز خود آگاہی، تخیل اور فن بالخصوص موسیقی میں ڈھونڈھتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کلاسیکی اعتدال اور امتزاج کا قائل ہے۔ اعتدال کی یہ کمی اسے اپنے معاصرین میں بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کے چاروں ابتدائی ناولوں

Where Angels Fear To Tread (1905) The Longest Journey (1907) A Room With A View (1908)

اور Howard End (1910) کا محرک مختلف تہذیبوں کا ٹکراؤ اور انسانی زندگی کا عدم توازن ہے۔ ان تمام ناولوں میں کہانی کا ہیرو اپنے ماحول کی گراں کن فضا سے نکل کر کسی اور دنیا میں سانس لینا چاہتا ہے لیکن اس کے شر پسند کردار عام طور پر وہ بے حس افراد ہیں جنھیں نہ فضا کی زہر آلودگیوں کا احساس ہے اور نہ جن میں تعلقات و مراسم کے ذریعہ انسانی تہذیب کو سنوارنے کا کوئی جذبہ ہے۔ انگلستان میں تعلیمی اور مذہبی زندگی کی بے جا پابندیوں کے خلاف فارسٹر کو کلاسیکی یونانی اور اطالیہ کی سرزمین زیادہ خوش آیند معلوم ہوتی ہے جہاں انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے بہترین مواقع ملتے ہیں۔

فارسٹر کا شاہکار ناول "ہندوستان کا سفر" ہے جس میں وہ مختلف تہذیبوں کا تضاد اور تصادم بڑی کامیابی سے دکھاتا ہے۔ ہندوستانی زندگی کے متنوع پہلوؤں یعنی مذہب، نسل، رنگ، عقاید اور توہمات کے پس منظر میں وہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مفاہمت اور باہمی تعلقات کے امکانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ مسز مور Mrs. More، عادلہ Adela اور فیلڈنگ اور ڈاکٹر عزیز کے درمیان ایک دوسرے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مفاہمت ممکن نہیں۔ مالابار

کے غاروں کے واقعات سے اس ناکامی کا احساس شدید طور پر ہوتا ہے۔ ہندوستان فارسٹر کے نزدیک عجائب روزگار میں سے نہیں ہے بلکہ محض خلط ملط اور بے ربطیوں کا ایک نمونہ ہے۔ ناول کی اوپری سطح پر ہمیں دو مختلف قوموں کے درمیان زبردست ذہنی اور تہذیبی اختلاف کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز اور فیلڈنگ جب مقدمہ بازی کے بعد کسی دیسی ریاست میں دوبارہ ملتے ہیں تو فیلڈنگ دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن گھوڑوں کو یہ بات پسند نہیں آتی ہے اور وہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری سطح پر ناول میں مفاہمت کی کوشش مسز مور کے کردار سے ہوتی ہے جو ہندوستان کی دلدادہ ہے اور جو وطن واپس ہوتے ہوئے اپنے مرجانے پر بھی ہندوستانیوں کے دل میں اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ شاید فارسٹر کے ذہن میں مسز اینی بیسنٹ Mrs. Annie Besant کا کردار تھا جو اپنی گوناگوں خدمات کی بدولت اب بھی ہندوستان کی تاریخ آزادی میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

آلڈوس ہکسلے

اگر فکری میلان اور زمانہ کے مزاج کے تجزیاتی مطالعہ کو معیار بنایا جائے تو ہکسلے، لارنس اور جوائس جیسے فنکاروں سے بھی کچھ بلند نظر آتا ہے۔ اپنی نسل اور اپنے زمانہ کے مسائل اور اپنے ہمعصروں کی امیدوں اور مایوسیوں کا جیسا خاکہ وہ پیش کرتا ہے وہ اس کے دوسرے معاصرین کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں سائنس کو ادب میں داخل کرنے کی خدمت ویلس کے ساتھ ہکسلے نے بھی انجام دی ہے۔ ہکسلے کے دادا مشہور سائنسداں ڈاروِن کے رفیقوں میں سے تھے اور ماں کی طرف سے بھی اس کو میتھو آرنلڈ جیسے اعلیٰ ذہن کا ترکہ ملا تھا۔ پھر ایٹن Eton اور آکسفورڈ کی تعلیم نے اس کی صلاحیتوں کو اور جلا دی۔ اپنے ناولوں میں ہکسلے اپنی تعلیم اور اپنی ذہنی میراث سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے مگر اس کا یہ عالمانہ ذہن اس کے فن میں اکثر بے جا مداخلت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہکسلے کی ابتدائی کوششوں میں Crome Yellow اور Antic Hay زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اس کا پہلا ناول ایک طنزیہ خاکہ ہے لیکن دوسرے ناول میں اس کا اصلی فن نمایاں ہوتا ہے۔ اس ناول میں ہکسلے نے جنگ کے بعد انگریزی

معاشرت اور اخلاقی کھوکھلاپن پر جو طنز کیا ہے وہ جدید زندگی اور اس کے انتشار کا آئینہ دار ہے
Point Counter Point (1928) ہکسلے کا شاہکار ہے جس میں اس نے رُو بہ
زوال معاشرہ کی بڑی پُر تاثیر عکاسی کی ہے۔ اسی ناول میں اس نے افسانہ کی موسیقیت سے زیادہ
دوسرے بنیادی عناصر پر توجہ کی تلقین کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ناول نگار کو اپنی قوت تخیل سے
اپنے مطمح نظر کو جذباتی، سائنسی، معاشی، مذہبی اور نفسیاتی معیار پر پرکھنا چاہیئے۔ اگرچہ ہکسلے کے
یہاں جدید تہذیب کی بے ربطیوں کا احساس ابتدائی دور سے ہی ملتا ہے لیکن اس کی تکمیل Point
Counter Point میں ہی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کو ہکسلے کا ''خرابہ'' کہنا
زیادہ مناسب ہوگا لیکن وہ ایلیٹ کی طرح مذہبی اور اساطیری رموز و علائم کا استعمال نہیں کرتا۔ یہاں
وہ اس بات پر ماتم کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی پر حیاتیاتی ضابطوں کا جبر حاوی ہے۔ اسی لئے اسکے
نزدیک تمام تر شعوری زندگی بے مقصد اور عارضی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کلبیت اپنی انتہا کو اس
مقام پر پہونچتی ہے جب وہ رحم مادر میں ایک ننھی سی جان کے لئے پیشین گوئی کرتا ہے کہ یہ نئے خدا
بنلائے گا اور ان کی پرستش کرے گا۔ اس ناول کی تلخیوں کے ساتھ فن، موسیقی اور شعر کی کیفیات
بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں۔ جدید مغربی معاشرت میں جنسی زندگی کے خلاف ہکسلے کا ردعمل مشہور
طنز نگار سوفٹ سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

Brave New World (1932) میں ہکسلے نے وہ تاریک
مستقبل بھی دکھایا ہے جب رصد گاہوں کے تربیت یافتہ نوجوان میکانکی طور پر مالکوں کے احکام
کی تعمیل کریں گے اور جب زندگی میں ولولہ اور نمو کی قوت سلب ہو جائے گی۔ Eyeless In
Gaza میں مستقبل کا یہی ڈراؤنا بھوت ہے جو ساری انسانیت کو زندگی کی برکتوں سے
محروم کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔

ناولوں کے علاوہ ہکسلے کی ادبی زندگی میں Ends & Means ایک
خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں مصنف نے افسانوی لوازمات سے بے نیاز ہو کر اپنے خیالات کا
اظہار کیا ہے۔ اپنے دور کے تمام اعلیٰ ذہنوں کی طرح اسے بھی صدی کی تیسری دہائی کے بحران اور
پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان تہذیبی اور تمدنی اقدار کی ہیجانی کیفیت کا احساس تھا۔

اسی لئے وہ اس کتاب میں مسائل سے زیادہ ان کے حل تلاش کرنے میں سرگرداں نظر آتا ہے۔ ہکسلے کے نزدیک معاشرہ کی اصلاح "افراد" کے اصلاح سے ہی ممکن ہے اور وہ مجموعی قوت بن کر سارے سماج کو نجات دلا سکتے ہیں لیکن ہکسلے اقبال کی طرح اپنے فلسفۂ خودی کو عملی رنگ نہیں دے سکا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مجہولی فلسفہ اور بے تعلقی کی سمت بہک کر رہ گیا ہے۔

سومرسٹ ماہم

ماہم کی ادبی زندگی پیشہ ور ادیب کی بہترین مثال ہے۔ وہ جدید انگریزی ادب میں بحیثیت افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور ناول نگار کے کامیاب رہا ہے۔ اگرچہ اس کا دائرۂ خیال محدود ہے اور اس کے خیالات اور نقطۂ نظر میں تکرار ملتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے ناولوں میں ایک قسم کی تازگی محسوس کی جا سکتی ہے۔

Lisa Of Lambeth (1897) ماہم کی ابتدائی کوشش ہے لیکن یہ حقیقت نگاری کا مکمل نمونہ ہے۔ اس ناول میں موپاساں کے زیر اثر اس نے مشرقی لندن کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اگرچہ یہ ناول ہنگامی اور عارضی قسم کا کارنامہ ہے لیکن "لیزا" کا کردار اب بھی پڑھنے والوں کے لئے اپنی جاذبیت رکھتا ہے۔

Of Human Bondage (1915) ایک طرح سے ماہم کا افسانوی شاہکار ہے جس میں اس نے خود تماشائی ہو کر اپنے بچپن اور جوانی کا قصہ بیان کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار فلپ کیری Philip Carey بہت حد تک خود مصنف کا ذاتی تجربہ ہے۔ اس ناول کا مقابلہ موضوع اور فن کے اعتبار سے امریکی ناول نگار ڈریزر Lrieser کے "امریکی المیہ" سے کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ماہم نے جدید زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کا اس شدت سے ذکر کیا ہے کہ ہمیں زندگی کی بے وقعتی کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن چونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ایک مخصوص ذہنیت کی پیداوار ہے اس لئے ناول سے ہماری دلچسپی قائم رہتی ہے۔

سومرسٹ ماہم کا تیسرا کامیاب ناول Cakes & Ale ہے جس میں اس نے بیسویں صدی کی ادبی تاریخ میں ایک نیا اشاریہ قائم کیا ہے۔ اس ناول میں بوڑھا ناول نگار، اس کی بیوی "روزی" Rosie اور میدان ناول کا احمق سپاہی "کیر" Kear بہت دلچسپ

کردار ہیں۔ حال میں The Razor's Edge (1944) اور
Cataline لکھ کر ماہم نے اپنی ادبی حیثیت میں مزید امتیاز حاصل کیا ہے۔ ان تصانیف
کو جدید سیاق وسباق میں ان کے تصوفانہ خیالات کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہے۔

دوسرے ناول نگار :-

فارسٹر، ہکسلے اور ماہم جیسے مستند ناول نگاروں کے علاوہ جدید انگریزی ناول میں چند
ایسے نام بھی آتے ہیں جو معاصرین سے اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ ان میں بٹیس، جوائس کیری،
گراہم گرین اور جارج آرویل بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ H. E. Bates نے جنگ
سے متعلق اپنی دو کتابوں Fair Stood The Wind To France
(1944) اور The Cruise Of Bread Winner (1946)
کے ذریعہ خاصی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ ان ناولوں سے وسط صدی میں مغربی زندگی اور معاشرت
کا اچھا خاکہ ملتا ہے۔ Elizabeth Bowen جدید ناول نگاروں میں اپنی
نفاست خیالی اور فنی شعور کے لئے مقبول ہے۔ اس کے ناولوں میں The Last September
The House In Paris ، The Demon Lover
اور The Heat Of The Day
مشہور اکتسابات ہیں۔ جوائس کیری Joyce Carey کے یہاں تنوع اور توانائی کا بہترین
امتزاج ملتا ہے۔ وہ عرصہ تک افریقہ میں برسر ملازمت رہا اس لئے اس نے ابتدائی ناولوں
Aissa Saved اور The African Witch میں بڑا عظیم
افریقہ کی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ کیری کی دوسری تصانیف میں A House Of
Children بہت دلچسپ افسانہ ہے۔ گراہم گرین Graham Green
معاصرین میں خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے The Power & Glory
اور The Heart Of The Matter اس کے شاہکار ناول ہیں۔
جارج آرویل George Orwell کے Animal Farm اور
Nineteen Eighty Four اہم افسانوی اکتساب ہیں۔ موخرالذکر ناول میں مصنف

نے انگلستان میں اشتراکی نظام کے روح فرسا امکانات سے بحث کی ہے ۔ ۱۹۵۰ء میں آرویل کی موت سے انگریزی ناول کو زبردست نقصان پہونچا ہے ۔

انشائیہ اور متفرق نثر

بیسویں صدی سے دوسرے اصناف ادب کی طرح انگریزی نثر میں بھی نئی سمتوں اور نئے میلانات کا پتہ چلتا ہے ۔ صدی کے ابتدا سے حال تک نثر میں مختلف تجربے کئے گئے ہیں چنانچہ تنقید، تاریخ، سیرت و خود نوشت کے علاوہ فن انشائیہ نگاری میں بھی ایسے نمونے ملتے ہیں جو انگریزی نثر میں نئے اضافے ہیں ۔ جمہوریت کے فروغ اور نئی نسل کے تقاضوں نے ادب میں عام طور پر اور نثر میں بالخصوص سادگی کی طرف جو میلان عام کر دیا ہے وہ کسی اور دور میں اس حد تک ممکن نہیں تھا ۔ جدید انگریزی نثر میں ہمیں بیکن کی بلیغ اور لیمب کی مترنم نثر کم ملتی ہے ۔ آج انگریزی نثر بول چال کی زبان سے جس قدر قریب ہے وہ پہلے نہیں تھی ۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں براؤن ملٹن اور جانسن جیسے ادیب عام بول چال کی زبان سے ماورالغات استعمال کرتے اور بے کیف عبارت صحافیوں کے حصہ میں رہتی لیکن آج صحافی رنگین اور بامحاورہ زبان سے زیادہ مانوس ہیں اور ادیب اور انشاپرداز سادہ مگر دلنشین عبارت لکھتے ہیں ۔ یہ امر بھی کچھ کم دلچسپ نہیں کہ بیشتر انگریز انشاپرداز صحافت کے راستے سے ادب میں داخل ہوئے اور اسی بنا پر ان کی ادبیت میں بھی صحافت کو بیشتر دخل رہا ۔

(۱) انشائیہ :

جدید نثر میں سب سے مقبول صنف انشائیہ ہے جسے ہم ادب لطیف Belle Lettres سے منسوب کر سکتے ہیں ۔ انشاپرداز کا مقصد علمی و ادبی یا سیاسی و سماجی اصلاح نہیں بلکہ محض انبساطی ہوتا ہے ۔ یعنی یہ کہ وہ خود اپنے اندر لکھتے وقت کشادگی اور فراخدلی پاتا ہے ۔ اور یہی کیفیت وہ اپنے پڑھنے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ مقالہ نگار کی سنجیدگی کے بغیر بھی ایک کامیاب انشاپرداز محض اپنی انفرادیت کے بل بوتے پر اپنے فن میں امتیاز حاصل کر سکتا ہے ۔

انشائیہ کی سب سے مابہ الامتیاز خصوصیت اس کی جامعیت اور اس کا اختصار ہے ۔ غزل کا ایک شعر اپنی حد تک شعری انشائیہ کی بہترین مثال ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کو ادیبوں نے بے حد لچکدار صنف تصور کیا ہے جس میں ہر قسم کے موضوعات برتے جا سکتے ہیں اور جس میں مصنف کی شخصیت

تمام دکمال طور پر جھلکتی ہے۔ انشائیہ ایک قسم کی خود کلامی ہے جو کسی عرفان و وجدان کا نتیجہ نہیں بلکہ
رچی ہوئی ادبی شخصیت کا نتیجہ ہے۔ شعرا اکثر ماورائی کیفیات سے متاثر ہو کر اپنا ساز چھیڑتے ہیں لیکن
انشاپرداز کے لئے اس کی اصلیت ہی کافی ہے۔ درحقیقت شاعروں اور انشاپردازوں کے درمیان
نفسیاتی یکسانیت کے باوجود وسیلۂ اظہار کا فرق انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ شاعر اپنی تمام
انفرادیت کے باوجود روایت سے اکثر بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے ذہن کو ایک خاص سانچے میں
ڈھالنا پڑتا ہے لیکن انشاپرداز ان قیود سے ایک حد تک آزاد ہے۔ اگر اسے زبان و بیان پر قدرت
حاصل ہے تو محض اس کی انفرادیت ہی اس کے بقائے دوام کی ضامن ہو سکتی ہے۔

جدید انگریزی انشاپردازوں میں میکس بیرنوم، لوئس چسٹرٹن، ہیلری بیلک، پرسٹلے،
گارڈنر اور رابرٹ لینڈ وغیرہ کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

میکس بیرنوم

بیرنوم نے انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہی نثر نگاری شروع کردی تھی اور اس کا پہلا
مجموعہ ۱۸۹۶ء میں شائع بھی ہو چکا تھا لیکن اس کے مختلف مزاحیہ کارنامے بیسویں صدی میں
ہی منظر عام پر آئے۔ ۱۹۱۱ء میں "زلیخا ڈابسن" لکھ کر اس نے بڑی شہرت حاصل کر لی۔ یہ تصنیف
ایک ساحرہ زلیخا کی داستانِ محبت ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے بیشتر اساتذہ و طلبا اور ارباب کار کی
خودکشی کا باعث ہوتی ہے اور پھر اس دنیا کو اجاڑ کر کیمبرج یونیورسٹی کا رخ کرتی ہے۔

بیرنوم کا سب سے دلچسپ اور زندہ یادگار Christmas Garland ہے۔
جس میں اس نے "پیروڈی" کے فن کو معراج تک پہونچا دیا ہے۔ اس کے یہاں یہ فن محض نقالی نہیں
"متوازن مبالغہ آرائی" کے ذریعہ تنقید کا بہترین ذریعہ ہے۔ وہ مصنفوں پر محض رائیں نہیں دیتا بلکہ
انھیں نئے زاویہ سے پیش بھی کرتا ہے۔ اس کتاب میں سترہ ابواب کے تحت بیرنوم نے اپنے معاصرین مثلاً
جنسن A. C. Benson، ویلس، کانریڈ، بینیٹ اور شا وغیرہ کی اسلوب نگارش کا چربہ
اتارا ہے۔

۱۹۲۰ء میں بیرنوم کے مضامین کا دوسرا مجموعہ And Even Now
شائع ہوا جس میں شوخی اور ظرافت اور اسلوب کی پختگی کے ساتھ نازک احساسات بھی ملتے ہیں دقت

گزرنے پر اس کے یہاں ابتدائی دور کی تصنع کی جگہ مواد میں گہرائی اور نظریات میں توازن آنے لگا۔ بیرکوم بیسویں صدی کے انشاپردازوں میں اپنی جدت کی بدولت زیادہ ممتاز ہے اس لئے کہ جب اس کے دوسرے معاصرین انیسویں صدی کے انشاپردازوں کی راہ پر چل رہے تھے اس وقت اس نے فن انشائیہ میں نئی راہ نکالی۔

ای۔وی۔لوکس

چارلس لیمب کی جانشینی کا حق اگر کسی کو پہونچتا ہے تو وہ لوکس ہے۔ اگرچہ پریس کی پابندیوں اور اخباری کالم نگاری کی وجہ سے اس کے مضامین میں لیمب کی دلنشینی نہیں ملتی لیکن ایک خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے اس کے مضامین بے حد دلچسپ ہوتے ہیں۔ اسلوب کی دلکشی کے علاوہ لوکس کے یہاں ہمدردی اور رواداری کا جذبہ بھی ملتا ہے اور یہی اس کی مقبولیت کا راز ہے۔

لوکس نے زود نویسی اور بسیاری نویسی دونوں میں اپنا ریکارڈ قائم کیا ہے اسی لئے اسے اپنے انتخابات The Open Road (1899) کے علاوہ Variety Love (1910) اور Harvest Home میں پیش کرنا پڑا۔ لندن یونیورسٹی کی تعلیم کے بعد لوکس مختلف اخباروں میں کام کرتا رہا اور بالآخر لندن کے مشہور جریدہ "پنچ" کا معاون اڈیٹر ہو گیا۔ اس نے چارلس لیمب کے خطوط اور مضامین کا مجموعہ شائع کیا اور اس کی سوانح عمری بھی لکھی۔ اس کی دوسری تصنیفوں میں انشائیہ، مصوری اور ناول نگاری سے متعلق مضامین ہیں۔

لوکس نے لیمب کے متعلق کہا تھا کہ وہ انفرادیت اور خلوص کے باعث زندہ ہے اور زندہ رہیگا۔ یہی بات اس پر بھی صادق آتی ہے مگر ان دونوں انشاپردازوں میں بنیادی فرق بھی ہے جہاں لیمب کے یہاں تخیل کا سحر اور ماضی کو حال میں ڈھالنے کا ملکہ ملتا ہے وہاں لوکس نفاست خیال، ادبی شعبدہ بازی اور مزاح کی بنا پر ممتاز ہے۔ اس کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان سے ہماری دلچسپی کے لئے مختلف گوشے روشن ہوتے ہیں اور ہم جدھر نگاہ اٹھاتے ہیں ہمیں ایک نئی کائنات نظر آتی ہے۔

چسٹرٹن

جدید انگریزی نثر میں چسٹرٹن اپنے خاص مقام پر ہے۔ وہ اکبر الہ آبادی کی طرح قدامت

اور رجعت پسندی کا علمبردار ہے۔ اگرچہ انداز فکر اور طریقۂ اظہار دونوں میں اس نے آسکر وائلڈ کے بعد آنے والی نسل سے بہت کچھ سیکھا لیکن اپنی بات کو چونکا دینے والے انداز میں کہنا اس نے نئے لکھنے والوں ہی سے حاصل کیا۔

بحیثیت انشاپرداز کے چسٹرٹن کا فن "اجتماع ضدین" Paradox ہے قدیم اقدار اور روایات کی پاسداری اس کا مزاج ہے اسی لئے وہ تجدید و اصلاح سے "گمراہ" ہونے کی بجائے روایت اور ترکہ اسلاف کے احترام کی ترغیب کرتا ہے۔ وہ چاہے آکسفورڈ یونیورسٹی پر لکھے یا جدید شاعری پر اظہار خیال کرے اس کا مخصوص لب ولہجہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ذیل میں ایک اقتباس اس کے مشہور مضمون "فرانسیسی اور انگریز" French & English سے ماخوذ ہے جس سے اس کی شخصیت اور فن کا کچھ اندازہ ہوسکے گا:۔

"یہ تو صاف ظاہر ہے کہ بین الاقوامی International اور آفاقی Cosmopolitan کے درمیان بڑا فرق ہے۔ سارے بھلے آدمی بین الاقوامی ہوتے ہیں اور تقریباً تمام برے لوگ آفاقی۔ اگر ہمیں "بین الاقوامی" ہونا ہے تو پہلے قومی National ہونا پڑیگا۔ ...... بین الاقوامی صلح کا مقصد قوموں کے درمیان صلح ہے نہ کہ قوموں کی بربادی کے بعد کی صلح جیسے بدھ مذہب والوں کی صلح جو شخصیت کے خاتمہ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اچھے یورپین کا عہد زریں عیسائی تصور بہشت سے مشابہ ہوگا جہاں لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں گے نہ کہ ہندو دو تصوف کے بہشت کی طرح جہاں وہ اسی طرح رہیں گے۔ قومی کردار کے معاملہ میں یہ مشاہدہ کم دلچسپ نہیں میرا خیال ہے کہ ایک شخص دوسری قوم کا دل سے جس قدر مداح ہوگا اسی قدر اس کی تقلید سے احتراز کریگا اس کو ہمیشہ اس کا احساس ہوگا کہ ان کے یہاں کچھ ناقابل تقلید عناصر ہیں۔ وہ انگریز جسے فرانس سے دلچسپی ہوگی، فرانسیسی ہونے کی کوشش کرے گا لیکن جو اس کا مداح ہے وہ کٹر انگریز رہے گا۔ اس کا اندازہ فرانسیسیوں سے ہمارے تعلقات کے مطالعہ سے بآسانی ہوسکتا ہے کیونکہ فرانسیسیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی برائیاں سطح پر ہوتی ہیں مگر ان کی اچھائیاں چھپی رہتی ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی برائیاں ان کی اچھائیوں کا پھل ہیں۔"

ہیلری بیلک

بیلکس کے مضامین میں ایک خاص قسم کی تازگی اور شگفتگی ملتی ہے جو ان مضامین کا جوہر ہے۔ وہ "حسن ارضی" کا قائل ہے اور اسی دنیا کی رنگا رنگیوں سے اپنے فن کے لئے مواد فراہم کرتا ہے۔ اس کے ہمعصر پر یسٹلے کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ اس نے زندگانی کے مشاہدات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے کبھی کبھی چارلس لیمب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

گارڈنر

صحافی انشا پردازوں میں گارڈنر کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے۔ اس کے ابتدائی مضامین بالخصوص Prophets, Priests & Kings میں "نئی دنیا" کی ترقیوں کا ایک دردمند احساس ملتا ہے لیکن یورپ کی پہلی جنگ عظیم اور اس کی تباہ کاریوں نے اس کے خیال میں بڑا انقلاب پیدا کیا۔ صحافت کے دوران میں گارڈنر نے Alpha Of The Plough کے نام سے ادبی مضامین لکھنا شروع کر دئے تھے جن میں اس نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ مضامین مختلف موقعوں پر اس کی ذہنی زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین میں شخصی رنگ نمایاں ہے۔

گارڈنر کے مجموعہ مضامین میں Pebbles On The Shore اور Leaves In The Wird سے اس کی شخصیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے اس کے مضامین اور موضوعات میں بڑا تنوع ہوتا ہے۔ وہ "افواہ" اور "بس کا سفر" سے لے کر "چھاتے کا اخلاق" Umbrella Metals "لمبے چھوٹے پیر" اور "ہیٹ کا فلسفہ" تک کو اپنے مضامین کا موضوع بناتا ہے۔ ان مختصر انشائیوں میں اکثر حیات و کائنات سے متعلق بلیغ اشارے بھی ملتے ہیں جو بیحد دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

رابرٹ لینڈ

رابرٹ لینڈ بھی معاصرین میں اپنی گوناگوں ادبی دلچسپیوں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا ہے مختلف عنوانات پر نثری ٹکڑے لکھنے میں اسے بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اس کے انشائیوں میں حسن ادا کے ساتھ ناقدانہ بصیرت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

گارڈنر کی طرح رابرٹ لینڈ بھی صحافت کے راستے سے ادب میں داخل ہوا اور

New Statesman کے قلمی معاون کی حیثیت سے اس نے جلد ہی اپنی جگہ بنالی۔ وہ Y. Y. کے فرضی نام سے ہفتہ وار عالمی حالات کا جائزہ لیتا رہا جس کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ ان مضامین میں بیک وقت سادگی، گہرائی، سنجیدگی اور مزاح کی خصوصیات بڑی خوبصورتی کے ساتھ ملی جلی ملتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ لینڈ نے جدید انشائیہ کو ایک فن لطیف بنا دیا ہے اس لئے کہ وہ معمولی واقعات اور تاثرات کو شاعرانہ رنگ میں پیش کرنے کے قابل رشک صلاحیتیں رکھتا ہے پریسٹلے نے ایک دفعہ اس کے متعلق کہا تھا کہ "ہم اسکی صحبت سے خوش ہو کر اُٹھتے ہیں۔"

(۲) سیرت نگاری اور خود نوشت :-

بیسویں صدی میں جہاں ادب کے مختلف اصناف میں تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں سیرت نگاری بھی نئے محرکات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ عہد وکٹوریہ کے ادیب اپنے محبوب شخصیتوں کی پرستش عقیدتمندانہ طور پر کرتے رہے ہیں اور ان شخصیتوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے چشم پوشی کرنا ان کے نزدیک ہنر میں داخل تھا۔ نئی صدی کے ساتھ انحرافی میلان سیرت نگاری میں زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوا۔ صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اجتماعی طور پر ساری تہذیب و تمدن اور معاشرتی زندگی پر طنزیہ حملے کئے گئے وہاں شخصیتوں کا محفوظ رہنا بھی ناممکن تھا۔ برنارڈ شا کے ڈراموں کے ساتھ حقائق کی جو پردہ دری بے کم و کاست حقیقت حال کو منظر عام پر لانے کی کوشش عام ہوئی اس سے فن سیرت نگاری میں نئے سنگِ میل قائم ہوئے۔

لٹن اسٹریچی

لٹن اسٹریچی کی سیرت نگاری میں جدید میلانات کو بڑا دخل ہے۔ اس کی پہلی کتاب "عہد وکٹوریہ کے اکابر" Eminent Victorians میں ممتاز شخصیتوں کی بے لاگ عکاسی کی گئی ہے اور ان کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں اجاگر کی گئی ہیں۔ اس نے قدیم روایات کو ترک کر کے سیرت نگاری کو محض برٹش میوزیم سے حاصل شدہ اطلاعات و معلومات کا انبار نہیں بنایا بلکہ اشخاص کی زندگی میں اہم واقعات اور زمانہ کی نئی تبدیلیوں کی روشنی میں ان کے مرقعے تیار کئے ہیں۔ یہاں اس نے "گارڈن" Gordon کو بیک وقت شراب کا رسیا اور بائیبل کا دلدادہ بتایا ہے۔ ڈزرائیلے Disraeli اور ملکہ وکٹوریہ کے اصل

تعلقات پر روشنی ڈالی ہے اور گلیڈ سٹون Gladstone کو "بے ہنگم خیالات" کا مجسمہ قرار دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جدت کی دُھن میں اسٹریچی اکثر افراط و تفریط کا شکار ہو گیا ہے لیکن اس کا یہ کارنامہ اب تک شوق سے پڑھا جاتا ہے۔

"ملکہ وکٹوریہ" سنہ ۱۹۲۱ء میں حقیقت کو بے نقاب کرنے کا وہی جذبہ کارفرما ہے۔ سٹریچی نے جہاں ملکہ وکٹوریہ کی جاہ و ثروت اور درباری شان و شوکت کو بیان کیا ہے وہاں اُس کی شخصیت کے بیٹی پن اور پوشاک کی بے سلیقگی کا بھی ذکر ہے۔ البتہ کتاب کے آخری حصہ میں شاہزادے (وکٹوریہ کے شوہر) کی موت اور ملکہ کی شخصیت کے بیان میں اسٹریچی کا لہجہ نرم اور ہمدردانہ ہو جاتا ہے۔

"فلپ گڈیلا" Philp Guedella اسٹریچی کے مدرسہ کا تربیت یافتہ ہے۔ اس کی تصانیف (1926) Palmerston اور (1931) The Duke (1926) میں وہ نئے میلانات ملتے ہیں جن کا کارلائل اور میکالے کے یہاں فقدان ہے۔ ان کے علاوہ لارڈ ڈیوڈ سیسل David Cecil کی The Stricken Deer (1929) اور ڈف کوپر Duff Cooper کی Talleyrand (1932) مشہور تصانیف ہیں۔

سیرت نگاری کے ساتھ "خود نوشت" لکھنے کی روایت بھی خاصی اہم رہی ہے۔ "ایڈمنڈ گاس" Edmund Gosse نے Father & Son میں اپنے ترش رُو باپ کے زیر سایہ اپنی تعلیم و تربیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے بچپن کے ماحول کی گھٹن سے نالاں تھا۔ ماں کی موت کے بعد تو اسیر باپ کے رویّہ سے عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔

مشہور عالم نفسیات فرائڈ (سنہ ۱۸۵۶ء۔ ۱۹۳۹ء) کی تحقیقات اور شعور و تحت الشعور کے نظریات کا بھی خود نوشتوں پر خاصہ اثر پڑا یہاں تک کہ خارجی زندگی کے علاوہ داخلی اور مکانی زندگی پر قیاس آرائیاں بھی خود نوشت کا اہم جزو بن گئیں۔ آسکر وائلڈ کی مشہور تصنیف De Profundis اور جارج گزنگ George Gissing کی The Private Papers of Henry Ryecroft اور ٹی۔ ای۔ لارنس کی

اس سلسلہ کی اہم کڑیاں ہیں Sever Pillars of Wisdom (1928) ڈی۔ایچ۔لارنس کے خطوط کے مجموعہ (مطبوعہ ۱۹۳۲ء) سے اس کی زندگی اس کے خیالات و افکار کی بہترین ترجمانی ہوتی ہے۔ اسی طرح مشہور اداکارہ "ایلین ٹیری" Ellen Terry اور برنارڈشا کی خط و کتابت (مطبوعہ ۱۹۳۱ء) بھی اپنی نوعیت کی دلچسپ تصنیف ہے

خود نوشتوں کے سلسلہ میں ایچ۔جی۔ویلیس کی سرگزشت Experiments In Autobiography (1934) اور رڈیارڈ کپلنگ کی Something of Myself (1937) اور ہیولاک ایلس کی My Life (1940) مشہور اور اہم اضافے ہیں۔

(۳) تاریخ نگاری :-

اسٹریچی کے زیر اثر فن تاریخ نگاری میں بھی تبدیلیاں ہوئیں اور اکثر مورخین اور سیرت نگاروں نے اس فن کو "عوامی ادب" کا جز بنا دیا۔ ان تصنیفوں میں تاریخ کی علمی و سائنسی اہمیت سے زیادہ تفریحی پہلوؤں پر زیادہ توجہ کی گئی چنانچہ انشاپرداز ہیلری بیلک کی تاریخی تصانیف جن میں مواد کی صداقت اور آزادی رائے کے علاوہ تفریحی عناصر بھی شامل ہیں، بیحد مقبول ہوئیں۔ اس کے بہترین کارنامے Wolsey اور Crom Well ہیں لیکن اس کی "تاریخ انگلستان" میں ذاتی تاثرات کو بڑا دخل ہے۔

بیلک اور اس کا رفیق چسٹرٹن دونوں تاریخ نگاری کے ساتھ ساتھ مذہبی قدامت پرستی کی طرف مائل ہوئے اور دونوں نے انگلستان کی تاریخ لکھ کر اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ مذہبی اصلاح Reformation انگلستان کی سب سے بڑی بدنصیبی تھی جس نے عقائد کے عہد زرّیں کا خاتمہ کر دیا۔ رومن کیتھولک مذہب سے گرویدگی کے ساتھ ان کی یہودیوں سے نفرت بھی ان کے مزاج کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

چسٹرٹن اگرچہ بیلک کے پایہ کا مورخ نہیں تھا لیکن اسے تاریخی مواد کی تشریح کا فن معلوم تھا۔ اس کی مشہور مصنف "تاریخ انگلستان" کسی طرح بھی علمی کارنامہ نہیں لیکن عام پڑھنے والے اسے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ بیسویں صدی انگریزی ادب میں دو مورخوں کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا۔ "ٹریولین" Trevalyan اپنی "تاریخ انگلستان"

(مطبوعہ ۱۹۲۶ء) اور "انگلستان کی سماجی تاریخ" (مطبوعہ ۱۹۴۴ء) کی بدولت بہت مشہور ہوا لیکن ٹائنبی Toynbee دورِ جدید کا سب سے بڑا مورخ ہے جس کے عہد آفریں کارنامے کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔

(۴) تنقید نگاری :-

صحافت اور سیرت نگاری کے ساتھ انگریزی تنقید کا میدان بھی وسیع ہونے لگا اور انشائیہ کے ساتھ اخباری کالموں میں ادب پاروں کی پرکھ اور تحسین کا بھی عام رواج ہو گیا۔

عہدِ وکٹوریہ کے نقادوں کے بعد سب سے پہلے ہماری نظر چسٹرٹن پر پڑتی ہے جس نے پیروڈی میں کمال حاصل کرنے سے پہلے اپنے ابتدائی دور میں چند تنقیدی تصانیف چھوڑیں۔ Browning اور Dickens اس کے گراں قدر کارنامے ہیں اور Victorian Age کی اپنی جگہ پر وفیسر ہیو واکر کی مستند تصنیف سے بھی پہلے ایک کامیاب کوشش ہے۔ چسٹرٹن کے یہاں دقت نظر سے زیادہ محاورہ بندی کا میلان غالب ہے۔ وہ حد سے زیادہ تاثراتی انداز میں اپنی رایوں کا اظہار کرتا ہے۔ ہارڈی کے متعلق اس نے کہا تھا کہ "ایک گنوار منکر دیہاتی احمقوں کو کفر کے سبق پڑھا رہا ہے"۔ اسی طرح ڈکنس کی ناول نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے کو تاثراتی رنگ سے محفوظ نہیں رکھ سکا۔

Alice Meynell نے نقاد پر زبردست پابندیاں عائد کی ہیں۔ اس کا قول ہے کہ نقاد کو بے لوث اور معروضی غور و فکر کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اس کے نزدیک ایک اچھے نقاد میں آزادی، ہمت، خلوص اور رواداری کا ہونا بہت ضروری ہے۔

Coventry Patmore میں اس کی یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔

L. Abercrombie کی مختلف تنقیدی تصانیف میں "طامس ہارڈی" اور "عظیم شاعری" بہت اہم ہیں۔ موخر الذکر کتاب میں اس نے شاعری اور فن شاعری پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ ابتدائی ابواب میں ہی "اسلوب اور تجربہ" کے زیرِ عنوان مصنف نے بتایا ہے کہ شاعری کا مقصد شدید اور واضح تاثرات و تجربات کو زبان کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔

A Quillercoach جو عرصہ تک کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رہے

"فن تحریر" (مطبوعہ ۱۹۱۶ء) اور "فن مطالعہ" (مطبوعہ ۱۹۲۰ء) کی بدولت کافی مشہور ہوئے۔ انھوں نے "آکسفورڈ بک آف انگلش ورس" بھی ترتیب دی مگر تنقید میں ان کا انداز ادیبانہ سے زیادہ مدرسانہ ہے۔

ڈرامہ اور بالخصوص شیکسپیئر پر تنقید کی حد تک پروفیسر بریڈلے، پروفیسر نکل اور مڈلٹن مرے وغیرہ کے نام بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان نقادوں نے ڈرامہ نگار کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو جدید تنقید کی روشنی میں واضح کیا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد تنقید کو بحیثیت صنف ادب کے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ صحافیوں اور پیشہ ور نقادوں کے علاوہ شعرا اور دوسرے فنکار بھی اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے لئے تنقید لکھنے لگے۔ صدی کی تیسری دہائی میں جمالیاتی اور مارکسی تنقید کا بڑا چرچا رہا۔ فرائڈ اور نفسیاتی تحقیقات کا اثر بھی تنقید پر واضح طور پر پڑا۔ جنگ کے بعد انگریزی نقادوں میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، آئی۔ اے۔ رچارڈس، لیوس، ہربرٹ ریڈ وغیرہ اہم حیثیت کے مالک ہیں۔

T. S. Eliot بلاشبہ دورِ جدید کا سب سے بڑا نقاد ہے۔ اس کی تنقیدوں میں ڈرائیڈن اور آرنلڈ کی ادبی میراث کے ساتھ انفرادی رنگ بھی نمایاں ہے۔ The Sacred Wood کے علاوہ اس کے دوسرے اہم تنقیدی کارناموں میں Elizabethen Essays اور The Use of Poetry & The Use of Criticism زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

I. A. Richards کی دو مشہور تنقیدی تصانیف "ادبی تنقید کے اصول" (مطبوعہ ۱۹۲۵ء) اور "عملی تنقید" (۱۹۲۹ء) اپنے دور کے عہد آفریں تصانیف ہیں۔ ان کتابوں میں نفسیاتی اور جمالیاتی تنقید اور عملی تنقید پر سیر حاصل بحث ہے۔

مشہور شاعر لیوس کی The Poetic Image اور A Hope For Poetry میں ہم کو جدید ترین تنقیدی میلانات وضاحت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس نے شاعروں کی پیکر نگاری اور تشبیہات و استعارات سے ان کے ذہنی و تخلیقی

عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے۔

کیمبرج کے استاد F. R. Leavis کی The Great Tradition ناول میں، New Bearing in Poetry شاعری میں اور The Common Pursuit عام تنقید میں عالمانہ اکتساب ہیں۔

Herert Read کی The True Voice of Feeling جدید تنقیدی کوششوں میں اہم اضافہ ہے۔ Maud Bodkin اپنی تصانیف Archetypal Patterns In Poetry اور Studies of Type Images (1951) کی بدولت جدید انگریزی تنقید میں خاص مقام رکھتی ہے۔